سائبان
آنچل میں جگنو 17
تمہیں اپنا بنالیں 31
بہار آگئی 46
راستہ بھول گیا تھا 62
روشنی ضروری ہے 78
تم ایسی شرارت مت کرنا 86
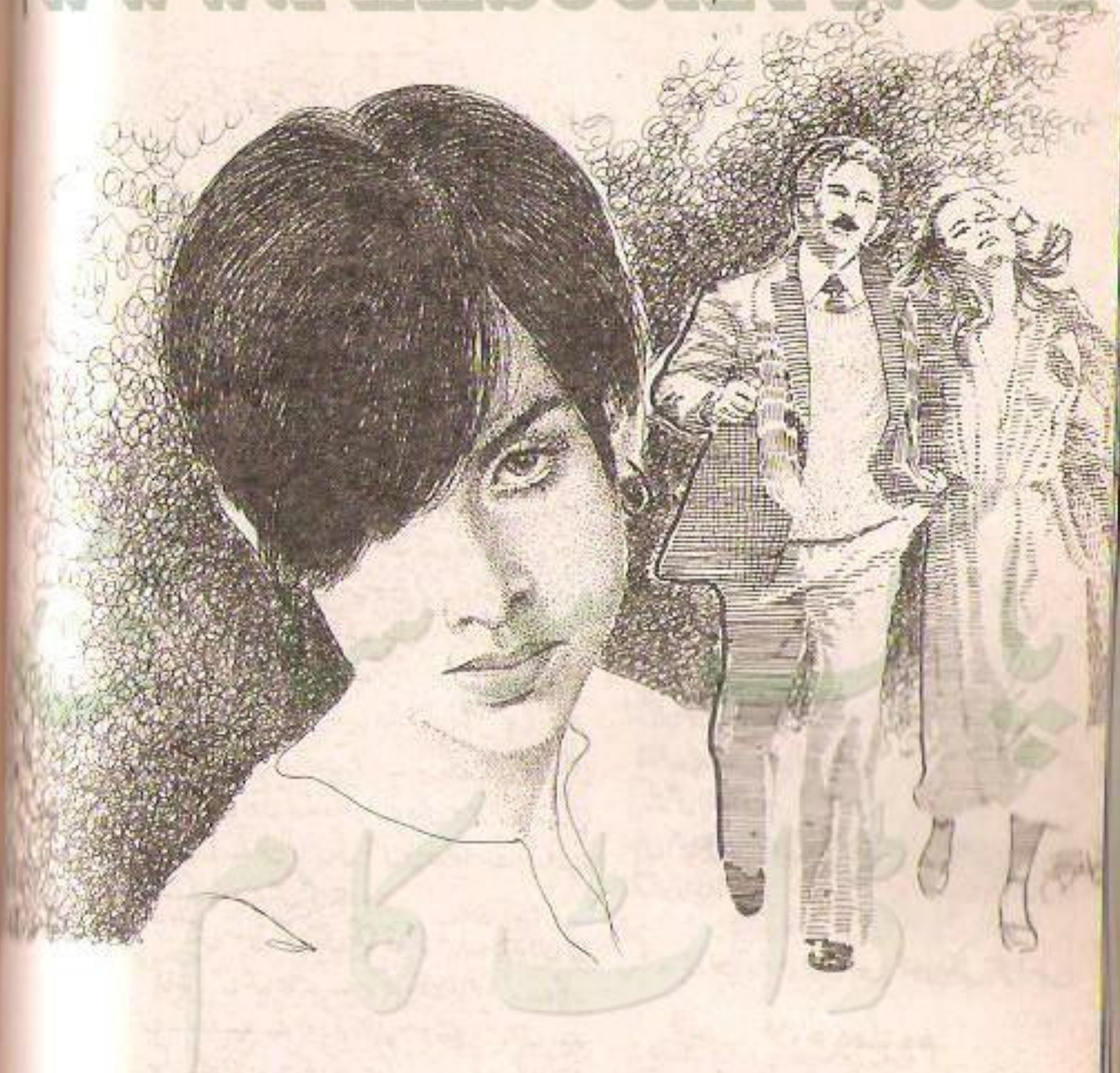
شازیہ چوہدری

سائبان

شاذیہ چوہدری

ہر اک لمحہ نیا اک امتحاں ہے
بہت نا مہرباں یہ آسماں ہے
محبت اک ندامت بن گئی ہے
ہماری مختصر سی داستاں ہے

عورت ایک بیل کی طرح ہے اسے پھلنے پھولنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس وقتی سہارے کو ہی اپنا سائبان سمجھنے لگتی ہے۔

آج رمضان کا چاند نظر آ گیا تھا۔ کل پہلا روزہ تھا۔

راحیل آفس سے گھر آتے ہوئے بہت خوش تھا۔ آج اسے کنفرمیشن لیٹر ملا تھا۔ اس کو اس فرم میں بطور کمپیوٹر آپریٹر کام کرتے ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ یہ چھ ماہ اس نے سولی پر لٹکتے ہوئے گزارے تھے اور آج اس آزمائشی دور سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ وہ چار ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کے ساتھ فرم کے مستقل ملازمین میں شامل ہو چکا تھا۔ اب کوئی دھڑکا نہیں رہا تھا کہ کب اس کے سنیئرز کو اس کی غلطی پکڑنے کا موقع ملے اور کب وہ اس سے کہہ کر اس کی فرم سے چھٹی کروا ئیں۔

''شمزا بہت خوش ہوگی اس خبر پر۔'' اس نے بس کو ہاتھ دیتے ہوئے مسکرا کر سوچا۔ ایک سو اکیس نمبر بس میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتے ہوئے وہ بڑا سرشار تھا۔ ابھی تک اسے کسی ایسے ویسے احساس نے نہیں چھوا تھا۔ ابھی تک وہ سر پر ٹوٹ پڑنے والی کسی قیامت سے بے خبر تھا۔

بے خبری بڑی نعمت ہوتی ہے۔ جب چھا جاتی ہے تو کچھ دیر کے لیے زندگی خوب صورت ہو جاتی ہے۔ اسے بھی ابھی تک زندگی خوب صورت لگ رہی تھی۔ ابھی تک وہ بے خبری کے بد اثرات سے محفوظ تھا۔ مگر تابکہ...... آخر کبھی نہ کبھی تو حقیقت کا سامنا کرنا ہی ہوتا ہے۔ اپنے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر اس نے جیب سے چابی نکالی۔

شمزا اپنی کولیگز اور اسکول کے بچوں کے ساتھ دو دن کے لیے مری کے ٹرپ پر گئی ہوئی تھی۔ آج شام تک اسے لوٹنا تھا۔ تالے کی چابیاں دونوں کے پاس اپنی اپنی تھیں جو پہلے آ جاتا گھر کھول لیتا تھا۔

گھر کیا تھا فلیٹ بھی پورا نہیں تھا۔ صرف ایک کمرا تھا اٹیچڈ واش روم والا جو وہ گزشتہ تین سال سے کرایے پر لے کر رہ رہے تھے۔ اس ایک کمرے کا بھی انیس سو روپے کرایہ تھا۔ پانچ سو روپے تک بجلی، پانی اور گیس کے بل مل ملا کے بن جاتے تھے۔ تین سو روپے تک ماہانہ آدھا کلو دودھ روزانہ کے حساب سے دودھ والے کو دیتے تھے۔ کم سے کم ترین بجٹ بنا کر بھی بہر حال بارہ سے پندرہ سو روپے گھر کے اخراجات کی مد میں لگ جاتے تھے۔ شمزا اسکول وین سے آنے جانے کی چھ سو روپے ماہانہ فیس دیتی تھی۔ خود راحیل کے روزانہ بس سے آنے جانے کا خرچہ بیس روپے بنتا تھا۔ اس حساب سے چھ سو روپے اس کے ٹرانسپورٹ میں نکل جاتے تھے۔

اس طرح اگر کچھ بھی نہ لیں، ہر قسم کی عیاشی خود پر حرام کر لیں تب بھی پانچ ہزار دو سو روپے ہر ماہ لگ جاتے تھے۔ انہی کرایوں، بلوں اور بجٹ میں۔ کوئی اضافی خرچ نکل آتا پھر تو مانو جان ہی عذاب میں آ جاتی تھی۔

شمزا کی تنخواہ اسی سال ساڑھے چار سے پانچ ہزار ہوئی تھی۔ وہ تو شکر ہوا جو خدا خدا کر کے راحیل کا بی، اے مکمل ہوا اور اس کو چھوٹی موٹی ٹیوشنز چھوڑ کے فرم میں چار ہزار کی جاب مل گئی۔

اب یہ ہوتا تھا کہ شمزا کی تنخواہ سے گھر چلتا اور راحیل پانچ سو روپے رکھ کر اپنی باقی تنخواہ ملتان بھجوا دیتا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے شمزا اسکول سے واپس آ کر دو گھنٹے کے لیے ایک مالدار بیگم صاحبہ کی بنائی ہوئی سماجی تنظیم میں صرف ڈھائی ہزار روپے کی کلرکی ٹائپ ملازمت کرتی تھی۔ یہ جاب بھی اسے بڑے جتنوں سے ملی تھی۔ آئے دن بیگم صاحبہ نت نئے کام نکال کے اسے دو گھنٹے کے بجائے بعض اوقات پانچ پانچ گھنٹے تک انگیج رکھتی تھیں۔

تنظیم کا دفتر چونکہ ان کے گھر کی انیکسی میں بنایا گیا تھا اس لیے اکثر وہ نہایت بے تکلفی سے شمزا کو گھر کا کوئی کام سونپ دیتی تھیں۔ کبھی ہینگر پر سوٹ لٹکائے آ جاتیں۔

''شمزینہ، ذرا ان پر استری کر دینا۔'' کبھی اپنے کلاس فور کے بچے کو اس کے کیبن میں بھیج رہی ہیں۔

''آج میری ٹیوٹر نہیں آئیں، مما کہہ رہی ہیں آپ مجھے ہوم ورک کروا دیں۔'' کبھی اپنے عظیم الشان ڈرائنگ اینڈ ڈائننگ کمبائنڈ ہال کمرے کی لک چینج کرنے کے لیے اسے بلایا جاتا۔

''شمزینہ آج پارٹی کے ممبرز کی خصوصی میٹنگ بلائی گئی ہے۔ تم اپنی نگرانی میں یہاں کے انتظامات دیکھو۔ سیٹنگ کچھ اس طرح چینج کرو کہ کھلا کھلا لگے اور ہاں پارٹی کے بعد ڈنر ہوگا۔ تم یہاں کی سیٹنگ مکمل کر کے کچن میں جاؤ اور ڈنر کے لوازمات دیکھو، کراکری وغیرہ نکلواؤ۔ تم آج ڈنر کے بعد ہی جا سکو گی۔'' اور وہ کام ختم کرنے کے چکر میں گھن چکر بنی بے حال ہو جاتی۔

راحیل کو اس کی کمپنی اور بد خصلت متمول بیگم صاحبہ پر جی بھر کر طیش آتا تھا۔ جب وہ دو گھنٹے کے بجائے چھ گھنٹے بعد تھکی ہاری لوٹتی تو اس کا خون کھول کر رہ جاتا۔

''کیا سمجھتے ہیں یہ پیسے والے متکبر لوگ، چند روپلی دے کر ایک انسان کی زندگی خرید لیتے ہیں گویا۔ چاہتے ہیں ہر گھڑی بس وہ یہ یاد رکھے کہ وہ ان کا محکوم ہے۔ ان کا نوکر ہے۔ اسی لیے زیادہ سے زیادہ اپنے سامنے ٹانک کے رکھنا چاہتے ہیں۔''

''تم کیوں اپنا خون جلاتے ہو، ہماری اپنی مجبوریاں ہیں۔ ہمیں تو اپنا گھر دیکھنا ہے پہلے۔'' وہ بڑے حوصلے، برداشت اور تحمل والی لڑکی تھی۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی خاطر جمع رکھتی تھی۔

''مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم اتنی ذلت آمیز جاب کرو۔ اپنے آپ پر شرم آتی ہے۔ اپنے ہونے پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔''

''جو جتنی ٹھوکریں کھاتا ہے وہ اتنا ہی سیکھتا ہے۔ تمہیں خواہ مخواہ ٹمپر لوز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی ڈھائی ہزار اور ایک ہزار تنخواہ میں سے نکال کر ملتان بھجوا دیتے ہیں یوں ادھر کا چولہا جل جاتا ہے۔ تم یہ سوچو کہ اس جاب سے کتنا فائدہ ہو رہا ہے۔ نقصان نہ دیکھو، نقصان صرف میرا ہے مگر فائدہ ہمارے پورے گھرانے کا ہے۔'' وہ بردباری سے سمجھاتی۔

ہر بار راحیل خود سے عزم کرتا کہ وہ جلد ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر شمزا سے اس کی یہ والی جاب چھڑوا دے گا اور پھر یہی ہوا۔ جونہی وہ فرم میں ملازم ہوا اس نے شمزا کو شام کی جاب سے منع کر دیا۔

''ابھی نہیں راحیل۔ پہلے ''پکے'' تو ہو جاؤ پھر میں چھوڑ دوں گی۔''

''نہیں، بالکل بھی نہیں۔ میں تو پہلے بھی جانے کس دل سے یہ برداشت کرتا رہا ہوں۔ یہ والی پکی نہ ہوئی تو کوئی اور مل جائے گی۔ میرے بی، اے مکمل کرنے تک کا ایگریمنٹ ہوا تھا تم سے۔ اب وہ ٹائم آ گیا ہے۔ میں کچھ بھی کر لوں گا۔ بس تم یہ جاب نہیں کرو گی۔'' راحیل کے حتمی تیوروں نے شمزا کو خاموش کر دیا تھا۔

''اسے کہوں گا آج یہ دھڑکے ختم ہو گئے ہیں۔'' وہ تالا کھول کر خوش خوش اندر داخل ہوا۔

''اب میں فرم کے مستقل ملازمین میں شامل ہو گیا ہوں۔ شکر ہے اللہ تعالیٰ۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر بے ساختہ طویل سانس لی۔

وارڈ روب میں ایک طرف اس کے اور دوسری طرف شمزا کے زنانہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ کمرا خاصا کشادہ تھا۔ دو پلنگ تھے اور دونوں انتہائی کونوں پر دیوار کے ساتھ رکھے گئے تھے درمیان کی جگہ خالی تھی جہاں پانچ بائی آٹھ کی لنڈے سے خریدی گئی چار سو روپے کی گرے کلر کی دری بچھی ہوئی تھی۔ دونوں پلنگوں کے درمیان ایک سیکنڈ ہینڈ میز تھی جس پر کچھ کتابیں اور چائے کے گندے برتن پڑے تھے۔ شمزا کے پلنگ کے نیچے دو سوٹ کیس گھسائے ہوئے تھے چونکہ بیڈ شیٹ خاصی لمبی تھی اس لیے پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ جبکہ راحیل کے پلنگ کے نیچے لٹکی ہوئی چادر کے اس پار اس کے اور شمزا کے جوتے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ دھونے والے کپڑے بھی اکثر یہیں گھسائے جاتے تھے تاکہ کمرے میں کم سے کم گند ہے۔

راحیل نے بوٹ اتار کر پلنگ کے نیچے سرکائے اور وہیں سے ٹٹول کر چپل نکالی۔ سامنے لوہے کی کیل کے ساتھ تولیا ٹنگا ہوا تھا۔ وہ تاول اٹھا کر واش روم میں گھس گیا۔ نہا کر باہر آیا تو گھریلو سے شلوار قمیص میں خود کو بہت تازہ دم محسوس کیا۔

''اب چائے بنائی جائے۔'' اس نے ایک ترنگ کے عالم میں چٹکی بجائی۔ کمرے کے ساتھ ہی ڈریسنگ ٹائپ کی تھوڑی سی جگہ بنائی گئی تھی بغیر دروازے کی۔ وہاں چولھا رکھ کے اور لکڑی کا ڈیڑھ فٹ چوڑا اور تین

فٹ لمبا ٹکڑا دیوار میں کیلوں سے ٹھونک کر اس پر نمک مرچ مسالے اور آئل وغیرہ رکھ کے گویا کچن کے لوازمات پورے کر لیے گئے تھے۔ دیوار میں لکڑی کا تختہ لگانے کا آئیڈیا شزا کا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ نہایت سلیقہ مند، ذہین اور پُراعتماد تھی۔

چائے بنا کر وہ گنگناتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ سامنے دیوار پر سات آٹھ فٹ اونچی اسی قسم کا لکڑی کا مضبوط تختہ لگا کر اس پر چودہ انچ کا سیکنڈ ہینڈ ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ جو تین ہزار میں شزا نے پچھلے سال اپنی ایک کولیگ سے خریدا تھا۔ رقم کمیٹی نکلنے پر ادا کی گئی تھی۔

وہ ٹی وی لگا کر تکیے سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا اور چائے کے سپ لیتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ دیوار پر لگے کلاک کی آگے بڑھتی ہوئی سوئیاں بھی دیکھ رہا تھا۔

''چھ بج رہے ہیں۔ شام تو ہو گئی۔ اب تک اسے آ جانا چاہیے تھا۔'' وہ اپنے اندر کی بے چینی کو کم کرنے کے لیے فلمی موسیقی کے پروگرام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جب ساڑھے آٹھ ہوئے تو اس کی بے چینی تشویش میں بدل گئی اور جب نو بجے کلاک کی ٹن ٹن ہوئی تو تشویش گھبراہٹ میں بدل گئی۔

اس گھبراہٹ سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے بہتر سمجھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر نکل جائے۔ جب انتظار کی کیفیت طاری ہو تو اندر رہ کر ویسے ہی دم گھٹنے لگتا ہے۔

وہ باہر روڈ پر آ کے ٹہلنے لگا۔ جی سیون میں بنے یہ بوسیدہ سے فلیٹس باقی بلڈنگز کے مقابلے میں خاصے قدیم تھے۔ اس کے ساتھ کے بنے بلاک ازسرِنو تعمیر ہو چکے تھے مگر ابھی اس بلڈنگ کی قسمت نہیں جاگی تھی۔

''کیوں نہ ملتان فون کر کے امی اور بہنوں کی خیر خیریت دریافت کر لوں۔ ابھی تو کال کے پیسے بھی نکل آئیں گے بعد میں خرچوں میں سے سو پچاس کی رقم نکالنا بڑا دشوار ہو جاتا ہے۔''

اس نے محلے کے چھوٹے سے پی سی او کے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک پروگرام بنا لیا۔ دوسرا مقصد موجودہ پریشانی سے وقتی ریلیف حاصل کرنا بھی تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر نمبر دیا۔ کال ملنے پر پی سی او والے نے ریسیور اس کی طرف سرکا دیا۔

''السلام علیکم امی! میں راحیل بات کر رہا ہوں۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ انعم اور رانیہ کیسی ہیں اور شرجیل صاحب کا اسکول کیسا جا رہا ہے؟''

''سب کچھ ٹھیک ہے اللہ کا شکر ہے بیٹے۔ تم سناؤ شزا کیسی ہے؟ تمہاری صحت کیسی ہے؟''

''یہاں سب خیریت ہے۔'' اس نے اپنے اندر اٹھنے والے اضطراب کو دباتے ہوئے تسلی کرائی۔

''انعم ماشاء اللہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ اس نے اپنے دیور کے لیے رانیہ کا رشتہ مانگا تھا۔ شزا سے پوچھ کر میں نے اسے ہاں کر دی تھی۔''

''جی میں جانتا ہوں۔ شزا نے بتایا تھا۔''

''اب وہ لوگ شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔ شزا سے پچھلے ہفتے بات ہوئی تھی اس نے تو کہا تھا امی آپ تین ماہ بعد کی تاریخ رکھ لیں، انتظام ہو جائے گا مگر بیٹے میں کیسے اس کی بات مان لیتی۔ وہ سب سے بڑی ہے۔ انعم اس سے چھوٹی تھی اس نے ضد کر کے اس کی شادی کروا دی لیکن اب رانیہ کو میں اس طرح نہیں بیاہ سکتی۔ پہلے شزا کی ہو گی پھر رانیہ اپنے گھر جائے گی۔ بہت کر لی اس نے گھر کے لیے محنت۔ اب اسے بھی تو ایک گھر چاہیے۔ تم اسے سمجھاؤ خالہ کبریٰ پچھلے مہینے سے آ رہی ہیں ایک پرپوزل لے کر۔ وہ ہاں کر دے تو رانیہ کی اور اس کی اکٹھے کر دوں گی۔'' راحیل کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

شزا اس سے دو ڈھائی سال بڑی تھی اور وہ اپنی بہن کی ضدی فطرت اور جفاکش لائف اسٹائل سے بخوبی واقف تھا۔

''امی وہ اپنی ذمے داریاں بہتر سمجھتی ہے۔ آپ جذباتی ہو کر ایسا کہہ تو رہی ہیں یہ بتایئے دو دو شادیوں کے لیے انتظامات کہاں سے کریں گی۔'' اور اگر انعم کی ابھی تک نہ ہوئی ہوتی تو وہ بھی گھر بیٹھی ہوتی۔ اللہ کا شکر ہے وہ اپنے گھر میں آباد ہے اور اسی کے توسط سے رانیہ کا

رشتہ بھی طے ہوگیا ہے۔ رہی شزا تو وہ ایک ورکنگ وومن ہے اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہے اور تمہارہ کر از خود حالات سنبھال سکتی ہے۔ جب مناسب وقت آئے گا تو اس کی بھی ہو جائے گی۔''

راحیل نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

''تم لڑکے ہو تمہیں بیچ کی نزاکتوں کا علم نہیں ہے۔ لڑکی کتنی ہی خود مختار اور خود انحصار کیوں نہ ہو جائے معاشرہ اسے تنہا رہنے کا آزادانہ حق نہیں دیتا۔ قدم قدم پر دفاع کے لیے، حفاظت کے لیے، لڑائی کے لیے مرد کا ساتھ درکار ہوتا ہے اور پھر خواب دیکھنے اور گھر بسانے کی ایک عمر ہوتی ہے۔ ایک فطری خواہش ہوتی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ شعوری طور پر اس طلب کو دبا لینا اور بات ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں کو ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ زندگی کے مسائل سے لڑتے لڑتے انسان کب چوار یا ہتھیار پھینک دیتا ہے اس کا پتا ہی نہیں چلتا۔'' امی نے بہت گہری بات کی تھی۔ راحیل نے عجیب سی بے چینی رگ و پے میں پھیلتی محسوس کی۔

''گھر چلوں شاید وہ آ چکی ہو۔'' اس نے سوچا اور پھر دو چار باتوں کے بعد فون بند کر کے گھر کی طرف لوٹ گیا۔

فلیٹس کی بلڈنگ سڑک کے ساتھ ہی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں باہر کی طرف براہِ راست کھلتے دروازے پر تالا جھولتا بدستور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بے دلی کے عالم میں فٹ پاتھ پر ہی بیٹھ گیا۔ اندر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''کہاں رہ گئی ہو شزا کی بچی!'' اسے اب غصہ آنے لگا تھا۔ کچھ دیر گزری تو غصہ پریشانی اور پریشانی خوف و ہراس میں بدل گئی۔

''یا الٰہی خیر ہو۔ کہیں کوئی ایکسیڈنٹ...... نہیں نہیں۔''

وہ تیز رفتاری سے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے بے تابی سے تالا کھول کر اندر گیا اور اس کے کاغذات میں سے اس کے اسکول کی پرنسپل کا ذاتی نمبر تلاش کرنے لگا۔ بالآخر نمبر مل گیا۔ پرنسپل فوراً کے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ اس نے ٹائم دیکھا۔ ساڑھے دس ہو رہے تھے۔ وہ دوبارہ پی سی او گیا۔

''السلام علیکم، میں شہرینہ حیدر کا بھائی بات کر رہا ہوں۔ آپ کا اسکول ٹرپ دو دن کے لیے مری گیا ہوا تھا آج تیسرا دن ہے شام تک آ جانا چاہیے تھا لیکن ابھی تک شہرینہ گھر نہیں پہنچی۔ کیا آج کا بھی قیام ہے مری میں؟'' رابطہ ملنے پر اس نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

''جی! کون سا ٹرپ کیسا ٹرپ...... اسکول تو دو دن سے کھلا ہوا ہے۔ بچوں کے ایگزام سر پر ہیں ایسے میں مری کا ٹور، کیسے ارینج کیا جاسکتا ہے؟'' راحیل کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

''مائی گاڈ! تو...... تو شہرینہ کہاں ہے؟'' اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

''وہ دو دن کی چھٹی پر تھیں بلکہ آج تیسرا دن ہوگیا۔ کیا وہ پہلے بھی اس طرح جاتی رہی ہیں۔'' پرنسپل کا لہجہ اچانک مشکوک ہوگیا۔

''نہیں نہیں، خدانخواستہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔'' راحیل گڑ کر رہ گیا تھا۔

سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے مردہ ہاتھوں سے فون کریڈل پر رکھا اور پیسے کاؤنٹر پر رکھ کر خود کو بمشکل گھسیٹتا ہوا گھر تک آیا بلکہ باہر فٹ پاتھ پر ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت خطرناک حد تک سرخ ہو رہی تھی۔ بری طرح ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ ہاتھ مسل رہا تھا۔ ناک کے نتھنے بے تحاشا پھڑک رہے تھے۔ سرخ ہوتی آنکھوں میں بے بسی اور اشتعال کا پانی تیرنے لگا تھا۔ ویران سڑک پر لیمپ پوسٹ کی لائٹ میں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اکڑ گیا۔ کہاں کی سحری اور کہاں کا اہتمام۔

تقریباً تین بجے کے قریب ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ شزا اپنے دھیان میں اتری تھی۔ پیسے دے کر جونہی روڈ کراس کر کے آئی فٹ پاتھ پر بیٹھے بھائی پر نظر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر اور کچھ گھبرا کر اس کے پاس آئی تھی۔

''را...... حیل...... مم...... میں...... وہ ٹرپ بس ابھی ابھی پہنچا تھا۔ سب بچوں اور ٹیچرز کو گھر چھوڑتے

چھوڑتے مزید دیر ہو جاتی اس لیے میں راستے میں اتر گئی تھی۔'' وہ غیر متوازن اور بوکھلائے ہوئے انداز میں تیز تیز بول رہی تھی۔ راحیل نے سپاٹ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ شزا کے جسم و جاں شل کر رہ گئے۔

''تمہاری پرنسپل سے کچھ دیر پہلے میری بات ہوئی ہے۔'' اتنا کہنا تھا کہ شزا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اسے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔

''راحیل......'' وہ کانپتی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئی۔ راحیل نے ایک نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالی اور رخ پھیر لیا ''اندر دفع ہو جاؤ، تھوڑی دیر میں سحری ہو جائے گی کسی نے دیکھ لیا تو رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔'' وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے دوبارہ اس کے پاس آن کھڑی ہوئی ''راحیل اندر آ جاؤ۔ سحری کر لو۔ ٹائم کم رہ گیا ہے۔''

''میں ہوٹل سے پانی پی آیا ہوں۔'' وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ شزا بے بسی سے اسے اپنی جان پر ظلم کرتا دیکھ رہی تھی۔

''بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے اندر آ جاؤ پلیز......''

''شٹ اپ!'' وہ بری طرح غرایا تھا۔

وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی اور شکستہ قدموں سے واپس چلی گئی۔

وہ فٹ پاتھ سے اٹھ کر سیدھا مسجد چلا گیا۔ سات بجے تک شزا کی اسکول وین آ جاتی تھی۔ ساڑھے سات وہ گھر آیا۔ اپنی چابی سے دروازہ کھولا اور کپڑے بدل کر آفس چلا گیا۔

حالات کچھ بھی ہوں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کولھو کا بیل تو بننا ہی پڑتا ہے۔ جن کے ہاں موت ہو جاتی ہے رو دھو کر وہ بھی کھانا تو کھاتے ہی ہیں ضرورت جو ٹھہری۔ وہ بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جا تو وہ آگے رہا ہے لیکن قدم گویا پیچھے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

ملتان میں ان کا آبائی گھر تھا۔ جب والد صاحب کی وفات ہوئی تو سب سے بڑی شہرینہ فقط انٹر میں تھی۔ باپ کی پرچون کی دکان تھی۔ فوتگی کے بعد راحیل نے کچھ عرصہ سنبھالی لیکن ناتجربے کاری اور زیادہ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے جو سامان نکلتا گیا اس کے پیسے گھر میں لگتے گئے اور یوں سامان آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ فقط چھ ماہ میں دکان ختم ہو گئی۔

اب کوئی ذریعۂ معاش نہیں رہا تھا۔ ان کے رشتے کے چچا اسلام آباد میں رہتے تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ شزا ان کے پاس آ جائے تاکہ اپنی تعلیم مکمل کر کے کوئی اچھی سی جاب پر لگ سکے۔

راحیل بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہاں چھ ماہ تک رہے مگر اس دوران میں انہیں چچی کے رویے سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ انہیں ناخوش گوار بوجھ سمجھ کر تنگ آ چکی ہیں۔

''راحیل مجھے مزید چھ ماہ لگیں گے کمپیوٹر کورس مکمل کرنے میں۔ ایک سال کا ڈپلومہ ہے۔ کورس مکمل کر کے جاب ملتے ہی ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے۔'' شزا نے ٹھان لی تھی۔

انہی دنوں چچی کے انگلینڈ پلٹ ہونہار بیٹے تاثیر احمد کی تشریف آوری ہوئی۔ تاثیر کی دو سال سے ایک مشہور و معروف متمول وکیل کی بیٹی سے بات طے تھی۔ ان کی وطن واپسی کے ساتھ ہی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

زرافشاں کے حسنِ جہاں سوز کے چرچے یوں بھی بہت تھے۔ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کچھ زیادہ نہیں تھے بلکہ کم ہی تھے۔ وہ ان تمام تعریفوں سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ تاثیر احمد کی بھرپور پُروقار اور متاثر کن پرسنالٹی کے ساتھ دلہن بنی زرافشاں چاند کی طرح چمک رہی تھی۔

شادی نمٹی، تین چار ماہ مزید گزر گئے کسی نہ کسی طرح...... پھر چچا کے توسط سے اسے ایک آفس میں آپریٹر کی جاب مل گئی۔ اس نے پرائیویٹ تعلیم بھی جاری رکھی تھی۔

چھ ماہ کمپیوٹر آپریٹر کی جاب کی پھر ایک اسکول میں کمپیوٹر انسٹرکٹر کے طور پر عارضی چھ ماہ کی تقرری ہوگئی۔

دہاں سے جناح اسکول میں نسبتاً اچھی تنخواہ پر کمپیوٹر ٹیچر کی جاب مل گئی۔ شہزانے شام کے ٹائمنگ میں مزید کمپیوٹر کورسز سیکھے اور بی، اے مکمل کرنے کے بعد یہ جاب حاصل کی تھی اور اب وہ اسے مستقل جاب بنانا چاہتی تھی۔ اس دوران میں راحیل اپنی پڑھائی مکمل کرتا رہا۔ پڑھائی مکمل ہوئی تو راحیل کو جاب مل گئی۔

آج وہ جاب فائنل ہوئی تھی اور...... اور آج ہی راحیل کی زندگی کا سب سے بھیانک دن طلوع ہوا تھا۔

اس کی بہن تین راتیں گھر سے باہر گزار کے آئی تھی اس کا جی چاہتا تھا دھاڑیں مار مار کے روئے۔

کبھی اپنا آپ بے غیرت لگتا کہ چپ چاپ بیٹھ کے بہن کی بے شرمی کے مظاہرے دیکھ رہا ہوں یہ تو پوچھا بھی نہیں کہ کس کے ساتھ منہ کالا کر کے آئی ہے اور کیوں۔ شرافت کا یہ نقاب کب اتارا اور کب پردے میں رہ کر چوریاں کرنی سیکھیں۔

☆☆☆

''ہمارے ادارے کو آپ کی مزید خدمات مطلوب نہیں ہیں مس شہزینہ!'' پرنسپل کے بلاوے پر وہ پرنسپل روم میں آئی تو پرنسپل نے سپاٹ انداز میں دو ٹوک بات کی تھی۔

''جی!'' وہ پہلے ہی من من بھر کے قدم اٹھاتی اندر آئی تھی۔ پرنسپل کا خشک لہجہ سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ انصاف طلب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی ''جی ہاں۔'' انہوں نے قلم میز پر رکھتے ہوئے ایک طنزیہ نگاہ اس پر ڈالی ''آپ کا کیا خیال ہے مس شہزینہ، آپ اسکول جاب کی آڑ میں اپنے ہر طرح کے کرائم پر پردے ڈالتی رہیں گی؟ بی بی یہ شریفوں کا ادارہ ہے یہاں یہ بازاری گرز زیادہ دیر تک کام نہیں دکھاتے۔'' ان کا لہجہ اکھڑا ہوا اور نہایت روکھا تھا۔

''اسکول کے نام پر تین راتیں باہر گزار کے ٹھاٹ سے اسکول چلی آئی ہیں۔ اگر کسی بچے کے والدین تک یہاں کی ٹیچر کے متعلق اس قسم کی اطلاع پہنچ گئی تو کیا وہ اپنے بچوں کو ایسے ادارے میں پڑھانا پسند کریں گے؟ اسکول کے اسٹاف کی ریپوٹیشن کس قدر خراب ہوگی اس کا آپ کو اندازہ ہے؟ ساری انتظامیہ کا امیج تباہ ہو جائے گا۔'' وہ سچ مچ بہت غصے میں نظر آ رہی تھیں۔

''میڈم......'' اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

''آپ کو اپنے بھائی سے چیٹنگ کرتے ہوئے اپنے فعل پر ذرا بھی ندامت نہیں ہوئی؟'' وہ خشمگیں نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''کہاں گئی تھیں آپ! کس کے ساتھ گئی تھیں؟'' وہ کڑے تیوروں سے پوچھ رہی تھیں۔

''میں تو آپ کو ایک میچور، سلجھی ہوئی اور سوبر مزاج کی حامل لڑکی سمجھتی تھی۔ اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنا بھی گر سکتی ہیں؟''

''میڈم پلیز!'' وہ بلبلا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میں ''ایسی ویسی'' لڑکی نہیں ہوں۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔''

''ایسی ویسی نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟ شریف لڑکیوں کے تو یہ چھن نہیں ہوتے۔'' انہوں نے مشتعل انداز اپنایا۔

''میں اپنے ہسبینڈ کے ساتھ گئی تھی۔'' بالآخر وہ سر جھکا کر منہ سے پھوٹ پڑی۔

''ہسبینڈ!'' پرنسپل جانچنے والی بدگمان نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

''جہاں تک میرا خیال ہے آپ کنواری ہیں۔ آپ نے جو فارم پر کیا تھا اس میں خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا تھا۔'' وہ قائل نہیں ہو سکی تھیں۔

''جی!'' وہ مجرموں کی طرح گردن جھکائے ہوئے تھی۔ آواز نہایت آہستہ تھی ''میڈم میں نے ایک ہفتہ پہلے خفیہ شادی کی ہے۔ اصل میں مجھے اندازہ تھا کہ اس شادی پر میرے گھر والے یا ''ان'' کے گھر والے کسی صورت رضامند نہیں ہوں گے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی اس لیے ہم نے یہ قدم اٹھایا۔ ہمارا تقریباً ڈیڑھ سال پرانا افیئر تھا۔ ان دنوں جب میں نے یہاں آپ کے ہاں نئی نئی جاب کی تھی۔''

وہاں سے جناح اسکول میں نسبتاً اچھی تنخواہ پر کمپیوٹر ٹیچر کی جاب مل گئی۔ شہزا نے شام کے ٹائمنگ میں مزید کمپیوٹر کورسز سیکھے اور بی، اے مکمل کرنے کے بعد یہ جاب حاصل کی تھی اور اب وہ اسے مستقل جاب بنانا چاہتی تھی۔ اس دوران میں راحیل اپنی پڑھائی مکمل کرتا رہا۔ پڑھائی مکمل ہوئی تو راحیل کو جاب مل گئی۔

آج وہ جاب فائنل ہوئی تھی اور...... اور آج ہی راحیل کی زندگی کا سب سے بھیانک دن طلوع ہوا تھا۔

اس کی بہن تین راتیں گھر سے باہر گزار کے آئی تھی اس کا جی چاہتا تھا دھاڑیں مار مار کے روئے۔

کبھی اپنا آپ بے غیرت لگتا کہ چپ چاپ بیٹھ کے بہن کی بے شرمی کے مظاہرے دیکھ رہا ہوں یہ تو پوچھا بھی نہیں کہ کس کے ساتھ منہ کالا کر کے آئی ہے اور کیوں۔ شرافت کا یہ نقاب کب اتارا اور کب پردے میں رہ کر چوریاں کرنی سیکھیں۔

☆☆☆

''ہمارے ادارے کو آپ کی مزید خدمات مطلوب نہیں ہیں مس شہزینہ!'' پرنسپل کے بلاوے پر وہ پرنسپل روم میں آئی تو پرنسپل نے سپاٹ انداز میں دوٹوک بات کی تھی۔

''جی!'' وہ پہلے ہی من من بھر کے قدم اٹھاتی اندر آئی تھی۔ پرنسپل کا خشک لہجہ سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ انصاف طلب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی ''جی ہاں۔'' انہوں نے قلم میز پر رکھتے ہوئے ایک طنزیہ نگاہ اس پر ڈالی ''آپ کا کیا خیال ہے مس شہزینہ، آپ اسکول جاب کی آڑ میں اپنے ہر طرح کے کرائم پر پردے ڈالتی رہیں گی؟ بی بی یہ شریفوں کا ادارہ ہے یہاں یہ بازاری گر زیادہ دیر تک کام نہیں دکھاتے۔'' ان کا لہجہ اکھڑا ہوا اور نہایت روکھا تھا۔

''اسکول کے نام پر تین راتیں باہر گزار کے ٹھاٹ سے اسکول چلی آئی ہیں۔ اگر کسی بچے کے والدین تک یہاں کی ٹیچر کے متعلق اس قسم کی اطلاع پہنچ گئی تو کیا وہ اپنے بچوں کو ایسے ادارے میں پڑھانا پسند کریں گے؟ اسکول کے اسٹاف کی ریپوٹیشن کس قدر خراب ہوگی اس کا آپ کو اندازہ ہے؟ ساری انتظامیہ کا امیج تباہ ہو جائے گا۔'' وہ سچ مچ بہت غصے میں نظر آرہی تھیں۔

''میڈم......'' اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

''آپ کو اپنے بھائی سے چیٹنگ کرتے ہوئے اپنے فعل پر ذرا بھی ندامت نہیں ہوئی؟'' وہ خشمگیں نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''کہاں گئی تھیں آپ! کس کے ساتھ گئی تھیں؟'' وہ کڑے تیوروں سے پوچھ رہی تھیں۔

''میں تو آپ کو ایک میچور، سلجھی ہوئی اور سوبر مزاج کی حامل لڑکی سمجھتی تھی۔ اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنا بھی گر سکتی ہیں؟''

''میڈم پلیز!'' وہ بلبلا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میں ''ایسی ویسی'' لڑکی نہیں ہوں۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔''

''ایسی ویسی نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟ شریف لڑکیوں کے تو یہ چلن نہیں ہوتے۔'' انہوں نے مشتعل انداز اپنایا۔

''میں اپنے ہسبنڈ کے ساتھ گئی تھی۔'' بالآخر وہ سر جھکا کر منہ سے پھوٹ پڑی۔

''ہسبنڈ!'' پرنسپل جانچنے والی بدگمان نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

''جہاں تک میرا خیال ہے آپ کنواری ہیں۔ آپ نے جو فارم پر کیا تھا اس میں خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا تھا۔'' وہ قائل نہیں ہو سکی تھیں۔

''جی!'' وہ مجرموں کی طرح گردن جھکائے ہوئے تھی۔ آواز نہایت آہستہ تھی ''میڈم میں نے ایک ہفتہ پہلے خفیہ شادی کی ہے۔ اصل میں مجھے اندازہ تھا کہ اس شادی پر میرے گھر والے یا ''ان'' کے گھر والے کسی صورت رضامند نہیں ہوں گے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی اس لیے ہم نے یہ قدم اٹھایا۔ ہمارا تقریباً ڈیڑھ سال پرانا افیئر تھا۔ ان دنوں جب میں نے یہاں آپ کے ہاں نئی نئی جاب کی تھی۔''

میڈم خاموشی سے اس کی صورت پر لکھے تاثرات ملاحظہ کرتی رہیں۔ جب یقین آ گیا تو لہجے کی سختی قدرے کم ہو گئی۔

''لیکن خفیہ شادی کرنے کی ایسی کون سی ایمرجنسی پڑ گئی۔ آپ دونوں اپنے والدین کو قائل کر سکتے تھے۔ یہ کوئی متوازن اور پسندیدہ اقدام ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی شادیوں کو بغاوت اور سماجی اصولوں سے دشمنی سے موسوم کیا جاتا ہے۔

''آپ ایک پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی ہیں۔ آپ کو غالباً علم نہیں کہ اس اقدام کے بعد آپ کی پوزیشن کس قدر کمزور اور چوروں والی ہو گئی ہے؟ جائز کام بھی اگر طریقے سے اور سماجی قواعد و ضوابط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نہ کیا جائے تو وہ گناہ بن جاتا ہے۔ باعث ملامت اور باعث شرم ہو جاتا ہے۔ آپ کنوینس کر سکتی تھیں اپنے گھر والوں کو...... سمجھا سکتی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح اپنی منوا سکتی تھیں۔ ان کے ہاتھوں یہ فریضہ سرانجام پاتا تو کم از کم آج آپ کی مجرموں کی طرح جھکی گردن فخر اور سکون سے اٹھی ہوئی تو ہوتی۔''

''میڈم گھر والوں کے ماننے کی کوئی وجہ نہیں بنتی تھی۔'' وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بدستور چور بن کر گویا تھی۔

''وہ ''شادی شدہ'' ہیں اور میرے رشتے میں چچا زاد کزن بھی ہوتے ہیں۔'' اس نے گویا بم پھوڑا تھا۔

''اوہ!'' پرنسپل نے اوپر سے نیچے تک اسے دیکھتے ہوئے گہری سانس لی ''جب وہ شادی شدہ تھے تو آپ کو ان کے ساتھ انوالو ہونے کی کیا ضرورت تھی؟''

اب وہ اس کا جواب کیا دیتی کہ اسی کم بخت دل کے ہاتھوں وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ اتنے عرصے تک اپنا آپ سنبھال سنبھال کے، بینت بینت کے رکھنے کے بعد اس وقت اچانک ہی بے بس ہو گئی تھی۔ محبت کے جراثیموں کا حملہ اتنا اچانک اور زوردار ہوا تھا کہ وہ خود کو بچا نہیں پائی تھی۔

''کیا آپ کا افیئر ان کی شادی کے بعد شروع ہوا یا پہلے سے ایسا کچھ تھا؟'' میڈم کو اس کہانی سے خاصی دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

''بعد میں میڈم...... پہلے تو ایسا کوئی احساس نہیں جاگا تھا۔ ان کی شادی پر میں نے اور میرے بھائی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ باہر سے آئے تھے اور ان کی مسز ایک معروف وکیل کی بیٹی ہیں، بہت خوب صورت ہیں۔ شادی کے بعد بھی میرا جب بھی چچا کے ہاں آنا جانا ہوا تاثیر احمد سے بڑے اخلاق اور مروت سے ملاقات ہوتی رہی۔ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ان کے دوسرے بچے کے عقیقے کے فنکشن پر جب آمنا سامنا ہوا تو پتا نہیں کیا ہوا انہوں نے میری تعریف کی تھی، مجھے سراہا تھا اور اچانک ہی مجھ سے پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ میں اسی لہر میں بہہ گئی اور مجھے بھی اچانک ہی یہ لگنے لگا کہ میں ایسے ہی آئیڈیل اور پرفیکٹ لائف پارٹنر کی تلاش میں تھی پھر اس کے بعد ہمارا ملنا ملانا شروع ہو گیا اور ڈیڑھ سال بعد پچھلے ہفتے ہم نے اس تعلق کو جائز قانونی نام دے دیا۔''

''آپ کم از کم اپنے بھائی کو تو اعتماد میں لے سکتی تھیں۔''

''وہ کسی صورت نہ مانتا۔ یوں بھی چچا جان اور ہماری فیملی کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ جوڑ ہوتا تو چچی باہر سے بہو لانے کے بجائے پہلے ہی امی سے میرے لیے بات کر چکی ہوتیں۔ وہ سونے کے چمچوں سے کھانے والے اور ہم مسائل سے گھرے پریشان حال لوگ......''

''کیا ان کی پہلی بیوی کے علم میں ہے؟''

''نہیں نہیں...... اور تاثیر ان کو بتا بھی نہیں سکتے...... زرافشاں کا ری ایکشن بہت تباہ کن ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ بچوں لے کر اپنے میکے چلی جائے۔''

''تو پھر بی بی آپ نے کس بنا پر اتنا انتہائی قدم اٹھایا۔'' پرنسپل کو اس بے وقوف لڑکی کی نادانی پر سخت طیش آ رہا تھا۔

''ان کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتہ جوڑنے اور اسے نام دینے کی خواہش میری اپنی تھی۔'' وہ سر جھکا کر اعترافاً گویا ہوئی۔

اور پرنسپل نے ایک عدد زوردار تھپڑ رسید کرنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا تھا۔

''بہت خوب! وہ موصوف اسی طرح بے نام رشتے کے ساتھ محبت کا کھیل جاری رکھنا چاہتے تھے اور آپ نے زبردستی خفیہ شادی کے لیے راضی کرلیا۔ آپ سے زیادہ تو وہی سمجھ دار نکلے۔''

''اصل میں میڈم وہ چاہتے تھے کہ جب وہ میرے لیے علیحدہ گھر اور معقول خرچہ افورڈ کرسکیں گے تب مجھ سے شادی کریں گے لیکن مجھے پیسہ نہیں ان کا ہمیشہ کا ساتھ چاہیے تھا۔ میری ضد تھی کہ وہ میرے ساتھ ایک پائیدار رشتے میں بندھ جائیں۔ یوں بھی میں اپنا آپ خود سنبھال سکتی ہوں۔ ان کی پے 38 ہزار ہے جس سے کہ صرف ان کے گھر کا خرچ چلتا ہے وہ چاہ رہے تھے اس میں مزید دس بارہ ہزار کا اضافہ ہوجائے تب وہ شادی کریں گے تاکہ وہ مجھے بھی افورڈ کرسکیں لیکن میں نہیں مانی۔ اب مجھے یہ تو تسکین ہے ناں کہ وہ میرے ہیں۔''

''مگر اس طرح کب تک چلے گا یہ آنکھ مچولی کہیں تو ختم ہوگی جب آپ کے اور ان کے والدین اور خصوصاً بیوی کو پتا چلے گا تو کیا ہوگا۔ اس بارے میں سوچا ہے تم نے؟'' انہوں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ وہ ہاتھ مسلنے لگی۔

''ابھی اتنی جلدی تھوڑی پتا چلے گا۔ ہم ہر ممکن چھپانے کی کوشش کریں گے۔ اگر بات کھل گئی تو پھر کسی نہ کسی طرح منت سماجت کرکے سنبھال لیں گے۔'' اس لمحے وہ خاصی پُراعتماد اور بےفکر دکھائی دی۔ پرنسپل نے خون پی جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''آپ نہایت کوتاہ اندیش، جذباتی اور کم حوصلہ واقع ہوئی ہیں۔ انسان آگے کا سوچ کر ہی قدم اٹھاتا ہے آپ نے تو سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ ایسے تعلقات نہ تو دیرپا ہوا کرتے ہیں نہ زیادہ عرصے تک متوازن رہا کرتے ہیں اور نہ ہی سوسائٹی میں قبولیت کا درجہ پاتے ہیں۔ بندہ ہر طرف سے معتوب اور سزاوار ٹھہرتا ہے۔ بہرحال آپ کا اللہ ہی حافظ ہے۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں، آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہاں اپنے بھائی کو الف تا یے سب کچھ بتا دیجیے کہ کل کلاں کو وہ پھر ادھر ادھر فون کرکے آپ کو ڈھونڈتے نہ رہیں۔ باقی آپ کی مرضی۔ بہرحال آپ ہمارے اسکول کی ریپوٹیشن اور... گڈول کا پورا خیال رکھیں گی۔ انڈراسٹینڈ!'' انہوں نے یکایک لاتعلقی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

''جی میڈم......'' وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

''آپ جاسکتی ہیں۔'' وہ رکھائی سے کہہ کر اپنی فائلوں پر جھک گئی تھیں۔ وہ بوجھل قدموں سے باہر آگئی۔

اب نیا مرحلہ راحیل کو ساری حقیقت بتانے کا تھا۔

☆☆☆

''میرا جی چاہتا ہے پہلے تمہیں شوٹ کروں اور اس کے بعد خود کو گولی مارلوں۔ یوں بار بار مجھے مخاطب نہیں کرو۔ مجھ سے بات مت کرو۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں دکھا سکتا۔'' راحیل غرا کر اس پر الٹ پڑا تھا۔ شزا سٹپٹا کر پیچھے ہٹ گئی۔

وہ سب کچھ بتا چکی تھی اور سنتے ہی راحیل بے قابو ہوگیا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے تم کس درجہ حماقت کا مظاہرہ کرچکی ہو؟ ایسی کون سی آگ لگی ہوئی تھی اور پھر وہ شخص دو بچوں کا باپ بن چکا ہے۔ چچا چچی تمہیں قبول کرلیں گے؟ زرافشاں بھابی کو پتا چلا تو وہ تمہارا کیا حشر کریں گی۔ اُف خدایا! میں امی کو کیونکر یہ بات بتا پاؤں گا۔ کس قدر ذلت آمیز حقیقت ہے یہ۔'' راحیل اپنے بال نوچنے لگا۔

''پلیز راحیل، ایسے تو نہ ری ایکٹ کرو۔'' وہ اس کا بازو تھام کر لجاجت سے بولی۔

''تو کیا گلے میں پھولوں کے ہار ڈالوں؟'' دانت پیستے ہوئے اس نے اپنا بازو چھڑالیا۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا، فکر نہ کرو۔'' وہ منت سے بولی۔

''ٹھیک ہونے کو باقی بچا ہی کیا ہے اب؟'' وہ بے دردی سے اسے ایک طرف دھکیل کر رخ پھیر کر بولا۔

''اتنی سمجھ داری بھی کس کام کی۔ اتنا احساس ذمے داری اور قربانی کا جذبہ بھی کس کھاتے میں جائے گا جب

تم نے ایک دم سے ٹریک بدل کر برسوں کی کمائی ہوئی عزت کو داؤ پر لگا دیا۔''

''کیوں...... کیوں راحیل کیا میں صرف اس وقت تک کارآمد پرزہ تھی جب تک گھر والوں کے لیے محنت مشقت کرتی رہی۔ صرف... ان کے لیے سوچتی رہی؟ جب اپنے لیے سوچا، اپنی مرضی اپنی خواہش کی واحد چیز پوری کی تو اب میں یکایک سب کے لیے باعث ذلت و شرم بن گئی۔'' معاوہ تلخیوں کی انتہا پر پہنچ گئی۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے تپنے لگا تھا۔

''گزشتہ آٹھ سالوں سے میں نے اپنی ذمے داریوں اور مشقتوں سے آگے کچھ نہیں دیکھا سوچا۔ آٹھ سال سے کولھو کا بیل بنے اپنے وجود کو برف میں دبا کے بیٹھی رہی۔ بگڑے ہوئے معاشی حالات سدھارے۔ ایک بہن کی شادی کی دوسری کی شادی کی تیاری ہے۔ تمہاری پڑھائی لکھائی مکمل کرائی۔ دوسرا بھائی پڑھ رہا ہے۔ اگر میں نے اپنے لیے سوچا تو تم لوگوں کا پورا کرکے سوچا ہے۔ تم لوگوں سے میری ایک خوشی، ایک ننھی سی مسرت کی کلی برداشت نہیں ہورہی؟'' شزا کا لہجہ برف کی طرح سرد پڑتا جارہا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ کاش کہ یہ واقعی تمہارے لیے خوشی کا سبب ہوتا۔ اگر تم کسی معقول بندے کا انتخاب کرتیں تو میں خود آگے بڑھ کر تمہاری شادی کراتا، تمہارے لیے سب سے لڑتا لیکن تم نے تو اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان ذمے داریاں نبھاتے نبھاتے بالآخر تھک جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب وہ اپنے تحفظ، اپنے مستقبل اور اپنی پُرسکون زندگی کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان خوابوں کی تعبیر بھی حاصل کرے۔ بہت کچھ کرلیا دوسروں کے لیے، اب کچھ اپنے مقدر کو بھی سنوارا جائے۔ تم بھی یہ اسٹیج آچکا تھا اور ٹھیک ہی تھا اگر تم نے ایسا سوچا لیکن اپنی گھٹن کا اظہار تم ہم سے براہ راست کرتیں۔ اچھے معقول رشتے دنیا سے ختم تو نہیں ہوگئے تھے۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ تم اپنے گھر کی ہوجاؤ۔ تمہاری ہی ضد تھی۔ ہمیں انکار کرکے ستاتی رہیں اور خود اندر ہی اندر سب کچھ طے کرکے شادی بھی رچالی۔'' راحیل بری طرح اکھڑا ہوا تھا۔

''اب بتاؤ مجھے کس طرح حل ہوگا یہ مسئلہ؟'' وہ بےبسی اور احساس ذلت کو دبانے کے لیے بےچینی سے کمرے میں چکرا رہا تھا۔

''تم کچھ عرصے تک امی کو بلکہ کسی کو بھی یہ بات نہ بتاؤ۔ تاشیر نے یقین دلایا ہے کہ وہ کچھ وقت گزرنے کے بعد حالات کو کسی نہ کسی طرح کنٹرول کرلیں گے۔ کچھ عرصے بعد ان کی پروموشن ہوجائے گی پھر وہ الگ گھر کرائے پر لے کر زرافشاں اور چچا چچی کو اعتماد میں لے لیں گے۔''

''اور تمہارا کیا خیال ہے چچا چچی اور زرافشاں یہ خبر سننے کے بعد تمہارے لیے برات سجا کے لے آئیں گے؟'' اس نے طنز کے تیر برسائے۔ وہ خفیف سی ہوگئی۔

''وہ کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کرلیں گے۔'' وہ نظر جھکا کر بولی۔

''شٹ!'' راحیل نے ہتھیلی پر مکا مارا۔

''تم خود بات کرلو ان سے۔ وہ تمہیں یقین دلائیں گے کہ وہ جھوٹے نہیں ہیں۔'' اور پھر جب راحیل اپنے جذبات پر بمشکل قابو پاکر تاشیر احمد کا سامنا کرنے پر راضی ہوا تو ان کے انداز دیکھ کر وہ مزید مایوس اور پریشان ہوگیا۔

وہ بڑے افسر ہوں گے تو اپنے گھر میں ہوں گے ایسی بھی کیا اکڑ اور غرور۔ وہ ایک کمرے پر مشتمل اس گھر کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے قالین پر چلنے والے کے قدم اچانک کوڑے کرکٹ میں آن پڑے ہوں۔

''آپ لوگ اس گھٹی ہوئی تنگ و تاریک جگہ پر رہتے ہیں؟'' انہوں نے ناگواری سے ناک چڑھائی تھی۔

''جی ہاں، یہی ہے ہمارا ٹھکانا۔'' راحیل نے اپنے اندر کی کڑواہٹ کو بمشکل اخلاق کا غلاف اوڑھایا۔

''بہرحال، عرض کیجیے آپ کو مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟ میں آفس سے آدھے گھنٹے کی لیو پر آیا ہوں۔'' وہ بڑے مصروف و بےنیاز انداز میں مخاطب تھے۔ گویا کوئی

حاکم رعایا کی درخواست پروزٹ کرنے آیا ہو۔

راحیل نے خون کے گھونٹ پی کر اپنے اعصاب نارمل رکھے تھے۔

آہ! یہ ذلت بھی تقدیر نے لکھی تھی۔ عزتوں کے مسئلے انسان کو ذلت اور کمتری کے جانے کس پاتال میں پھینک دیتے ہیں۔ کیا ستم تھا کہ جو مجرم تھا وہی اکڑ کے بیٹھا ہوا تھا اور مدعی مجرم بنا بے بسی سے اپنی ذلت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

شہزینہ گھر پر ہی تھی۔ سلام دعا کے بعد وہ فوراً کچن میں گھس گئی تھی "میرے لیے شوگر صرف ہاف ٹی اسپون ڈالنا۔ تمہیں میرے ٹیسٹ کا پتا ہونا چاہیے۔ میں اپنی فٹنس کا بہت خیال رکھتا ہوں۔" انہوں نے قدرے تحکم سے شہزینہ کو مخاطب کیا تھا انداز میں ایک مخصوص استحقاق اور بے پروائی تھی۔

"جی اچھا۔" شہزینہ اپنی سرخوشی و سرشاری کی کیفیت چھپا کے خاموشی سے چائے بنا کر انہیں پیش کرنے لگی۔ راحیل کا وجود گویا کانٹے دار جھاڑیوں پر گھسیٹا گیا تھا۔

اس کی بہن کس طرح اس عزت کے دشمن کی نازبرداریاں کر رہی تھی اور وہ کس درجہ شاہانہ انداز میں تنے بیٹھے تھے۔ اس کا لہو شریانوں میں کھولنے لگا تھا۔ تاہم وہ مسلسل خود کو صبر و ضبط کے سبق پڑھا رہا تھا۔

"آپ نے شزا کو اپنا کر جو قدم اٹھایا ہے اس کے نتائج اور ردعمل پر غور کیا ہے آپ نے؟" راحیل کو موزوں الفاظ تلاش کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا تھا۔

"یہ بات مجھے نہیں آپ کی بہن کو سوچنی چاہیے تھی میں اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں تھا۔ میں جو کر نہیں سکتا اس کے دعوے بھی نہیں کرتا نہ جھوٹے خواب دکھا کر دوسرے کو فرسٹریٹ کرتا ہوں۔ آپ کی بہن کو مجھ پر اعتبار نہیں تھا اسے رشتہ مضبوط کرنے کی جلدی تھی سو میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔" انہوں نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ راحیل سناٹے میں آ گیا۔ کس بے قدرے اور اتھلے شخص کو شزا نے اپنی زندگی کی ڈور تھمائی تھی۔

"اب آگے کیا ارادے ہیں؟" وہ اپنے اشتعال کے خلاف مسلسل نبرد آزما تھا۔

"ارادے کیا ہونے ہیں شادی تو ہو گئی ہے اب کوشش کروں گا ایک ڈیڑھ سال میں کسی مناسب گھر کا بندوبست کر لوں۔"

"کیا مطلب! کیا ایک ڈیڑھ سال تک یہ تعلق خفیہ رہے گا؟" راحیل بری طرح چونکا تھا۔

"کیا حرج ہے۔" انہوں نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

راحیل کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

"میں اتنی جلدی اس شادی کو اوپن نہیں کر سکتا۔ میں نے یہ بات کورٹ میرج سے پہلے بھی شزا کو بتا دی تھی اور اس نے اس بات پر ایگری کیا تھا۔"

راحیل نے جھلسا دینے والی نظروں سے شزا کو دیکھا۔ وہ نظر چرا گئی۔

"جب تم نے خود ہی اپنے راستے میں کانٹے بو لیے ہیں تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔" راحیل ایک دم سے باہر نکل گیا تھا۔

"آپ ایزی ہو کر بیٹھیے ناں۔" راحیل کے نکلتے ہی شزا نے بڑی نرمی اور چاہت سے انہیں مخاطب کیا تھا۔ انہوں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔

"اچھا...... پھر تم ادھر آؤ، ہمارے پاس۔" ان کی آنکھوں میں سرمستی چھا گئی تھی۔

"آں...... آں......" شزا نے آنکھیں نچا کر بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"دروازہ بند بھی کیا جا سکتا ہے۔" گھنی مونچھوں تلے ان کے سرلب مسکرائے۔ شزا فدا ہو کر رہ گئی۔

"بھائی آ جائے گا۔" اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

"وہ خاصا سمجھ دار ہے، اب کافی دیر تک نہیں آئے گا۔"

وہ ایزی ہو کر پلنگ پر نیم دراز ہو گئے تھے۔ شزا کے دل کی دھڑکنیں زیر و زبر ہو گئیں۔

☆☆☆

عید کی چھٹیوں پر اسکول بند تھے۔ عید کے بعد جب اسکول کھلے تو اسٹاف نے شزا کا چمکتا دمکتا نکھرا ہوا سرخ سرخ سراپا بغور نوٹس کیا۔

"کیا بات ہے، بڑی ہری بھری رنگ رنگیلی البیلی رسیلی دکھائی دے رہی ہو؟" اس کی رازدار اور سب سے قریبی دوست عاتکہ نے چھیڑ خانی کی تھی۔ شزا سرشاری سے ہنس دی۔

"اس دفعہ عید پر بہت انجوائے کیا۔ انہوں نے عید کا دوسرا دن سارے کا سارا میرے لیے وقف کر دیا تھا۔ اب تو راحیل بھی جانتا ہے اس لیے مسئلہ نہیں ہوا وہ گاڑی لے کے صبح دس بجے مجھے پک کرنے آئے اور رات کو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے واپس ڈراپ کیا۔ سارا دن ہم نے اسلام آباد کے مرغزار اور پارک ناپے، راول لیک پر بیٹھ کے رومینٹک باتیں کیں پھر رات کو انہوں نے مجھے کراؤن پلازہ میں ڈنر دیا۔ اُف...... کیسی سحر انگیز قربت ہے ان کی۔ کیا جادو ہے ان کی ہمراہی کا۔ میں تو بے تابی سے اس دن کا انتظار کر رہی ہوں جب وہ کھلے عام زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پورے حق کے ساتھ میرے پاس آیا کریں گے اور میرے ساتھ رہا کریں گے۔"

"آتے تو وہ اب بھی ہیں تمہارے گھر میں۔" عاتکہ کا انداز کچھ چبھتا ہوا سا تھا۔

"ارے، یہ آنا بھی کیا آنا ہے۔ چوروں کی طرح آتے ہیں۔ گھنٹا دو گھنٹا بیٹھتے ہیں پھر چل دیتے ہیں اور میں بھی اس گھر میں آنے کے خواب کب دیکھتی ہوں، میں تو اس گھر کی بات کر رہی ہوں جو وہ مجھے لے کے دیں گے۔ سب میرے پورے اختیار میں ہوگا۔ ایک حق ......" عاتکہ اس کا منہ دیکھتی بے ساختہ کچھ کہتے کہتے رہ گئی تھی۔

☆☆☆

"السلام علیکم زرافشاں کیسے مزاج ہیں؟" چچا کے گھر داخل ہوتے ہی اس کا ٹاکرا زرافشاں سے ہوا تھا۔

"ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔ آؤ بیٹھو۔" زرافشاں نے اخلاقاً مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا۔

"کہیں جانے کی تیاری ہے کیا؟" شزا نے بہت غور سے اپنی سوتن کا جگمگاتا روپ سروپ دیکھا تھا۔ سیاہ ساڑی میں زرافشاں کی دودھیا رنگت دمک رہی تھی۔

"ہاں، میں بچوں کے ساتھ شاپنگ کے لیے مارکیٹ جا رہی ہوں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ تم آرام سے بیٹھ کے میگزین پڑھو، آنٹی ابھی آتی ہی ہوں گی۔ وہ ہاسپٹل بی پی چیک کرانے گئی ہیں۔ میں شرفو کو چائے کا بول دوں گی۔"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ چچا جان کہاں گئے ہیں؟"

"وہ دو دن کے لیے کراچی گئے ہوئے ہیں۔"

زرافشاں ساڑی کا پلو سنبھالتے ہوئے ایکسکیوزمی کہہ کر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ باہر نکل گئی۔ گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ خود ڈرائیو کرتی تھی۔

زرافشاں کے جانے کے بعد شزا نے ریلیکس ہو کر عظیم الشان گھر کے قیمتی نوادرات سے سجے در و دیوار اور فرنیچر کو دیکھا۔

"یہ سب میرا ہونا چاہیے۔ میرا بھی تو کوئی حق بنتا ہے اس گھر پر۔" اس کے اندر سے ندا آئی تھی۔

مگر ابھی کہاں۔ یہاں تک پہنچنے میں شاید بہت دیر لگے گی۔

چار بج رہے تھے۔ سوا چار بجے تک تاثیر آفس سے آ جاتے تھے۔ اس نے سائیڈ کی دیوار پر لگے اسٹائلش آبنوسی فریم والے شیشے میں اپنا حلیہ دیکھا۔ اورنج اور آف وائٹ کمبی نیشن کے شلوار قمیص میں وہ بہت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

"ارے تم...... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" جونہی وہ اندر داخل ہوئے اسے موجود پا کر ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔

"توبہ، کس قدر روکھے انداز میں بات کر رہے ہیں۔ ارے بھئی میں چچا چچی کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔" وہ لہک کر ان کے قریب آئی اور ان کے ہاتھ سے کوٹ لے کر بڑے پیار سے ان کی ٹائی کی گرہ کھولنے لگی تھی۔

"ہوں...... تو گویا راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔"

انہوں نے بلا تکلف اپنی بانہوں کا حلقہ اس کے گرد پھیلا دیا۔

''آؤ کمرے میں چلیں۔'' ان کی آنکھوں کے شوخ اشارے اس کے دل کی دنیا میں ہلچل مچانے لگے۔

''آؤ ناں، آج میں تمہیں اپنا بیڈروم دکھاتا ہوں۔''

وہ اسے تھام کر بیڈروم میں لے آئے۔

''ہونہہ، یہ آپ کا کب ہوا۔ اس کی ایک ایک چیز زرافشاں کی پسند سے خریدی گئی ہے اسی کے ہاتھوں سے سجائی گئی ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''اپنا اور اس کا مقابلہ نہیں کرو اور نہ الٹے سیدھے سوال جواب کر کے میرا موڈ آف کرو۔'' انہوں نے سر جھٹکا۔

''اوکے...... اوکے بابا......'' وہ شوخی سے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے ہنسی تھی۔

وہ کیف و نشاط اور قربتوں کے انتہائی مراحل طے کر رہے تھے اور محبت بھری ساعتوں میں اس درجہ گم تھے کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی کب زرافشاں دوپٹا رنگوانے کے لیے ڈریس کا چھوٹا سا پیس لینے گھر آئی، کس وقت چوکیدار نے دروازہ کھولا اور کب وہ اچانک بیڈروم میں داخل ہوئی۔

اندر کا سین دیکھ کر اس کی آنکھیں بے یقینی سے ابلنے لگیں۔

''شزا......!'' اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی تحیر بھری آواز نکلی تھی۔ وہ جیسے پتھر کا بت بن کے رہ گئی تھی۔

شزا بجلی کی تیزی سے اپنا آپ سنبھالتی بیڈ سے نیچے اتری تھی۔

''چڑیل......! ڈائن......! خائن...... کمینی...... خون پی جاؤں گی میں تمہارا......! تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بستر پر چڑھنے کی......'' وہ بپھری ہوئی لہر کی طرح آگے بڑھی تھی پھر اس نے وحشت زدہ اور گھبرائی ہوئی شزا پر حملہ کر دیا۔ ناخنوں سے اس کا منہ نوچ لیا پھر تین تھپڑ کس کے لگاتار اس کے منہ پر مارے۔

تاثیر احمد ہاتھ باندھے خاموشی سے زرافشاں کی کارروائی دیکھ رہے تھے۔ شزا کو افسوس ہوا کہ وہ ایک بار بھی اپنی بیوی کو روکنے یا اسے بچانے کے لیے آگے نہیں بڑھے تھے۔ اس نے خود ہی جنونی حرکتیں کرتی زرافشاں کے زبردستی ہاتھ پکڑ کر اپنا آپ بچایا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''میں بتاؤں یہ کیا بدتمیزی ہے! فاحشہ، بدکردار......'' زرافشاں دوبارہ اس پر پل پڑی مگر شزا چونکہ پہلے ہی اس کے حملے کے لیے تیار تھی اس لیے پھرتی سے وار بچا گئی۔

''اے خبردار! یہ بدکردار...... اور فاحشہ کسے کہا ہے؟'' اب شزا کے لیے مزید چھپانا ناممکن ہو گیا۔

''میں بھی ان کی وہی لگتی ہوں جو تم لگتی ہو۔ زیادہ اچھلنے اور بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیا!'' زرافشاں بری طرح چلا اٹھی۔

''ہاں۔'' اس نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بے خوفی سے زرافشاں کی آنکھوں میں دیکھا تھا اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس کے اس انکشاف پر تاثیر کا چہرہ کس قدر ناگوار اور غصیلے تاثرات سے سج گیا تھا۔ اسے تو بس زرافشاں کے الفاظ آگ لگا گئے تھے۔

''یہ...... یہ کیا بک رہی ہے کتیا......! تاثیر آپ بتائیں۔'' زرافشاں کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی وہ ہراساں کیفیت میں تاثیر کے پاس آئی تھی۔ وہ خاموش رہے۔ ان کی خاموشی ہی ان کا اعتراف بن گئی تھی۔

''تاثیر احمد!'' وہ اچانک ان کے پاس سے ہٹ گئی۔

''اگر یہ درست ہے تو...... تو پھر میں حشر برپا کر دوں گی۔ آپ جانتے ہیں نا مجھے......؟'' زرافشاں کی آنکھوں میں خوفناک چمک اتر آئی تھی۔

''یہ یونہی بکواس کر رہی ہے ایسا کچھ نہیں زرافشاں پلیز! تم ریلیکس رہو۔ ڈاکٹر نے تمہیں ٹینشن سے منع کیا ہے۔'' وہ نرمی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے گویا اسے بہلا رہے تھے۔ وہ ان دنوں دوبارہ بننے والی تھی۔ شزا کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

یہ کیا کہہ رہے تھے وہ...... کیوں جھٹلا رہے تھے اس رشتے کو؟

''جھوٹ بول رہے ہیں آپ!'' زرافشاں چیخ کر ان سے پرے ہٹ گئی۔ اس کو حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا۔

''اتنی بڑی بات یہ یونہی نہیں کہہ سکتی۔ آپ نے...... آپ نے تاثیر احمد مجھے دھوکا دیا ہے، میرے اعتبار کا خون کیا ہے۔ میری انسلٹ کی ہے۔'' وہ بپھرے ہوئے انداز میں پھنکار رہی تھی۔

''میری بات تو سنو زری۔'' بڑے میٹھے بڑے ملائم انداز میں اس کو چمکار رہے تھے۔

''پلیز زری، ایسے ری ایکٹ نہ کرو۔'' وہ اس کے گال تھپتھپا رہے تھے اور شہزا کے قدموں تلے سے زمین سرکتی جا رہی تھی۔ اسی دوران چچی آ گئیں۔ جب انہیں صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بھی زرافشاں کے ساتھ مل کر اس کو لعنت ملامت کرنے لگیں۔

''آستین کی سانپ! تمہیں نقب لگانے کے لیے میرا ہی گھر ملا تھا۔ کیا اسی دن کے لیے تمہیں اپنے گھر میں پناہ دی تھی؟ تمہاری مدد کی تھی؟'' چچی نے بلا تکلف اس کے بال پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے۔

اس نے بال چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے تاثیر کی طرف دیکھا کہ شاید وہ اسے بیوی اور ماں کے چنگل سے آزاد کرائیں مگر ادھر شدید بیگانگی اور لاتعلقی تھی۔ وہ صدمے سے ادھ موئی ہو گئی۔ اسے تاثیر احمد کی طرف سے اس درجہ بے مروتی اور رکھائی کی توقع نہیں تھی۔

''اور تاثیر...... بیٹے یہ سب کیا ڈراما ہے۔ تم اس مکار چڑیل کے پھندوں میں کیسے پھنس گئے؟ زرافشاں میں کیا کمی تھی۔ جو تم نے یہ قدم اٹھایا۔''

''میں ایک پل یہاں نہیں رہوں گی ممی، میں اپنے بچوں کو لے کر یہاں سے جا رہی ہوں۔ جب اس ڈائن پر دو حرف بھیج دیں تو مجھے بتا دیجیے گا۔'' زرافشاں نے سوٹ کیس نکال کے کھٹ سے کھولا اور کپڑے رکھنے لگی۔

''پلیز زری، ایسے مت کرو۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ میں تمہارا ہوں۔ سب کچھ تمہارا ہے۔ بھلا تم مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو۔ میں تمہارے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔'' وہ اس کا غصہ دور کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ شہزا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

''تو پھر ابھی اور اسی وقت اسے طلاق دیں......'' زرافشاں طیش کے عالم میں غرائی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گا۔ تم اپنا موڈ درست کرو۔'' دوسرے ہی لمحے شہزا چکرا کر فرش پر گر گئی۔ وہ ہوش و حواس سے عاری ہو چکی تھی۔

''ہونہہ! مکر کر رہی ہے بے شرم۔'' چچی نے تنفر کے عالم میں اس کا بے حس و حرکت وجود دیکھ کر کہا۔

''آپ اس کے بھائی کو بلائیں اور کہیں کہ اپنا گند اٹھا کے لے جائے۔'' زرافشاں نے ناک چڑھا کر ناراضی سے کہا۔

''اچھا۔'' وہ رضامند ہو گئے۔ فون کے پاس گئے اور راحیل کے آفس فون کیا۔

''تمہاری بہن کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ ہمارے گھر میں ہے وہ، اسے یہاں سے لے جاؤ۔ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔''

راحیل گھبرایا گھبرایا بھاگم بھاگ وہاں پہنچا۔ ''کیا ہوا شہزا کو؟'' اسے ننگے فرش پر ساکت و صامت پڑا دیکھ کر وہ دہل کر آگے بڑھا تھا۔

''زندہ ہے ابھی۔'' چچی کی طنز و تمسخر میں ڈوبی آواز کی کرختگی راحیل کے اعصاب جھنجنا گئی۔

''بے شرم اور بے غیرت لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرا کرتے۔ میں پوچھتی ہوں کیا یہی گل کھلانے کے لیے یہ ملتان سے یہاں تک آئی تھی۔ تم جانتے ہو اس کے کرتوت یا پھر تم ہی نے آگے بڑھ کر تاثیر کو بہن کے لیے ٹریپ کیا تھا؟'' ان کی زبان آگ اگل رہی تھی۔

''بس کریں چچی جان، بس کریں۔'' راحیل نے ہاتھ باندھ کر ضبط سے کہا۔ ''کیا کریں جب بگاڑ اپنے ہی آنگن سے چلا ہو تو کسی باہر والے کو دوش کیا دیں۔'' وہ جھک کر بے ہوش شہزا کو اٹھانے لگا۔

''نظر رکھا کرو اس پر!'' زرافشاں نے سماعتوں میں زہر انڈیلا۔ ''آج تو یہاں سے اٹھا رہے ہو کل کلاں کو جانے کس جگہ سے اٹھا کے لانا پڑے۔ اسے تو چسکہ پڑ گیا ہے جگہ جگہ منہ مارنے کا۔''

جانے کہاں سے ہمت مجتمع کر کے اس نے بے ہوش شہزا کو اٹھا کر کندھے سے لگایا تھا۔ ایک نگاہ اسٹیچو کی طرح خاموش اور بے تاثر کھڑے تاثیر پر ڈالی اور پھر وہاں سے چل دیا۔ تاثیر احمد اپنی جگہ قدرے خجل سے ہو کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

''تم جانتی ہو کون لایا ہے تمہیں یہاں؟'' جب وہ ہوش میں آئی تو راحیل نے ہونٹ چباتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔

''کک...... کون...... کیا تاثیر یہاں چھوڑ گئے ہیں۔'' وہ خوش فہمیوں کے حصار میں بندھی ایک دم سے اٹھ کے بیٹھ گئی۔

راحیل کے ہونٹوں پر طنز و استہزا کی کیفیت ڈولنے لگی۔

''کاش کنوئیں میں چھلانگ لگاتے ہوئے انسان کی عقل اور ریزننگ کام کرتی رہے تاکہ اسے احساس ہو کہ وہ اپنے ساتھ کیا کرنے لگا ہے۔ جس کے بل بوتے پر تم نے اپنی زندگی برباد کی ہے وہ چپ چاپ تماشائی بنا کھڑا رہا تھا۔ جب تم بے ہوش ہوئیں تو تمہیں کوڑے کی طرح اٹھوانے کے لیے مجھے آفس سے بلوایا تھا۔''

''اصل میں وہ اس وقت بیوی اور ماں کے انتہائی دباؤ کی وجہ سے مجھ سے تعلق اور واسطہ نبھانے سے لاچار تھے۔ ان کو وقتی طور پر پرسکون کرنے کے لیے وہ مجھ سے بے پروا ہو گئے تھے ورنہ......'' وہ اس سے زیادہ خود کو یقین دلا رہی تھی۔

''ہاں جب ہی تو انہوں نے پورا دن خبر نہیں لی۔ میں نے تمہیں شام کو کلینک میں ایڈمٹ کرایا تھا۔ وہاں انہوں نے تین چار گھنٹے تک رکھنے کے بعد تمہیں گھر واپس لایا تھا۔ اس بات کو بھی چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں اور ان کا کوئی پتا نہیں ہے۔''

''اصل میں راحیل ہمارے ہاں فون بھی نہیں ہے اور وہ تین فلور چھوڑ کر کنزیٰ لوگوں کا نمبر ہے وہ میں نے انہیں لکھوایا نہیں تھا اس لیے......'' وہ ان سے بدگمان ہونا جانتی ہی نہیں تھی۔ راحیل کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔ اور یہی جواز تاثیر نے ملاقات ہونے پر شہزا کو دیے تھے۔

وہ پورے ایک ہفتے بعد ویک اینڈ پر اس کے پاس آئے تھے۔

''آپ کی امی اور بیوی مل کر میری درگت بناتے رہے اور آپ خاموش رہے۔ میں بے ہوش ہو کر گری تو آپ کے بازو سنبھالنے کو نہیں آئے۔ اتنے سفاک کیونکر بن گئے تاثیر......''

''ایسی بات نہیں ہے میری جان!'' انہوں نے اپنے مخصوص سحر انگیز انداز میں سحر پھونکا ''لیکن اس سچویشن میں زرافشاں اور ممی زیادہ مظلوم تھیں اس وقت۔ ان پر اچانک آسمان ٹوٹا تھا۔ مجھے ان کی دلدہی کے لیے ان کی فیور تو بہر حال کرنا ہی تھی۔ تم نے بھی حماقت کا ثبوت دیا۔ اصل میں مجھے تم پر اسی بات کا غصہ تھا اس لیے اتنی لاتعلقی دکھائی اور ایک ہفتے تک خبر نہیں لی۔''

''میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا تاثیر۔'' اس نے صفائی دی ''وہ سچویشن ہی ایسی آن پڑی تھی کہ اگر یہ کلیئر نہ کرتی تو مجھ پر بدچلنی کا ٹھپا لگ جاتا۔ بات میرے کردار اور میری عزت تک آن پہنچی تھی۔ میں کیسے چپ چاپ اتنی بے عزتی سہہ جاتی۔''

''فرق بھی کچھ نہیں پڑتا تھا۔'' وہ تلخ موڈ میں نظر آئے ''ان کے کہنے سے کیا ہوتا۔ میں اور تم تو جانتے تھے کہ ہمارا میاں بیوی کا رشتہ ہے۔'' وہ ہکا بکا رہ گئی۔ صدمے نے اس کا دماغ ماؤف کر دیا۔ وہ اسے بیوی اور ماں کی نظروں میں کتنا ہلکا، کتنا گرا ہوا اور بے شرم قرار دینا چاہتے تھے۔

''لیکن ان کی نظروں میں، میں کتنی بری لڑکی بن جاتی۔ یہ بھی سوچا ہے آپ نے؟'' اس نے احتجاجاً شکایت کی تھی۔

''تو تم نے ان سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ سائن کروانا تھا؟'' وہ کسی صورت اس کے حامی نہیں ہو رہے

تھے۔ تنگ آ کر اس نے خود ہی یہ بحث چھوڑ دی۔

''چلیے اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب بتایئے کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''ہونا کیا ہے میں نے بہتیرا انہیں سمجھایا کہ ایسا کچھ نہیں ہے مگر شاید وہ DEPTH پا چکے ہیں۔ جانتے ہیں۔ خصوصاً زرافشاں تو کسی صورت نہیں مانی۔ بالآخر میں نے اعتراف کر لیا۔ وہ بچوں کو لے کر میکے چلی گئی ہے۔ ہفتے بعد جاؤں گا لینے۔ آ گئی تو ٹھیک ہے ورنہ بچے لے کر آ جاؤں گا۔ میں عورتوں کو زیادہ دیر تک اپنی کمزوری بنا کر نہیں رکھا کرتا۔ کتنا عرصہ میکے میں بیٹھے گی۔ دو نہیں تو چار ماہ بعد آ جائے گی...... اور جائے گی کہاں۔''

اس نے ان کی باقی باتوں پر تو دھیان دیا یا نہیں البتہ یہ بات دل کو خوش کر گئی کہ وہ زرافشاں کی بلیک میلنگ کا شکار ہو کر اسے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

''اوہ تاثیر! آپ مجھے نہ ملتے تو میرا جانے کیا بنتا۔ آپ نے تو مجھ سے میرا اپنا آپ چھین لیا ہے۔'' وہ بے طرح ان پر نثار ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

''میں امی کو فون کر کے یہاں بلوانے لگا ہوں۔'' راحیل نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔

''نہیں راحیل ابھی نہیں، پہلے ''ادھر'' کے حالات نارمل ہو جائیں۔ تاثیر نے اپنے گھر والوں کو کہہ دیا ہے کہ وہ شزا کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑیں گے۔ وہ مجھے الگ رکھیں گے۔ چچی جان نے کہا ہے کہ وہ مجھے اس گھر میں نہیں دیکھ سکتیں اور ظاہر ہے ایسا ممکن بھی نہیں۔ چچی اور زرافشاں اس بات پر کسی صورت کمپرومائز نہیں کر سکتیں کہ مجھے اس گھر میں برابر کی جگہ دیں۔''

''بے وقوف لڑکی وہی گھر تمہاری پناہ گاہ، تمہاری پہچان اور تمہاری مضبوطی ہے۔ وہاں تک پہنچ جاؤ گی تو تمہارا کیس مضبوط ہو جائے گا۔ وہی اصل ''قبولیت'' ہے۔'' وہ جھلایا۔

''لیکن وہاں رہنا یا بسنا ممکن نہیں ہے راحیل۔'' شزا نے صاف گوئی سے کام لیا ''میں جانتی ہوں یہ بات میں تاثیر سے بھی بھی نہیں منوا سکتی وہ اس بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کریں گے وہ تو اول روز سے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ مجھے الگ گھر لے کر دیں گے۔ وہاں رکھیں گے۔''

''مگر کب......؟ اب جبکہ بات کھل ہی چکی ہے تو اب انہیں تمہارا کوئی مناسب بندوبست کرنا ہو گا۔ تمہاری اسی طرح ذمے داری اٹھانی ہو گی جس طرح ایک خاوند اپنی بیوی کی اٹھاتا ہے۔ معاشرے میں کچھ تو باوقار مقام ملے تمہیں۔ ایسے تو......'' وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

''وہ یہاں آتے ہیں تو اردگرد کے لوگ جانے کیا کیا باتیں بناتے ہیں۔''

''میں سب کو بتا چکی ہوں کہ وہ میرے خاوند ہیں۔ لوگوں کو کیا حق پہنچتا ہے اعتراض کرنے کا۔''

''وہ پوچھتے ہیں خاوند ہے تو پھر چوروں کی طرح کیوں آتا جاتا ہے۔ طریقے سے بیوی کو رخصت کرا کے کیوں نہیں لے جاتا۔'' وہ زہر خند ہوا۔ وہ لاجواب ہو گئی۔

''بہر حال، یہ کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے۔ تم کیا کہہ رہے تھے امی کو بلوانا چاہتے ہو۔''

''ہاں!'' اس کا لہجہ قطعی تھا ''وہ آئیں گی اور خود تم سے اور تاثیر احمد سے بات کریں گی۔ چچا اور چچی کے پاس بھی جائیں گی کہ شاید کوئی درمیان کی راہ نکل آئے۔ ایسا نہ ہوا تو وہ تاثیر احمد سے دوٹوک بات کریں گی۔ ایک گھر مع اس کے اخراجات، جیب خرچ پانچ ہزار اور انصاف پر مبنی مناسب وقت جو وہ تمہارے ساتھ گزار سکے۔''

''امی یہ خبر سن کر بہت شاکڈ ہوں گی۔ شاید ان سے برداشت نہ ہو سکے۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''اب کیا کریں، تم نے یہ شاک انہیں دینا ہی تھا۔ اگر ان کا خیال ہوتا تو یہ قدم نہ اٹھاتیں یا اٹھانا ہی تھا تو کم از کم ہمیں بتا دیا ہوتا۔ ہم اپنے ہاتھوں کر دیتے۔'' راحیل برہمی سے کہتا ہوا اٹھ گیا۔

☆☆☆

امی آ گئیں۔ ظاہر ہے ان کے صدمے کی کوئی انتہا ہی نہیں تھی۔ تین دن تک مسلسل روتی رہیں اور شزا

بات تک نہیں کی پھر خود کو سمجھا بجھا کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا اور راحیل سے کہا کہ وہ تاثیر احمد کو بلوا دیں۔

تاثیر احمد اسی آن بان اور غرور و تفاخر کے ہمراہ ان کے سامنے تھے۔ امی نے دیکھا۔ آنکھوں میں رتی برابر احساس پشیمانی یا ملامت کا نشان نہیں تھا۔ سب کچھ کر کے بھی وہ اس درجے اکڑے بیٹھے تھے کہ امی نے خود کو دبا دبا محسوس کیا۔

''جی آپ نے بلایا تھا، فرمایئے کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟''

''میں نے اب کیا بات کرنی ہے تاثیر احمد! جو کچھ کرنا تھا آپ نے خود ہی کر ڈالا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ اتنی اچھی شادی شدہ زندگی گزارتے ہوئے یہ نادانی کر گزریں گے۔''

''اس میں سارا دوش آپ کی بیٹی کا ہے ان کی ضد، ہٹ اور اصرار پر یہ شادی ہوئی۔ ورنہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال اب آگے بتایئے، اس بات کو یہیں چھوڑ دیجیے۔'' وہ قدرے رکھائی سے گویا ہوئے۔

''وہ تو نادان تھی، بے وقوف تھی مگر آپ اچھے خاصے سمجھ دار اور میچور بندے تھے۔''

''میں نے کہا ناں کہ میں بھی آپ ہی کی بیٹی کی نادانی بھگت رہا ہوں۔ مجھے کوئی شوق نہیں تھا دوسرا بیاہ رچانے کا۔ میں نے یہ سب کچھ آپ کی بیٹی کی خاطر کیا۔ وہ کسی طرح نہیں مان رہی تھی۔ وہ ہر صورت میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی ورنہ میری زندگی میں کوئی کمی نہیں تھی کہ......'' امی پتھرا کر رہ گئیں۔ بیٹی نے خود کو کس جہنم میں جھونک ڈالا تھا۔

وہ تو سرے سے کسی بھی بات کا ذمہ لیتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ بہر حال ان سے اعتراف جرم کرانے میں ناکام رہیں۔ بیٹی کا معاملہ تھا۔ شادی ہو چکی تھی اب وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ آخر کار بیٹی کے مفادات پر آ گئیں۔ کافی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ بالآخر اس کا ایک ہی اینڈ نکلا۔ ''دیکھیے جی الگ گھر ابھی میں کسی صورت افورڈ نہیں کر سکتا۔ شزا کو کم از کم سال ڈیڑھ سال تک یہیں رہنا ہوگا۔ ہاں یہ ہے کہ میں اسے ماہانہ پانچ ہزار جیب خرچ دیا کروں گا اور آتا جاتا بھی رہوں گا اور اپنے ماں باپ کے گھر میں ساتھ رکھنے کا تو الف سے یے تک کوئی بھی جواز پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ امی بے بسی سے ہاتھ ملتی رہیں۔

☆

''ہاں بھئی کہاں تک پہنچا تمہارا معاملہ، تم بتا رہی تھیں پچھلے دنوں تمہاری امی آئی ہوئی تھیں۔'' عاتکہ نے بریک میں اس سے پوچھا تھا۔

''وہ تو کب کی واپس ملتان چلی گئیں۔''

''اور کیا طے ہوا۔ کب جا رہی ہو تم تاثیر احمد کے ساتھ؟''

''کچھ بھی نہیں۔ وہی پرانی روٹین چلے گی فی الحال، اگلے سال ان کا پروموشن ہوگا تب وہ مجھے ساتھ رکھیں گے۔ ابھی یہ ہے کہ ویک اینڈ پر میرے گھر آ جاتے ہیں۔ راحیل چھ سات بجے تک آتا ہے جبکہ میں ڈیڑھ بجے چھٹی کر کے گھر پہنچ جاتی ہوں۔ تاثیر مجھے یہاں سے پک کر لیتے ہیں ڈیڑھ بجے یا ویک اینڈ کے علاوہ کسی اور دن فرصت ملنے پر......''

''برا نہ ماننا شزا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ جیسے کوئی بیوی کے ساتھ ساتھ اپنی سیکریٹری یا گرل فرینڈ کے ساتھ تعلقات رکھتا ہے سو وہی حال تمہارا ہے۔ بیوی بنایا ہے تو بیوی کی سی عزت بھی دیں۔ نقصان تو سراسر تمہارا ہے۔ اپنے آس پاس کے حلقے میں تم کس قدر بدنام ہو رہی ہو۔''

''بدنامی کیوں؟'' وہ ناک چڑھا کر تیکھی ہوئی۔ ''سب جانتے ہیں وہ میرے خاوند ہیں۔''

''جانتے تو ہوں گے مگر مانتا کوئی نہیں ہے ایسے کاغذی ڈھکوسلوں کو۔ لوگوں کی نظر میں شادی وہی ہے جو محلے کے چار شریفوں کے سامنے ہو اور جس کے بعد لڑکی کو رخصت کرا کے اپنے ساتھ رکھا جائے۔ اس قسم کے تعلقات کو عموماً عیاشی کا نام دیا جاتا ہے۔'' عاتکہ نے اس کی ناراضی کی پروا کیے بغیر دو ٹوک کہہ ڈالا تھا۔

''کچھ بھی ہے میرے لیے تو وہی لمحے زیست کا حاصل ہوتے ہیں جب وہ میرے سامنے ہوتے ہیں۔

اب تو میرا ایک ہی خواب ہے میں جلد از جلد ماں کا رتبہ حاصل کرلوں۔ اس طرح میرا کیس اور مضبوط ہو جائے گا پھر وہ تاحیات مجھ سے جدا نہیں ہو سکیں گے۔ زرافشاں کی طرح میرے اور ان کے بیچ بھی ایک مضبوط ڈور بندھ جائے گی۔'' شزا کسی اور ہی سحر میں گم بول رہی تھی۔

پھر اللہ نے اس کی سن لی۔ تقریباً ایک ماہ بعد اس نے شک ہونے پر چیک کرایا تو پتا چلا کہ وہ پریگنٹ ہے مگر کمزوری بے حد تھی وہ یوں بھی بڑی دھان پان سی تھی۔ اس نے تاثیر احمد کو بتایا تو وہ یوں اس کے پاس سے ہٹے جیسے بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

''کیا بات ہے آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔ ہمارے اور آپ کے پیار کی نشانی اس دنیا میں آرہی ہے۔'' وہ ان کا ردِعمل دیکھ کر قدرے مایوسی سے گویا ہوئی۔

''بات خوشی کی نہیں ہے شزا۔'' وہ نرمی سے گویا ہوئے ''میں بے حد خوش ہوتا مگر اس وقت جب تم میرے گھر میں میرے ساتھ رہ رہی ہوتیں۔ ابھی میں نے تمہیں گھر لے کر نہیں دیا کیونکہ فی الحال افورڈ نہیں کرسکتا تو پھر بچہ کیسے افورڈ کرسکوں گا اور میں یہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ تم اس کال کوٹھڑی میں میرے بچے کو جنم دو اور پال پوس کرو۔ فی الحال تم یہ سلسلہ ختم کرا دو۔ میرا وعدہ ہے جب تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت سے الگ رکھوں گا تو پھر بہت جلد تمہیں ان خوشیوں سے..... نوازوں گا۔

''لیکن تاثیر..... میں اور آپ کون ہوتے ہیں ان نعمتوں کو نوازنے یا چھیننے والے۔ یہ تو قدرت کا عطیہ ہیں۔ قدرت کے کام ہیں۔ اگر وہ ہم پر مہربان ہے تو.....''

''قدرت بعد میں بھی مہربان ہو جائے گی۔'' ان کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ''ابھی یہ سارے مراحل بہت پیچیدگی اور الجھنیں پیدا کردیں گے۔''

اسے دکھی دل کے ساتھ ان کی یہ بات ماننا ہی پڑی۔

یہی نہیں دو ماہ بعد جب وہ دوبارہ پریگنٹ ہوئی تو پھر انہوں نے یہی کیا۔

☆☆☆

ان کی شادی ہوئے آٹھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا کہ خلافِ توقع چھ ماہ پہلے ہی تاثیر کی پروموشن ہو گئی۔ شزا اس خبر پر بے پناہ خوش تھی۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ تاثیر از خود اسے سامان باندھنے کا کہیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔

''تاثیر، وہ راحیل کہہ رہا تھا کہ اب آپ کی پروموشن ہوگئی ہے آپ مجھے الگ گھر میں رکھ سکتے ہیں لہٰذا آپ میرا انتظام کردیں۔'' وہ انہیں چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہنے لگی۔

''اُفوہ! بھئی یہاں کیا تکلیف ہے تمہیں؟'' بیزاری سے گویا ہوئے ''کم از کم یہ تسلی بھی ہے کہ تم اکیلی نہیں رہتی ہو شام کو تمہارا بھائی آجاتا ہے۔ بھائی کے ساتھ رہنا زیادہ محفوظ ہے۔ میں نے گھر لے دیا تو بھی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔ زرافشاں اسی شرط پر گھر واپس آئی ہے یوں بھی وہ میرے تیسرے بیٹے کی ماں بن گئی ہے۔ میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔''

''تو کیا ہمیشہ یہی حساب رہے گا؟'' وہ دہل کر گویا ہوئی۔

''نہیں، کچھ عرصہ گزر جانے دو۔ جب وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائے گی تب میں ہفتے میں دو راتیں تمہارے ساتھ گزار سکوں گا۔ اس وقت گھر لے دوں گا۔ فی الحال تم یہیں رہو۔''

زرافشاں بچوں کی ماں بن کر اتنی مضبوط ہے کہ وہ ان کے ہر فیصلے پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔ وہ سوچنے لگی اور ساتھ ہی اس نے ٹھان لیا کہ اب ماں بنی تو کسی صورت ان کی بات نہیں مانے گی۔ پھر اس پر اللہ کا کرم ہوا اور انہیں پتا چلا تو وہ ضد پر اڑ گئی۔

''نہیں تاثیر، میں نے دو بار آپ کی مانی ہے ایک بار آپ بھی میری مان لیں۔ اگر آپ افورڈ نہیں کرسکتے تو نہ کیجیے۔ میں خود پال لوں گی، خود کما کے اس کی ضروریات پوری کرلوں گی آپ کو اس معاملے میں قطعی تنگ نہیں کروں گی۔''

وہ ہونٹ بھینچ کے خاموش ہو رہے مگر ان کی

خاموشی بڑی معنی خیز تھی۔ شزا خوش تھی کہ وہ اپنے اور تاثیر کے بیچ ایک پل تخلیق کرنے جا رہی ہے۔ سال تو ہونے لگا تھا اس تعلق کو۔ اس دوران بہت ساری خوش فہمیاں دور ہو چکی تھیں۔ یہ تعلق ان کے لیے وہ عارضی تسکین تھی جسے وہ ہر ماہ صرف پانچ ہزار خرچ کر کے جب چاہے حاصل کر لیتے تھے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا جا رہا تھا کہ اسے ان کے حوالے سے معاشرے میں ایک پہچان چاہیے۔

یوں تو پھر شادی کے بعد بھی اس نے کچھ نہیں پایا تھا۔ وہی مشقتیں، وہی مزدوریاں، وہی اکیلا پن اور وہی سونی سونی راتیں۔

دو ماہ پہلے رانیہ کی بھی رخصتی ہو گئی تھی۔ اب امی راحیل کی دلہن لانے کا سوچ رہی تھیں۔ راحیل کو ایک اور کمپنی میں آٹھ ہزار ماہوار تنخواہ پر نوکری مل گئی تھی اور اب وہ اپنی بیوی کو افورڈ کر سکتا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ شزا اپنے گھر کی ہو جائے تو راحیل دلہن کو بیاہ کے یہاں لے آئے۔ کیونکہ ظاہر ہے دو سے تین لوگ اس کمرے میں بہرحال نہیں رہ سکتے تھے۔

☆☆☆

''کیا بات ہے کس قدر کمزور اور پیلی پھٹک نظر آ رہی ہو اور یہ تین دن کی میڈیکل لیو کیوں بھجوائی۔'' وہ اسکول آئی تو عائمہ نے فری پیریڈ میں اس سے پوچھ گچھ کی۔

''میرا ابارشن ہو گیا ہے عائمہ۔'' وہ آنسوؤں سے رو دی۔

''ابارشن ہو گیا ہے حسب معمول خود کروایا ہے اپنے خاوند کی فرمائش پر۔'' عائمہ نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''نہیں نہیں، اب کی بار تو وہ میری ضد اور خواہش پر خاموش ہو گئے تھے۔ اچھا خاصا تیسرا مہینہ شروع ہو چکا تھا کہ اچانک پرسوں اتفاقاً میری اور تاثیر کی ٹکر ہو گئی۔ ٹکرا کر میں غیر متوازن انداز میں لہراتے ہوئے دھپ سے فرش پر گری۔ ساتھ ہی بلیڈنگ شروع ہو گئی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اتفاقاً ٹکر ہوئی یا جان بوجھ کر ایسا کیا گیا؟'' عائمہ کا لہجہ بدستور کاٹ دار تھا۔

''ارے نہیں بھئی، وہ ایسا کیوں کرنے لگے۔ میری ضد پر مجھ سے ناراض ضرور تھے مگر ایسے سنگدل تو نہیں ہو سکتے کہ اپنے ہی بچے کو نقصان پہنچا دیں۔''

''ہونے کو سب کچھ ہو سکتا ہے مائی ڈیئر، ڈیڑھ سال سے اوپر ہو گیا ہے وہ نہ تمہیں الگ گھر لے کے دیتے ہیں نہ اپنے ذاتی گھر میں رکھتے ہیں اور نہ بچے کی ماں بننے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کا کیا مطلب نکلتا ہے۔ ظاہر ہے ایک معزز فیملی کی خوب صورت بیوی اور بھرپور تندرست تین بیٹے ان کے پاس ہیں تمہارے ساتھ صرف ٹھرک جھاڑنے کو رشتہ بنایا بلکہ وہ تو اس پسندیدگی کو یونہی چلنے دیتے تمہارے اصرار پر مجبوراً شادی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ تم ٹھہریں بے وقوف، نادان، جذباتی۔'' عائمہ کا لہجہ زہر آلود تھا۔

''ایسا نہ کہو۔'' حقائق کو دل تسلیم کرلے تو اچانک ہی سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ شزا کا دل ڈوبنے لگا۔

''لیکن میں کیا کروں عائمہ، میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ادھر امی نے راحیل کی منگنی کر دی ہے۔ سال چھ ماہ بعد شادی کا ارادہ ہے۔ راحیل میری وجہ سے اس معاملے کو ٹال رہا ہے وہ چاہتا ہے پہلے میں اپنے گھر کی ہو جاؤں پھر وہ اپنی ازدواجی زندگی شروع کرے گا۔''

''تم ایک بند گلی میں آ کھڑی ہوئی ہو۔ چاروں طرف کوئی سیدھا راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ میں تمہیں کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔ ایک ایک کر کے تم اپنی ساری کشتیاں جلا چکی ہو۔ اب تو لے دے کے یہی حل رہ جاتا ہے کہ تم کسی نہ کسی طرح اس کے بچے کی ماں بن جاؤ پھر وہ تمہیں آسانی سے جھٹک نہیں سکے گا اور لامحالہ اسے تمہیں کوئی مقام دینا ہی پڑے گا۔ ایسے تو صرف اس کی ذہنی و جذباتی تسکین اور ٹائم پاس کا ذریعہ ہو اس کے لیے۔''

''ان کا رویہ ان ڈیڑھ سالوں میں بہت بدل چکا ہے۔ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے جیسے وہ مجھے پیسے سے خریدی گئی کوئی آسائش سمجھتے ہیں جس کو

بہت چاہیں برتیں۔ مجھے ہمیشہ ان کو پلیز کرنا پڑتا ہے، وہ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوں گے تو میں گویا ناک رگڑ رگڑ کر انہیں مناؤں گی۔ ہمیشہ میں ہی آگے بڑھ کر انہیں قائل کروں گی خود وہ اکڑے بیٹھے رہتے ہیں۔ گھر آتے ہیں تو توقع رکھتے ہیں کہ میں خادماؤں کی طرح ان کے آگے پیچھے پھروں۔ ان کی تلخ باتوں کے جواب میں بھی مسکراہٹ پیش کروں۔ جبکہ زرافشاں کے ساتھ نہایت نرمی اور محبت سے پیش آتے ہیں۔

''وہ کسی چیز کے بارے میں کہہ دے تو لا کے دینا گویا فرض بن جاتا ہے میں کہوں تو کہتے ہیں خود لے لو۔ سارے جہان میں پھرتی ہو مارکیٹ بھی چلی جایا کرو۔ عید آئے تو زرافشاں کی پسند کے ڈریس، جوتے، جیولری بڑے نہایت اہتمام سے خریدیں گے اور میں ان کے ساتھ چلنے کو کہوں تو ہزار بارہ سو روپے پکڑا دیں گے کہ خود ہی لے لینا۔ سچ ہے بیوی وہی ہوتی ہے جو عزت و آبرو کے ساتھ گواہوں اور گھر والوں کی موجودگی میں رخصت ہو کے ساتھ جائے۔ میرے جیسی لڑکیاں تو بس وقتی چسکے کے لیے بیویاں بنائی جاتی ہیں۔'' وہ یاسیت سے گویا ہوئی۔

☆☆☆

''یہ کیا ہے۔ کیا ہے یہ......'' تاثیر نے بری طرح چیخوں کی بارش کر دی تھی۔ پریگنینسی رپورٹ اچانک شزا کے بیگ سے ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ بڑے موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے شزا کچن میں کباب تل رہی تھی۔ اس کا بیگ ٹیبل پر پڑا تھا۔ یونہی انہوں نے کھول کر دیکھا تو اندر پولی کلینک سے کرائی گئی یہ رپورٹ ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ لکھی گئی تاریخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ رپورٹ ایک مہینہ پہلے کرائی گئی تھی۔

''ایک مہینہ پہلے تم نے ٹیسٹ کرایا اور مجھے خبر نہیں ہونے دی۔ بتاؤ...... کیا سوچ کر تم نے ایسا کیا۔ مجھ سے چالبازی کرتی ہو؟''

انہوں نے بے دردی سے اسے فرش پر دھکا دے دیا اور مارنے لگے۔ ''پلیز تاثیر، پلیز...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ایسا رویہ ایسا لہجہ آپ پر سوٹ نہیں کرتا۔'' اس کا آئیڈیل کرچی کرچی ہو کر بکھر رہا تھا۔

''یقیناً کسی اور سے منہ کالا کیا ہوگا جو یہ رپورٹ پازیٹو آئی ہے۔'' انہوں نے دوسری زوردار ٹھوکر لگائی۔ وہ چکرا کر گری اور پھر بری طرح تکلیف سے تڑپنے لگی۔

''ہائے امی......!'' وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کے کراہتے ہوئے گر پڑی۔ وہ ضبط چھوڑ کر چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ ایک چوٹ وجود پر لگی تھی دوسری دل پر۔ جس کے لیے وہ وفا کی ساری منزلیں طے کرتے ہوئے بھائی اور ماں کی عزت پر بٹا لگا آئی تھی وہی اسے شرمناک الزامات سے نواز رہا تھا۔

''کس کے ساتھ منہ کالا کر کے آئی ہے؟'' اس کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔

تاثیر احمد نے ہاتھ روک کر بغور اس کی حالت کا جائزہ لیا پھر ایک اطمینان سا ان کی آنکھوں سے جھلکنے لگا۔

''کیا ہوا میری جان! شزا......'' وہ اس کے قریب آ گئے مگر اس وقت تک شزا بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''ایک اور ابارشن ایک اور زندگی کا قتل، تمہارا خاوند انسان ہے یا بھیڑیا۔ کب تک بھینٹ چڑھاؤ گی خود کو اور آنے والے بچوں کو۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک دن تمہارے وجود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دے اس سے پیچھا چھڑا لو۔''

بار بار میڈیکل لیو لے کر چھٹیاں کرنے پر اسے اسکول کی طرف سے ٹرمینیشن لیٹر مل گیا تھا۔ عائمہ حق دوستی نبھاتے ہوئے اس کے گھر آ گئی تھی اس سے ملنے۔

''یوں رو رو کر اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ اس کار محبت میں کچھ حاصل وصول نہیں ہوا کرتا۔ ماسوائے رسوائی اور پچھتاوؤں کے...... ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ اس سفر میں کوئی نہ کوئی دوسرا اہم سفر مل ہی جائے گا اور نہ بھی ملا تو یوں اذیتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ جینے سے تو اکیلے جینا بہت بہتر ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو، راحیل کا بھی یہی خیال ہے۔'' وہ سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی ''لیکن میرا دل کہتا ہے کہ یہ سزا جاری رہے تاکہ کچھ تو کفارہ ادا ہو جائے۔ ماں اور ماں جائے کا دل دکھانے کا۔ جذبات کی رو میں بہک کر اپنی عزتِ نفس اور خودداری کا خون کرنے کا۔''

''دو سال سے سزا ہی تو بھگت رہی ہو۔'' عاتکہ نے افسوس سے اسے دیکھا۔ وہ سوکھ کے کانٹا ہو گئی تھی۔ رنگت کی گلابیاں سنولا گئی تھیں۔ آنکھیں بجھی بجھی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔

''تم آج یہیں روزہ افطار کرو ناں۔'' اس نے عاتکہ سے درخواست کی ''راحیل کے آج آفس میں افطاری ہے میں اکیلی ہی ہوں گی۔''

''میں ضرور رک جاتی لیکن آج لاہور سے کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ افطاری کے لیے امی کو میری مدد چاہیے ہو گی۔ مجھے اجازت دو اور خود سنجیدگی سے سوچو کہ یہ رشتہ ختم کرنا ہی تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔ اس میں سوائے خواری کے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ وہ بندہ سیریس ہی نہیں ہے اسے نبھانے میں۔'' شزا کے آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔

''کتنی دقتوں سے، کتنے ارمانوں سے یہ رشتہ جوڑا تھا۔ کتنے خواب آنکھوں میں پروئے تھے اور کس موڑ پر آن پہنچا ہے کہ اب چھٹکارے کے لیے پلاننگ کی جا رہی ہے۔ مجھے یہ فکر بھی ہے کہ کہیں وہ محض ضد یا انا میں مجھ سے علیحدگی کو چیلنج سمجھ لیں۔ محض اپنے غرور و تکبر کی تسکین کی خاطر اڑ نہ جائیں۔''

''ان کی اڑی توڑنے کے لیے بہتیرے بندے بیٹھے ہیں۔ تم ملتان سے اپنی امی کو بلاؤ۔ وہ تمہارے چچا چچی اور زرافشاں سے بات کریں گی۔ وہ تو سو جان سے راضی ہو جائیں گے تمہیں طلاق دلوانے کے لیے اور ان کے دباؤ کے آگے تاثیر احمد بھلا کب تک ٹھہر سکیں گے۔'' عاتکہ نے پُرجوش ہو کر کہا تھا۔

☆☆☆

بالآخر انہوں نے طلاق کے کاغذات اسے بھجوا دیے۔

لیکن یہاں تک پہنچتے پہنچتے اٹھائیسواں روزہ آ گیا تھا۔ امی گزشتہ دس دن سے ملتان سے اسلام آباد آئی ہوئی تھیں ''اب دو ہی تو دن رہ گئے ہیں عید میں۔ عید یہیں کر کے جائیں۔ اس بار اسلام آباد کی عید کی رونقیں ملاحظہ کریں۔'' راحیل نے فرمائش کر کے انہیں روک لیا تھا۔ وہ ایک مدت بعد خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

''شکر ہے تم نے ایک عقل مندانہ فیصلہ تو کیا۔ زندگی تاثیر احمد کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ میں خود کراؤں گی اپنی بہن کی شادی۔'' عید والے دن عید ملتے ہوئے اس نے دل سے بہن کو گلے لگایا تھا۔

''ابھی نہیں۔''

''ظاہر ہے ابھی تو ہو بھی نہیں سکتی چند ماہ تک۔ عدت پوری کرنے کے بعد ہی کرو گی۔''

''پہلے تمہاری شادی ہو گی، تمہاری منگنی کو سال ہو گیا ہے۔ رابعہ کے گھر والے مسلسل زور دے رہے ہیں۔ رابعہ بیاہ کر یہاں اس گھر میں آ جائے گی اور میں عید کے بعد امی کے ساتھ ملتان جا رہی ہوں۔ اب وہیں ماں کی ممتا کی چھاؤں میں رہوں گی۔ وہیں کسی اسکول میں جاب کر لوں گی۔ پیسے کم ملیں گے مگر سکون تو ہو گا۔ بہت رہ لیے یہاں...... اب اسلام آباد سے اپنا جی اچاٹ ہو گیا ہے۔''

''بہت اچھا فیصلہ کیا ہے بیٹی، تم تو بن بیاہے سالوں سے پرائی رہی ہو۔ پردیس پرایا ہی تو کر دیتا ہے بندے کو۔ کچھ عرصہ ماں کے ساتھ بھی گزار دو۔ آٹھ دس سال سے مشقت کی چکی میں پستی رہی ہو۔ اب بہت ہو گیا اور رہی رشتے کی بات تو خالہ کبریٰ زندہ باد! تمہارے نصیب کا کوئی نہ کوئی جوڑ ڈھونڈ ہی لائیں گی۔'' ماں نے شفقت سے اپنی آغوش میں سمو لیا۔

ہائے ایسے پیار بھرے سکون آسا اور تحفظ سے لبریز رشتے چھوڑ کر ہم نادان لڑکیاں کیسے کیسے بظاہر سحر انگیز مگر بباطن سیاہ دل والوں کے پیچھے لپکتی ہیں۔

☆☆☆

شازیہ چوہدری

آفیسرز کالونی میں دھیرے دھیرے شام اتر رہی تھی۔

کچھ گہرے بادلوں، سرمئی پہاڑوں کی ملگجی چوٹیوں اور سرسبز و شاداب وادی کے گھنے درختوں نے شام کے اس رنگ کو مزید گہرا کر دیا تھا۔

شہ لالہ اپنے گھر کے گیٹ پر کھڑی تھی۔ گیٹ کے سامنے گھر کے متوازی رخ پر سیاہ کولتار کی سڑک تھی

ناولٹ

جس کے دونوں اطراف سفیدے اور پاپلر کے درخت ایک ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔ یہ سڑک ٹریفک کے لیے بہت کم استعمال کی جاتی تھی اس لیے کالونی کے بچے بے فکری سے یہاں کرکٹ، فٹ بال اور دیگر پسندیدہ کھیل کھیلتے تھے۔ بوڑھے اور خواتین اکثر ٹولیوں کی صورت میں چہل قدمی کرتے نظر آتے تھے۔ مغرب کے بعد جب مائیں بچوں کو گھروں میں بلاتی تھیں، تب کہیں یہاں سناٹا دیکھنے میں آتا تھا اور اس وقت یہی سماں تھا۔ مغرب ہو چکی تھی سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

شہ لالہ سخت اکتاہٹ کے عالم میں گیٹ سے کچھ فاصلے پر لگے سفیدے کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ چہرے پر بیزاری اور جھنجھلاہٹ کے تاثرات نمایاں تھے۔

"پتا نہیں اپیا اور بے جی کب لوٹیں گی اسپتال سے؟"

اس نے کوفت سے سر جھٹکتے ہوئے سوچا۔

"ویسے تو ڈیڈی کے آنے کا وقت بھی ہو چلا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر میں آجائیں۔ مجھے گیٹ سے باہر کھڑا دیکھ کر یقیناً" خفا بھی ہوں گے۔ مگر میں کیا کروں اندر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ یا اللہ کس درجہ بوریت ہے اس کالونی میں۔ نہ کوئی ہلچل نہ ہنگامہ۔ اُفوہ۔" وہ دل ہی دل میں جز بز ہو رہی تھی۔

"شجی بھیا کو بھی نہیں بتایا کہ میں باہر ہوں۔ اندر گھر میں ڈھونڈ رہے ہوں گے مجھے مگر نہیں یقیناً" اپنے محبوب ٹی وی کے آگے جمے بیٹھے ہوں گے۔ ٹی وی کے آگے تو ساری دنیا بھول جاتے ہیں۔"

وہ تعلیمی مصروفیات کے سبب بچپن سے شہر کے ہاسٹل میں ہی رہی تھی۔ کالونی میں کم ہی آنا جانا ہوتا تھا۔ ابا کی تو ایف اے کے بعد شعجی بھیا سے شادی ہو گئی تھی۔ اس وقت شہ لالہ ساتویں کلاس میں تھی۔ شعجی بھیا ان کے سگے تایازاد تھے۔ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے ایسے میں عرفان صاحب انہیں اپنے گھر یہاں کالونی میں لے آئے۔ جب وہ پڑھ لکھ کر برسرروزگار ہوئے تو اپنی بیٹی گل لالہ سے شادی کر دی۔ اور شادی کے بعد ان کے اسی گھر میں رہنے پر اصرار کیا تھا۔ وہ کہتے تھے۔

"شجاع میرا گھر داماد نہیں بیٹا ہے اور بیٹا باپ کے گھر ہی جچتا ہے۔"

یوں بھی ان کی جاب بھی یہیں تھی اس لیے وہ بخوشی راضی ہو گئے تھے۔

وہ چھ سات قبل بی اے آنرز مکمل کرنے کے بعد مستقلاً کالونی لوٹی تھی۔ اور یہاں چند ماہ رہ کر ہی بور ہو گئی تھی نہ کوئی دوست نہ اور کوئی دلچسپی۔

ٹھنڈی ہواؤں سے بچنے کے لیے وہ سرخ شال کو اچھی طرح سر اور کندھوں پر پھیلائے ہوئے دور افق پر ڈوبتی سرخیوں پر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔

بے دلی کے باعث دو تین دن سے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ سرخ اور سیاہ پرنٹ کا مرینہ کا سوٹ شکن آلود اور ملگجا سا تھا۔

وہ اپنے دھیان میں گم تھی۔ خبر بھی نہ ہوئی کہ کب متوازی سڑک پر عمودی لائن بناتی بڑی سڑک سے تیز رفتاری سے آتی ایک پجارو گھر کے گیٹ کی ڈھلوان روش پر آن رکی۔

اندر سے ایک لمبے قد کا کھلتی ہوئی رنگت اور گھنے چمکدار سیاہ بالوں والا وجیہہ سا مرد نکلا۔ بیل بجانے کی غرض سے دائیں جانب کے گیٹ لیمپ کے نیچے موجود سفید بٹن کو دبانے کے ارادے سے آگے بڑھا تو اس پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ ہونٹ استعجاب کے عالم میں سکڑ گئے اور روشن موٹی موٹی آنکھوں میں چمک در آئی۔

وہ کچھ ایسی کیفیت میں تھا جیسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ اس کے سنجیدہ اور متین چہرے کے منجمد تاثرات میں خوشگواریت سی آ گئی اور پیشانی کی شکنیں لمحے بھر میں غائب ہو گئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک ہی تحیر آمیز مسرت میں گھر گیا ہو۔

شہ لالہ ہنوز بیزاری کے عالم میں خود میں گم تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے سے پھڑپھڑاتے شال کے پلو کو سمیٹتے ہوئے اس نے یونہی نظر گھمائی اور اک بے نیاز نگاہ آنے والے اجنبی شخص پر ڈالی۔ وہ بڑی دلچسپی اور شوق کے عالم میں اس کی طرف متوجہ تھا۔ نظر ملنے پر دھیرے سے مسکرایا۔

"ہیلو، کیسے مزاج ہیں؟"

بھاری لہجہ گمبھیرتا اور سنجیدگی کا امتزاج لیے ہوئے تھا۔ انداز میں حد درجہ وقار جھلک رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔

"ہیلو۔"

شہ لالہ نے کچھ الجھے ہوئے بے پروا انداز میں کہہ کر اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کر لی۔ یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ کس سے ملنا ہے۔ کیا کام ہے۔

"سالگرہ مبارک ہو۔"

اس بار شہ لالہ کو حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ وہ اب حیران سی بغور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ چونتیس برس کا یہ سوبر سا مرد کیسے جانتا تھا کہ آج اس کا جنم دن ہے۔

اس دوران اندر سے ملازم نے گھنٹی کی آواز سن کر گیٹ کھول دیا تھا۔ اسے دیکھ کر زوردار سلام جھاڑا اور اپنی معیت میں اندر لے گیا۔

"کون ہیں یہ صاحب؟ انداز تو خاصے شاہانہ ہیں۔"

وہ حیرانی سے اسے اندر جاتے دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں ڈیڈی کے ملنے والے ہیں یا شعجی بھائی کے.....؟"

جب وہ جی بھر کر باہر کھڑے کھڑے بور ہو گئی تو مضمحل قدموں سے اندر چلی آئی اور لان میں کین کی کرسی پر بیٹھ کر آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھنے لگی۔

"اف کب آئیں گی بے جی اور اپیا۔" اب وہ بری طرح جھلا رہی تھی۔

اندر ڈرائنگ روم سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گویا وہ صاحب شعجی بھیا کے ملنے والے تھے۔

"ارے گڑیا! تم ادھر بیٹھی ہو، میں تمہیں اندر تلاش کر رہا تھا۔"

اسی ساعت شعجی بھیا اس شاندار سے آدمی کے ہمراہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر آئے تھے۔

"جی بس میں آ رہی تھی۔" وہ تیزی سے شال سنبھالتی سیدھی ہو گئی۔

"یہ میری بہن نما سالی ہیں شہ لالہ۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اب مستقل طور پر کالونی آ گئی ہیں۔ ارادہ ہے کہ کچھ عرصے بعد ٹیچنگ لائن جوائن کریں۔"

شعجی بھیا اس کا تعارف کروا رہے تھے۔ شہ لالہ حیران رہ گئی۔ وہ بہت کم شعجی بھیا کے دوستوں سے متعارف ہوتی تھی۔ ان کے ہاں اس کا رواج نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ صاحب کچھ زیادہ ہی "کلوز" ہیں گھر والوں سے۔

"اور لالہ! شاید تمہاری ان سے واقفیت ہو، یہ کالونی کی مشہور و معروف شخصیت ہیں آغا ہارون احمد۔ اس کالونی کا تعمیراتی کام ان کے والد صاحب کی زیرنگرانی تکمیل پایا تھا۔ کالونی کا پرائیویٹ کالج، ہاسپٹل اور دستکاری اسکول بھی انہوں نے تعمیر کرائے ہیں۔ والد صاحب کی وفات کے بعد تمام انتظامات آغا ہارون نے سنبھال لیے ہیں۔

اس خوب صورت کالونی کو مزید بہتر اور پرکشش بنانے کے لیے یہ آج کل ایک جامع منصوبہ ترتیب دے رہے ہیں جس کے تحت بہت مختصر سی مدت میں کالونی میں کلب، ریسٹ ہاؤس، پلے گراؤنڈ اور تفریحی پارک بنانے کے اقدامات کیے جائیں گے بلکہ تفریحی پارک تو تقریباً مکمل ہونے کو ہے۔"

شہ لالہ نے گہری سانس لی۔ اب اندازہ ہوا تھا شعجی بھیا کیوں اس کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ آغا ہارون کی نظریں مسلسل اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور اس احساس نے اس کی ناگواری اور بیزاری کو مزید دوچند کر دیا تھا تاہم وہ مہر بہ لب رہی۔

"اگر مس شہ لالہ پسند کریں تو کالونی کے کالج میں انتظامی معاملات سنبھال سکتی ہیں۔ میڈم طلعت کالج کی پرنسپل ہیں۔ انہیں نظام چلانے کے لیے ایک اعلا تعلیم یافتہ اور ذہین معاون کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے مس شہ لالہ کے تعاون سے ہم جلد ہی اس انٹر کالج کو ڈگری کالج میں تبدیل کر دیں گے۔"

آغا کی تجویز پر شہ لالہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی جانب متوجہ تھا۔ نظر ملنے پر ہولے سے اس کے لب متبسم ہوئے اس کی نظروں میں اتنی چمک اور بھرپور تاثر تھا کہ شہ لالہ نے دوسرے ہی لمحے نگاہ چرا لی۔

"کیسے دیکھتا ہے، جیسے کھا ہی تو جائے گا۔" وہ دل ہی دل میں تلملا رہی تھی۔

"ہاں لالہ! تجویز تو بہت شاندار ہے، کیا خیال ہے؟"

شعجی بھیا نے پرجوش انداز میں کہا۔

"سوچوں گی۔"

وہ دھیرے سے کہہ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔ لاؤنج میں آئی تو ٹیبل پر پڑے دو گفٹ پیک دیکھ کر متحیر رہ گئی۔

"فرام آغا ہارون احمد ٹو..... شہ لالہ۔"

اس کی نظروں میں زمین آسمان گھومنے لگے۔

"مائی گاڈ مجھے کس حساب میں تحفہ دیا ہے۔"

اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں گفٹ پیک کھولے۔ بیش قیمت جیولری سیٹ اور پرفیوم۔ اسے حیرانی کا دورہ پڑ گیا۔ ہیپی برتھ ڈے کا نفیس سا کارڈ الگ سے تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟ انہیں کیسے علم ہوا میری سالگرہ کا اور.....؟"

وہ الجھ رہی تھی۔ اسی دوران شعجی بھیا ادھر چلے آئے تھے۔

"پچھلے سال جب تم چھٹیوں میں شہر سے کالونی آئی تھیں تو تمہاری سالگرہ والے دن آغا تم سے پہلی بار ملے تھے۔ شاید اس وقت کی بات یاد رہ گئی ہو گی۔"

شجی بھیا نے نرمی سے وضاحت کی۔

اور شہ لالہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

پچھلے سال ویک اینڈ پر وہ کالونی میں تھی۔ اتفاق سے چھٹی کا دن تھا۔ سب ہی گھر میں موجود تھے۔ شام کو لان میں بیٹھے چائے کے لوازمات اور سالگرہ کے کیک کے ہمراہ سادہ سے انداز میں اس کی سالگرہ منا کر گفٹس دے رہے تھے، جب ملازم ڈیڈی کی اجازت پا کر آغا کو ادھر ہی لے آیا تھا۔ شہ لالہ سرسری سی سلام دعا کے بعد اندر چلی گئی تھی۔ اپیا بھی دو چار باتوں کے بعد اس کے پیچھے آگئی تھیں۔

"اچھا تو موصوف نے اتنی پرانی بات یاد رکھی تھی، جب ہی تو اس کی صورت کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی مگر مجھ میں ایسی کیا بات نظر آئی اسے، جو میرا جنم دن اتنے دھیان سے ذہن میں محفوظ رکھا؟"

اس سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک عام سی سادہ سی لڑکی تھی۔ اس نے تو نظر بھر کر اسے دیکھا تک نہیں تھا۔

شاید یہی بے نیازی آغا کو بھا گئی تھی۔

"بات کچھ پلے نہیں پڑ رہی شجی بھیا! اتنی معمولی سی بات آغا ہارون کو کیسے یاد رہ گئی۔ میرا مطلب ہے ہمارا تو ان سے کوئی براہ راست تعلق بھی نہیں ہے۔"

"ہاں، حیرانی تو مجھے بھی ہے۔" شجی بھیا پرُخیال انداز میں بولے۔

"وہ میرا دوست بھی ہے مگر بڑا موڈی، من موجی اور متلون مزاج ہے۔"

کالونی میں اس کا بہت رعب اور دبدبہ ہے۔ ظاہر ہے اتنی اونچی حیثیت ہے۔ ڈیڈی بھی اس کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں۔ کالونی والے اس سے حد درجہ خائف رہتے ہیں۔ اس کی خوشنودی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ بہت کم کسی کو لفٹ کراتا ہے۔ بس اپنی ہی دنیا میں رہتا ہے۔"

"آپ یہ گفٹس واپس کر دیتے۔ بھئی جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ آپ کے دوست ضرور ہوں گے مگر میرے لیے تو قطعی اجنبی ہیں۔"

وہ ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

"اتنی ہمت کہاں سے لاتا،" وہ سخت برا مانتا۔" وہ خفیف سے ہو گئے۔

"سچ تو یہ ہے کہ اس کی شخصیت سے اتنا جلال اور تمکنت ٹپکتی ہے کہ بندہ اس کے مزاج کے خلاف بات کہنے کے لیے سو بار سوچتا ہے۔"

"ہونہہ امیر ہوں گے تو اپنے گھر میں ہوں۔ ہم پر کاہے کا رعب جماتے ہیں۔" شہ لالہ نے ناک سکوڑتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو لالہ! بے کار کی ضد چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔"

اپیا اصرار کرتے کرتے عاجز آگئی تھیں مگر وہ مان کے نہیں دے رہی تھی۔

"یقین کیجیے میرا رتی برابر دل نہیں چاہ رہا ہے دعوت میں جانے کو۔ پلیز اپیا!"

وہ لجاجت سے بولی۔

"اس نے خاص طور پر بے جی سے تمہارے لیے کہلوایا تھا۔ دیکھو اتنے بڑے پیمانے پر "آغا پیلس" میں تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ کالونی کے لوگ تو منتظر رہتے ہیں ایسے بلاووں کے۔ آغا ایک بار بلائے تو سو بار سر کے بل چل کر جاتے ہیں۔ بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اس قسم کی شاہانہ دعوتوں میں شریک ہو کر اور ایک تم ہو کہ......" اپیا برا سا منہ بناتے ہوئے بولیں۔

"مجھے معاف رکھیے ایسی دعوتوں سے......" اس کی بیزاری بدستور قائم تھی۔ "اونہہ، خوامخواہ کی بوریت۔" اس نے ناک سکوڑی۔

"ایک تو تم ہر شے سے بہت جلدی بور ہو جاتی ہو۔" اپیا زچ ہونے لگیں۔

"میں چاہ رہی تھی تمہاری تھوڑی سی آؤٹنگ ہو جاتی۔ پھر کالونی کے دیگر معززین سے ملاقات بھی ہو جاتی۔ دل بہل جاتا تمہارا۔"

"بھئی سیدھی سی بات ہے مجھے وہ بندہ ہی نہیں اچھا لگتا۔ عجب پُراسرار سی شخصیت ہے اس کی۔ پھر اس کی گیدڑ رنگ سے مجھے کیا واسطہ۔" وہ قطعیت سے بولی اور اپیا کو ہار ماننا پڑی۔

شام کو شجی بھیا، اپیا اور ڈیڈی دعوت پر چلے گئے۔ بے جی اس کے خیال سے گھر پر رک گئی تھیں۔ وہ ٹائم پاس کرنے کے لیے لاؤنج میں ٹی وی کے آگے جم گئی۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر پروگرام دیکھتے دیکھتے یونہی ذرا دیر کو اونگھ آگئی۔

معاً" فون کی تیز بیل پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وال کلاک پر نظر گئی تو حیران رہ گئی وہ گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے محو خواب تھی۔

"کمال ہے، پتا ہی نہیں چلا۔" وہ چپل گھسیٹتی لابی میں رکھے فون کی طرف بڑھی تھی۔ کھڑکی کے سمٹے ہوئے پردوں سے باہر گہری ہوتی شام کے عکس واضح نظر آ رہے تھے۔

"ہیلو۔" اس نے شکستہ سے انداز میں ریسیور اٹھایا تھا۔

"یہ ستم نہیں تو کیا ہے، کہ جس کے اعزاز میں محفل سجائی جائے وہی منظر سے غائب ہو۔ آپ نے بہت ضبط آزمایا ہے ہمارا۔"

بھاری مردانہ لہجے کا شاکی پن اور استحقاق بھرا انداز انگشت بدنداں کر گیا۔ وہ جیسے پتھر کی ہو گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آغا اس کی غیر حاضری کا اس درجہ نوٹس لے گا۔

"میری طبیعت کچھ ناساز تھی اس لیے۔"

وہ دل سے اٹھتی غصے کی لہر دبا کر رسمی سے معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

"اسے کہتے ہیں، کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ بہرحال اگر آپ بروقت مطلع کر دیتیں تو ہم یہ دعوت کینسل کرا دیتا کہ اس صورت میں اس کے انعقاد کا کچھ جواز ہی نہیں بنتا تھا۔"

شہ لالہ خاک بھی نہ سمجھ سکی۔ آغا کے لہجے میں اتنا حتمی پن اور قطعیت تھی کہ وہ جوابی کارروائی کے طور پر انداز میں سختی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔

"اس میں میرا کیا دوش ہے' یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔"

وہ بمشکل تمام اپنا غصہ ضبط کر رہی تھی۔

"مگر واضح رہے' آپ میری ذاتیات میں دخیل ہو چکی ہیں۔ آج سے نہیں سال بھر پہلے سے۔ آپ کو جان لینا چاہیے۔" آغا کے لہجے میں حد درجہ رعونت اور نروٹھا پن تھا۔

وہ جیسے سکتے میں آ گئی۔

یکلخت اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ مٹھیاں بھینچ گئیں۔ دوران خون تیز ہوتا محسوس ہونے لگا۔

"آپ کس انداز میں مجھ سے بات کر رہے ہیں۔" شہ لالہ کا لہجہ واضح طور پر سخت تھا۔ "میں آپ کی رعایا نہیں ہوں' براہ کرم آپ اپنی حد میں رہیں۔" وہ بھنا کر بولی۔

"اچھی بات ہے' اب میں آپ کو بتاؤں گا میری اور آپ کی حدود کیا ہیں۔" اس کے ساتھ ہی ریسیور رکھ دیا گیا۔

ایک ثانیے کو شہ لالہ بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ ہکا بکا ریسیور ہاتھ میں لیے گھور رہی تھی۔

"دھمکی..... واہ' کیا سمجھتے ہیں موصوف خود کو۔" وہ غصے سے کھولنے لگی۔

"شرم تو نہیں آتی پرائی لڑکیوں کو تاکتے ہوئے' اتنی عمر کو پہنچ گئے' شادی شدہ بھی ہو گئے مگر نظر میں حجاب نہیں بھرا۔"

وہ دانت پیس رہی تھی۔ اپیا بتا رہی تھیں بہت عرصہ قبل اپنے خاندان کی لڑکی سے شادی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کی عمر نے وفا نہیں کی اور شادی کے دو سال بعد وہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھی' اس کے بعد آغا لندن چلا گیا تھا پڑھائی کی غرض سے۔

"اونہہ' وہاں جا کے جانے کیا چاند چڑھائے ہوں گے۔ کسی کو کیا خبر۔" وہ سخت متنفر ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

میڈم طلعت سے مل کر اسے خاصی مسرت ہوئی۔ بڑی قرینے کی خاتون تھیں۔ ان کے ہمراہ ایڈجسٹ ہونے میں اسے چنداں دشواری نہ ہوئی تھی۔ اب کسی حد تک کالونی میں اس کا دل لگنے لگا تھا۔

اس روز اپیا کے لاڈلے بیٹے ارسل کو بخار تھا۔ اپیا خود بھی بیمار تھیں اتفاق سے ڈیڈی اور شجی بھیا دونوں گھر پر نہیں تھے۔ ارسل کو ہاسپٹل لے جانے کا مسئلہ تھا۔

"اپیا میں کالج سے چھٹی کر کے ارسل کو ہاسپٹل لے جا کر دکھا دیتی ہوں۔"

"تم سے سنبھل جائے گا؟" اپیا نقاہت سے بولیں۔ "بہت شرارتی ہے' گھر میں گاڑی بھی نہیں ہے' پیدل اسے اٹھا کے کیسے جاؤ گی؟" وہ پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں' پانچ منٹ کی تو واک ہے۔"

اس نے احتیاط سے گل گوتھنے سے ڈھائی سالہ ارسل کو بازوؤں میں لے لیا۔ جس کے رخسار بخار کی حدت سے سرخ ہو رہے تھے۔

گھر سے سیدھی سڑک ہسپتال کی طرف جاتی تھی۔ سڑک کے اردگرد سفیدے اور پاپلر کے درخت ہوا سے لہرا رہے تھے۔ صبح گیارہ بجے کا وقت تھا۔

"چندا' رونا نہیں' شاباش۔"

وہ تیز تیز چلتی ہوئی ارسل کو تھپک بھی رہی تھی۔ ہسپتال پہنچ کر وہ سیدھی او پی ڈی کی طرف بڑھی تھی۔ خوش قسمتی سے رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ کاؤنٹر پر سلپ بنوانے کے بعد وہ ڈاکٹر کے کمرے کے باہر بیٹھے اٹینڈنٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ڈاکٹر صاحب فارغ ہیں کیا؟"

"وہ جی' راؤنڈ پر ہیں جی۔"

اٹینڈنٹ نے سر سے کھسکتی ہوئی ٹوپی جماتے ہوئے مستعدی سے جواب دیا۔

"راؤنڈ پر؟" اسے تعجب ہوا۔ "مگر نو سے بارہ تو او پی ڈی کا ٹائم ہوتا ہے۔ راؤنڈ بارہ بجے کے بعد شروع ہوتا ہے۔"

وہ جھنجلائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

"بات یہ ہے جی کہ آغا صاحب ہسپتال کے دورے پر آئے ہیں۔ تمام ڈاکٹر صاحبان اور اسٹاف ان کے ساتھ ہے۔ وہ معائنہ کر رہے ہیں یہاں کے انتظامات کا۔"

"اوفوہ۔" وہ سخت بیزاری سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسی اثناء میں پورا وفد ادھر آتا دکھائی دیا۔

"لو جی۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں اور آغا صاحب بھی۔"

اٹینڈنٹ مستعدی سے کھڑا ہو کر مودبانہ نظروں سے اس طرف دیکھنے لگا۔

باہر کے دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے آغا کے قدم اسے دیکھ کر خود بخود ست پڑ گئے تھے۔ ڈاکٹرز انہماک سے اس کے مشورے اور تجاویز سن رہے تھے۔

"خیریت ہے؟" آغا کو تشویش لاحق ہوئی۔

"کوئی خیریت سے ہاسپٹل کب آتا ہے۔"

وہ جھلاہٹ چھپا کر سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔ تبھی آغا اس کی گود میں نیم خوابیدہ گبلو سے بچے کی طرف دیکھنے لگا جسے وہ اس کے گھر میں دو چار بار دیکھ چکا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب' آپ کو فراغت ہو تو بچے کو دیکھ لیں۔ اسے رات سے بخار ہے۔"

وہ قدرے جتانے والے انداز میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

آغا ہارون نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

دھانی کپڑوں میں اکھڑے اکھڑے انداز اور بگڑے ہوئے تیور لیے وہ پیشانی پر بل ڈالے بیزار سی کھڑی تھی۔ جانے کیا بات تھی اس کے بے مروت اور روکھے پھیکے رویوں کے باوجود اس کی طرف دل کھنچتا تھا۔ کوئی بات تھی جو اس عام سی آدم بیزار لڑکی کو خاص بنا گئی تھی۔

گو آغا ایسے رویوں کا عادی نہیں تھا۔ وہ مدمقابل کی اونچی آواز برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کا انا پرست اور حاکمانہ مزاج کسی دوسرے کی من مانی اور بد مزاجی ہرگز گوارا نہیں کر پاتا تھا مگر اس کھردری اور جارحانہ مزاج والی لڑکی کے سامنے وہ خود کو بے بس محسوس کرتا تھا۔

ڈاکٹرز' آغا سے رخصت چاہتے ہوئے اپنے روم کی طرف بڑھ گیا۔ ساتھ ہی شہ لالہ کو بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"ایکسکیوزمی۔"

وہ اس کی سائڈ سے ہو کر جھپاک سے ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئی۔

اچھی طرح چیک اپ کروانے کے بعد دوائیوں کی پرچی لے کر وہ ہاسپٹل کے میڈیکل اسٹور میں گھس گئی۔ دوائیوں کے لفافے اور ارسل کو سنبھالتی ہوئی جب ہاسپٹل کے احاطے سے باہر آئی تو بھونچکا رہ گئی۔

گیٹ کے پاس بجیرو سے ٹیک لگائے آغا ہارون محویت سے سگریٹ پی رہا تھا۔ غالباً اسی کا منتظر تھا۔

"آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

وہ دوستانہ انداز میں اس کے قریب آ کر بولا۔ اس کی اس درجہ بے تکلفی شہ لالہ کو بہت کھلی۔

"شکریہ' میں چلی جاؤں گی۔"

اس نے بدلحاظی سے کہہ کر قدم بڑھائے وہ تیزی سے سامنے آ گیا۔

"تم اس قدر خود سر اور بدتمیز کیوں ہو؟" وہ اسے گھورنے لگا۔

اس کے کڑے تیور دیکھ کر وہ ایک لمحے کو خائف سی ہو گئی۔

"چلو' بیٹھو۔" وہ جلال میں آ کر حکمیہ بولا۔

"میں پہلے بھی عرض کر چکی ہوں آغا صاحب! کہ میں آپ کی رعایا نہیں ہوں' میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چبا چبا کر بولی۔

بمشکل تمام ضبط کر رہا تھا۔

"تو پھر تم بھی ایک بات کان کھول کر سن لو۔"

وہ اس کے ہٹیلے انداز پر غضب ناک چہرہ لیے اس

کے مقابل آکر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"ایک دن میں تمہیں اپنی مرضی پر چلا کر دکھاؤں گا۔" اس کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں۔

"ہونہہ وہ دن مر کر بھی نہیں آئے گا۔"

شہ لالہ سرخ چہرہ لیے مٹھیاں بھینچ کر اشتعال کے عالم میں گویا ہوئی اور گاڑی کا دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر جیسے گھر میں اک بھونچال سا آ گیا۔

آغا ہارون نے اپنا پروپوزل شہ لالہ کے لیے بھیجا تھا۔

اس نے تو زمین آسمان ایک کر ڈالا۔ کسی صورت بھی آمادہ ہونے کو تیار نہ تھی۔

شجی بھیا کی دلی خواہش تھی' اپیا تقریباً "نیم رضا مند" تھیں اور ڈیڈی بھی اس پروپوزل پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ رہ گئیں بے جی تو وہ بے چاری نہ تین میں تھیں نہ تیرہ میں۔ ساری زندگی دوسروں کے فیصلوں پر صاد کیا تھا۔ ان کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔

"مجھے کسی قیمت پر یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔"

وہ پیر پٹخ رہی تھی۔ اپیا جز بز سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔

"بھئی آخر کوئی معقول وجہ بھی تو ہو انکار کی۔"

وہ اس کے انکار کو اس کی نادانی پر محمول کر رہی تھیں۔

"اس طرح کے نواب ٹائپ لوگ بڑے عیاش اور مغرور ہوا کرتے ہیں۔ صرف اپنی "میں" کو اہمیت دینے والے۔ اور میرا ایسے لوگوں کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔" اس نے صاف کہہ دیا۔

"آغا ہارون ایسے نہیں ہیں۔ بس ذرا کم گو ہیں اور لیے دیے رہتے ہیں۔ تمہیں بہت خوش رکھیں گے۔ اتنی چاہ سے رشتہ مانگا ہے۔ کتنے ہی گھرانے امیدوار تھے اپنی بیٹیوں کے لیے مگر آغا نے شادی کے لیے پیش رفت نہیں کی۔ تم نے ان کا کفر توڑا ہے خدا خدا کر کے۔"

"اسی بات سے تو مجھے سازش کی بو آتی ہے۔" شہ لالہ نے زور دے کر کہا۔

"آخر ایسی کیا بات دیکھ لی ہے انہوں نے مجھ میں۔ کالونی میں کتنی ہی حسین و ذہین اور سلیقہ مند لڑکیاں موجود ہیں۔ میں تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اتنی عام سی لڑکی ہوں۔ کوئی ہیرے موتی نہیں جڑے۔

بات ساری یہ ہے کہ آغا صاحب انتقامی کارروائی کے طور پر یہ قدم اٹھا رہے ہیں۔ وہ عادی ہیں رعایا کو اپنے سامنے سر جھکائے دیکھنے کے۔ میں نے ان کی حاکمیت نہیں مانی تو انہوں نے یہ طریقہ سوچ لیا میری تذلیل و تحقیر کرنے کا۔"

وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم تھی۔ لہجے میں بلا کا طنز اور زہریلا پن تھا۔

"تم غلط سوچ رہی ہو' وہ تو بہت پہلے جب تم سے ملے تھے تب سے متاثر تھے۔"

"اور یہی تو سوال ہے اپیا! کہ کیوں متاثر ہوئے۔ مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

اپیا جھلا سی گئیں۔

"بھئی انہیں نظر آ گئی ہو گی کوئی ایسی بات۔ بعض اوقات کسی کو پسند کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی۔ بس یونہی کوئی شخص من کو بھا جاتا ہے۔"

"جس طرح کسی کو پسند کرنے کا کوئی ریزن نہیں ہوتا اسی طرح بعض اوقات یونہی کوئی شخص بلاوجہ ہمیں برا لگنے لگتا ہے۔ کوئی واضح سبب نہ ہونے کے باوجود ہم اس کو پسندیدگی کا مقام دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ میرے معاملے میں آپ یہی سمجھ لیجیے۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "مجھے وہ صاحب پسند نہیں ہیں' بھئی مجھے تو سیدھے سادے عام سے اپنے جیسے صاف گو لوگ اچھے لگتے ہیں۔" وہ کندھے اچکا کر مزید گویا ہوئی۔

"یا خدا۔" اپیا نے سر تھام لیا۔

"تم تو بیچ ٹیڑھی کھیر ہو' خبر بھی ہے تمہارے بھیا اور ڈیڈی اس رشتے کے کتنے حامی ہیں۔" اپیا بگڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"بھلا بتائیے تو' اپنے آباؤ اجداد کے خاندانی نام اور دولت کے علاوہ موصوف کے پاس اور کون سی خوبی ہے۔" وہ استہزائیہ بولی۔ "ہاں ایک اور پوائنٹ موصوف کے حق میں جاتا ہے کہ شکل و صورت کے اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ مزید کوئی چاند تارہ ان کی شخصیت پر ٹکا دکھائی نہیں دیتا۔ معاف کیجیے گا اپیا! اس درجہ مغرور اور خود پرست شخص سے اپنی قسمت پھوڑنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ بھیا اور ڈیڈی سے کہہ دیجیے گا۔" وہ اٹل لہجے میں بولی۔

شجی بھیا اس کے انکار پر بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آغا کنسٹرکشن کمپنی میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ اس حساب سے آغا ہارون ان کا باس بھی تھا۔ پھر کالونی میں آغا کی اپنی ایک مستحکم اور انفرادی حیثیت تھی جسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا اور ان کے حساب سے آغا کے رشتے میں کوئی ایسا عیب بھی نہیں تھا۔ دیکھا جاتا تو شہ لالہ کے لیے بہترین پروپوزل تھا۔

"خدا جانے انہوں نے کتنی شادیاں کر رکھی ہوں گی شجی بھیا! ایک تو وہ ہے جو ہم سب کے علم میں ہے۔ لندن میں پانچ برس ان کا قیام رہا ہے۔ وہاں دو تین تو ضرور ہی کر رکھی ہوں گی۔ جب دولت گھر کی لونڈی ہو اور اختیار بھی ہو تو کون کافر پارسائی کا دامن تھامے رہے گا۔"

"بھئی مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہاں جاؤں' کیا کروں' دو ٹوک انکار مجھ سے کسی طور ممکن نہیں ہے' ڈیڈی بھی اپنا پہلو بچا گئے ہیں۔ انہوں نے فیصلے کی صلیب میرے کاندھوں پر رکھ دی ہے۔" شجی بھیا سخت ٹینشن میں تھے۔

"دیکھو تم ایک بار پھر سوچ لو۔" وہ التجائیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

"ہزار بار بھی سوچوں تو یہی نتیجہ نکلے گا شجی بھیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "یقین کیجیے میرا دل نہیں مانتا' اس پروپوزل کے علاوہ آپ جہاں چاہیں' جس شخص کے ساتھ چاہیں رشتہ جوڑ دیں۔ میں ایک لفظ نہیں کہوں گی مگر یہاں نہیں۔"

وہ اس درجہ لجاجت سے گویا ہوئی کہ شجی بھیا کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

انہوں نے گول مول سے نرم انداز میں بالآخر شہ لالہ کا موقف آغا تک پہنچا دیا۔ آغا سن کر کتنی ہی دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا۔

شجی بھیا دھڑکتے دل سے آغا کے تاثرات جانچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گیا۔ ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں براہ راست شہ لالہ سے بات کر لوں؟" بالآخر وہ سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"مجھے بالکل بھی اعتراض نہیں' آپ شوق سے بات کر لیں۔" وہ جلدی سے بولے۔

"اگر وہ قائل ہو جائے تو ہم ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر آپ کو ہاں کر دیں گے۔"

گھر آ کر انہوں نے شہ لالہ کو بلا کر آغا کی آمد کی وجہ بتائی۔

"کیا مصیبت ہے۔ کمبل ہی ہو گئے ہیں موصوف۔"

وہ اندر ہی اندر بری طرح جھلا رہی تھی۔ تاہم شجی بھیا کے سامنے مہر بہ لب رہی۔ مارے باندھے سر ہلا دیا۔

"قائل تو ان کے فرشتے بھی نہیں کر سکتے مجھے۔" اس نے سلگ کر سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس شام آغا کو چائے پر مدعو کیا گیا تھا۔ ڈیڈی ان دنوں اپنے آفیشل ٹور پر کراچی گئے ہوئے تھے۔ اپیا شجی بھیا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں میزبان کے طور پر آغا کے سامنے موجود تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ اس کے کمرے میں آ گئیں۔

"جاؤ تم اب' تمہارے بھیا بلا رہے ہیں۔"

"اور دیکھو کوئی بدتمیزی مت کرنا' خیال رہے وہ بیمار سا کی طاقت ور سماجی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارے بھیا کے باس بھی ہیں۔"

"معلوم ہے مجھے۔" وہ برے برے منہ بناتی اٹھ بیٹھی۔

"کپڑے تو بدل لو' برسوں کے پہنے ہوئے ہیں۔" اسے سر جھاڑ منہ پہاڑ جاتا دیکھ کر اپیا نے ٹوکا۔

"چلے گا سب۔" وہ بے پروائی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

چونکہ وہ ذہنی طور پر تیار تھی اس لیے آغا کے روبرو قطعی خائف نہ ہوئی۔ بہادری سے ڈٹ کر بیٹھ گئی۔

شجی بھیا کسی حیلے بہانے سے درمیان سے کھسکنا چاہ رہے تھے۔ اسی لمحے شہ لالہ نے پہل کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر نڈر انداز میں پوچھا۔

"آغا صاحب! ایک بات ایمانداری سے بتایئے گا' آپ نے تو کل کتنی شادیاں کی ہیں؟"

اس کے انوکھے سوال پر شجی بھیا ہکا بکا رہ گئے۔ اس کے بدلحاظ تیور الگ انھیں گڑبڑائے دے رہے تھے۔

انہوں نے ڈھل کر آغا کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔ موٹی موٹی چمکدار آنکھوں میں غضب کی سرخیاں ہلکورے لینے لگی تھیں۔ تاہم جب وہ بولا تو لہجہ حد درجہ پُرسکون تھا۔

"ایک اٹھارہ برس کی عمر میں بابا جان نے خاندان کی لڑکی زینب سے کی تھی پھر اس کی وفات کے بعد انگلینڈ میں قیام کے دوران انگریز لڑکی جوزیفائن سے شادی کی تھی مگر یہ تعلق چل نہیں سکا۔ شادی کے چھ ماہ بعد باہمی رضامندی سے طلاق ہو گئی۔"

یہ انکشاف شہ لالہ کے لیے تو تحیر کا باعث تھا ہی خود شجی بھیا بھی دھک سے رہ گئے۔ ان کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ آغا دو شادیاں کر چکا ہے۔

"تو گویا اب مجھ سے شادی رچانے کا ارادہ ہے۔"

اس کی حد درجہ بدلحاظی پر آغا بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ شجی بھیا بھی برہمی سے شہ لالہ کو دیکھ رہے تھے۔ اس سے تو بہتر تھا وہ سامنے ہی نہ آتی۔ خوامخواہ بات بڑھا کر آغا کے غصے کو آواز دے رہی تھی۔

"ہاں۔"

آغا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اٹل انداز میں کہا۔ وہ اس کے جارحانہ تیوروں کی تاب نہ لاتے ہوئے نگاہ چرا گئی۔

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں سر جھکا کر آپ کے "حرم" میں چلی آؤں گی۔"

اس نے بدلحاظی کی انتہا کر دی۔

اب کے آغا کا ضبط پارہ پارہ ہو گیا۔ وہ سرخ چہرہ لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"دس از ٹو مچ۔"

وہ آگ بگولہ ہو کر بیرونی دروازے کی طرف لپکا۔

شجی بھیا "آغا... آغا" کرتے رہ گئے تھے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟ انہیں ناراض کر دیا۔" شجی بھیا کے لہجے میں ہراس غالب آ گیا تھا۔

"جاؤ' انہیں روکو نادان لڑکی' اس درجہ اپروچ فل بندے کو للکارنا سراسر بے وقوفی ہے۔ ہم کل کو کسی مصیبت میں بھی گھر سکتے ہیں۔ جاؤ' انہیں روکو۔"

شجی بھیا کے سراسیمہ تیور شہ لالہ کو کنفیوز کر گئے۔ وہ اپنی ضد بھول کر باہر کی طرف لپکی۔

"بات سنیے۔"

وہ گیٹ سے نکلنے کو تھا جب شہ لالہ تقریباً "بھاگتی" ہوئی اس کے سامنے آ گئی۔

آغا کو لامحالہ رکنا پڑا۔ اس نے غصے سے سرخ ہوتی آنکھوں سے شہ لالہ کی جانب دیکھا۔

"اندر چلیے پلیز۔"

"میرے راستے سے ہٹ جایئے محترمہ۔ اتنی تواضع کافی ہے۔" وہ نہایت تلخی سے گویا ہوا۔

"اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے تو مجھے اس

پر افسوس ہے۔" وہ اسے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بعجلت بولی۔

اس کے اس درجہ شیریں انداز لمحے بھر میں آغا کو موم بنا گئے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو کچھ دیر پہلے اپنے تحقیر آمیز استہزائیہ انداز سے اس کو آتش فشاں بنا گئی تھی۔

"یوں آزمائش بن کر میرے سامنے نہ کھڑی ہوا کرو۔ میں ضبط کھونے لگتا ہوں۔"

نرمی سے اس کا گداز بازو تھام کر ایک طرف کرتے ہوئے وہ خوابیدہ سے لہجے میں گویا ہوا۔ اس کی نظروں کی تپش اور لمس کی حدت شہ لالہ کے رخساروں پر خون چھلکا گئی۔ وہ فطری حجاب کے حصار میں آ گئی۔ پلکیں جھک گئی تھیں اور ساری طراری لمحے بھر میں ہوا ہو گئی تھی۔

پھر وہ سر جھٹک کر تیزی سے اس کی گرفت سے نکل کر ایک طرف ہو گئی۔ آغا گم صم سا بے خود کھڑا اس کو نگاہ کے ذریعے دل میں اتار رہا تھا۔

"میں پھر آؤں گا میری زندگی۔" وہ اس کے سامنے ہولے سے جھک کر مخمور لہجے میں بولا۔ "تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کے لیے۔"

شہ لالہ بری طرح چونک کر اس کو گھورنے لگی۔ حیا کا طلسم اور لمس کی میٹھی میٹھی دہکتی ہوئی مدہوشی پل بھر میں رفوچکر ہو گئی تھی۔

"آپ کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔" وہ بھنا ہی تو گئی تھی۔

"یہ تو وقت بتائے گا۔"

آغا کا انداز بہت چیلنجنگ تھا۔ وہ بل کھا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ڈیڈی بھلے چنگے کراچی گئے تھے۔ واپسی پر روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو گئے اور پھر زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے بالآخر چل بسے۔

گھر میں جیسے کہرام سا مچ گیا تھا۔ کتنی ہی مدت تک اس حادثے پر دل کو صبر نہیں آیا مگر وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ اب شجی بھیا اور بے جی اس کی شادی کی زیادہ فکر رہنے لگی تھی۔

ان ہی دنوں ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آغا کنسٹرکشن کمپنی کی نئی برانچ لاہور میں کھل گئی تھی اس کا انتظام سنبھالنے کے لیے شجی بھیا اس برانچ کا ہیڈ بنا کر لاہور ٹرانسفر ہونے کے آرڈر آ گئے۔ ظاہر ہے اپیا اور ارسل بھی شجی بھیا کے ہمراہ لاہور جا رہے تھے۔ کیونکہ یہ ٹرانسفر مستقل بنیادوں پر کیا جا رہا تھا۔ ایسے میں شہ لالہ کی رہائش کا مسئلہ تھا۔ لاہور جانے پر وہ آمادہ نہیں تھی اور یہاں کالونی میں اسے اکیلے چھوڑنا شجی بھیا کے لیے ممکن نہیں تھا۔ بے شک بے جی اس کے ہمراہ موجود تھیں مگر وہ خود بھی بیمار رہنے لگی تھیں اس کی دیکھ بھال کیا کرتیں۔

ایسے میں اپیا نے دبے لفظوں میں بڑے آغا کے پروپوزل کا ذکر چھیڑ دیا۔ شجی بھیا بھی یہی چاہ رہے تھے۔

"کمال ہے اپیا! کیا میں اس درجہ بار ہو گئی ہوں آپ پر کہ ایک عیاش طبع مغرور رئیس کے پلے باندھ رہی ہیں۔ اس کے حرم کی زینت بنانے کے لیے۔"

وہ چیخ پڑی تھی۔ آنکھوں میں پانی اترنے لگا تھا۔ اپیا تڑپ گئیں۔ اٹھ کر اس کو گلے سے لگا کر پیار کرنے لگیں۔

"ہم تمہارا برا ہرگز نہیں چاہ رہے میری جان! تمہارے مزاج اور عادت کو سامنے رکھ کر آغا کے پروپوزل پر غور کیا ہے۔ بے شک تمہارا اعتراض بجا ہے کہ وہ پہلے سے دو بار شادی کر چکا ہے مگر جان۔ وہ باتیں اب قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔ ایک مر گئی دوسری چھوڑ گئی۔ قصہ ختم۔ وہ تمہیں اپنے دل کی رضا سے گھر میں بسائے گا تو ظاہر ہے ہر طرح کے نخرے بھی اٹھائے گا۔ تم جو چاہو گی ناز سے منوا لو گی۔ ایسے سنجیدہ مزاج اور روڈ سے بندے جب محبت کرنے پر آتے ہیں تو انتہا کر دیتے ہیں۔ وہ تمہیں ہر طرح سے خوش رکھے

گا۔ اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے اس کی سابقہ شادیوں کی قباحت کو صرف نظر کیا ہے۔ تم بھی سب واہمے دل سے جھٹک دو۔"

ایپا اسے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔

"تو ایپا! وہ بہت فریبی اور منتقم ہے۔ محض آپ کو دکھانے کو پیار محبت جتلا رہا ہے۔ دیکھ لیجیے گا باندی بنا کر رکھے گا۔ وہ محض مجھے فتح کرنا چاہ رہا ہے اسے یہ بات چین نہیں لینے دے رہی کہ اس قدر معمولی اور عام سی شکل و صورت والی لڑکی اس کی شاندار شخصیت و حیثیت کو نظر انداز کر رہی ہے۔ پلیز آپ سمجھیے تو۔" وہ التجا کر رہی تھی۔

"تم بھی کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔" اب کے ایپا بولیں تو ان کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ "ہم اس وقت آغا کی مخالفت مول لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اگر ڈیڈی زندہ ہوتے تو اور بات تھی مگر موجودہ صورت حال میں آغا کے خلاف اسٹینڈ لینا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ شجی ایک طرح سے ان کے ملازم ہیں۔ ان کی ترقی کے پیچھے آغا کا ہاتھ ہے۔ پھر کالونی میں آغا ایک بااختیار شخصیت ہیں۔ آغا نے ہاتھ کھینچ لیا تو ہمارا اس کالونی میں قیام خوشگوار نہ رہے گا۔"

"تو اس کا مطلب ہے آغا مجھے خرید رہا ہے۔ اپنا اختیار جتا کر، بے بس کر کے شکار کر رہا ہے؟" وہ چیخ چیخ گئی۔

یہ انکشاف حد درجہ جان لیوا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

"خود غرض، جاہ پسند... ہونہہ، دیکھوں گی مسٹر تم مجھے کس طرح حاصل کرتے ہو۔ اگر قدرت نے تمہیں مجھ پر اختیار سونپ دیا تو بھی میرے دل تک رسائی نہیں پا سکو گے۔" وہ اندر سے بھڑک رہی تھی۔

"اب بتاؤ تمہارا کیا فیصلہ ہے، بس آخری بات بتاؤ تاکہ اس روز روز کی ٹینشن سے جان چھوٹے۔" ایپا تھکی ہوئی آواز میں پوچھ رہی تھیں۔

"اب انکار کا کیا جواز رہ جاتا ہے ایپا۔" وہ زہر خند ہوئی۔ "کسی کو بے دست و پا کر کے اس سے پوچھی جائے تو وہ کیا کرے گا؟ سوائے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کے۔ اتنے شدید دباؤ کے بعد کہاں گنجائش نکلتی ہے۔ موصوف میری قیمت لگا رہے ہیں۔ کر لیں اپنا انتقام پورا، جائیں کہہ دیں لے آئیں قاضی اور گواہ۔"

وہ آنسو چھپانے کو جھپاک سے باہر نکل گئی تھی۔

ایپا سوچتی ہوئی نظروں سے اسے جاتا دیکھتے ہوئے نڈھال سے انداز میں آغا پیلس کا نمبر ملانے لگی تھیں۔

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی سنبھل جائے گی اور یقیناً ہمارے فیصلے کو سراہے گی۔" وہ خود کو تسلی دے رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا مصیبت ہے بھئی، یہ احتجاجی مظاہرہ کب تک جاری رہے گا؟"

شادی کی تیسری رات بھی جب وہ آغا کے بیڈ روم کا اندرونی دروازہ کھول کر برابر والے کمرے میں سونے کی غرض سے قدم بڑھانے لگی تو وہ زچ ہو کر بول پڑا تھا۔

شہ لالہ نے ایک کٹیلی نگاہ اس پر ڈالی۔

"مجھ پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا تھی۔ سو کر لی۔ اب آپ کو اس سے کیا غرض کہ میں کہاں جا کے سوتی ہوں۔"

اس کی بات پر آغا معنی خیز نظریں اس پر جما کر آہستگی سے مسکراتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

"کہاں قائم کرنے دی ہے اجارہ داری۔ ساری حسرتیں دل کے تہہ خانے میں بند پڑی ہیں۔ تمنائیں بے تاب اور آرزوئیں بے قرار ہیں تمہارے وجود پر تسلط جمانے کو مگر..."

اس نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور ہولے سے اس کے ماتھے پر جھولتی لٹ کو کھینچا۔

وہ جو اس کے سرگوشی کرتے لہجے کے خمار اور معنویت پر پوری جان سے کانپ گئی تھی۔ اس کی جسارت پر آگ بگولہ ہونے لگی۔

"زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سختی سے کہہ کر لٹ چھڑانے لگی۔

"میں اس وقت اس سے بھی زیادہ فری ہونے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ برجستگی سے گویا ہوا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تھام لیا۔ شہ لالہ کو جیسے کرنٹ سا لگا۔ اس کی قربت اسے حواس باختہ کرنے لگی تھی۔ وہ بے دم ہونے لگی۔

"ہاتھ ہٹائیے۔" وہ نظر ملائے بنا اپنے بازو کو اس کی فولادی گرفت سے آزاد کرانے کی سعی کر رہی تھی۔

"اور تم یہ تکلف ہٹا دو ناں۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وارفتگی سے بولا۔

"مجھے بیوقوف بنانا اتنا آسان نہیں ہے آغا صاحب! میں مفت میں ہاتھ آنے والا مال نہیں ہوں۔ آپ کی امارت، آپ کی حیثیت، شان و شوکت اور وجاہت میری نظر میں کسی ایک چیز کی بھی اہمیت نہیں ہے۔ میں ان ہتھکنڈوں سے مرعوب ہونے والی لڑکی نہیں ہوں۔ اس چمک دمک سے کوئی عقل کا اندھا ہی متاثر ہو گا۔ صرف اپنے گھر والوں کے مفاد کی خاطر مجبوری کا سودا کیا ہے۔" اس کا بے لچک اور قطعی انداز اپنے عروج پر تھا۔

آغا کو جھٹکا سا لگا، نظروں کی جوت بجھ گئی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا وہ اس کے جذبوں کو پذیرائی بخش کر اس کے ساتھ شادی پر رضامند ہوئی ہے۔ جذبات سے سرشار دل یکدم ویران ہو گیا۔

"کس نے کہا تھا مجبوری کا سودا کرنے کو... نہ کرتیں۔"

جذبوں پر انا کا نقاب چڑھا کر وہ درشتی سے بولا اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔

"تم نے ہر طور آغا پیلس آنا ہی تھا۔ میں جس کو ایک بار حاصل کرنے کا سوچ لوں اس کو اپنا بنا کر ہی دم لیتا ہوں۔"

"ہاں اور اب تو آپ تین مرتبہ یہ "سعادت" حاصل کر چکے ہیں۔"

اس نے لفظ "تین" پر خاص طور پر زور دیا تھا۔ وہ بھڑک اٹھا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو۔ اپنے اور میرے مقام کا تعین کر کے بولا کرو، ورنہ میں لحاظ نہیں کروں گا۔"

"یہ دھمکی کسی اور کو دیجیے گا۔"

اس کے ہٹ دھرم انداز نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ آغا نے شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ایک جھٹکے سے اس کے بازو موڑتے ہوئے سامنے پڑی کرسی پر دھکا دے دیا۔

تکلیف کی زیادتی سے بے اختیار شہ لالہ کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

"آپ تشدد سے کام لے کر میرا دل فتح نہیں کر سکتے۔ لکھ لیجیے بے شک۔"

اس کی آنکھوں میں اترتے آنسو اور لہجے میں دہکتا الاؤ آغا کے بھڑکتے ہوئے انداز پر پانی ڈالنے لگا۔ وہ جو اسے سبق سکھانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا اس کے بڑھتے ہوئے قدم سست پڑنے لگے۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹ گیا۔

کچھ بھی سہی وہ اس کی محبت تھی، وہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بازو سہلاتی آنسو پیتے ہوئے اندرونی دروازے سے دوسرے کمرے میں گھس گئی اور جلدی سے لاک لگا کر بستر پر آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایپا کچھ عرصے بعد اس سے ملنے اور اس کی خیر خبر لینے کے لیے آغا پیلس آئیں تو اس کے بے پروا انداز دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔ ان کا تو خیال تھا اسے اب عقل آ گئی ہو گی۔

انہوں نے اسے اعتماد میں لے کر بڑے پیار سے نرمی سے سمجھایا۔ مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"آپ لوگوں نے اور انہوں نے جو زبردستی کرنی تھی، کر لی۔ اب کیا چاہتے ہیں آپ لوگ مجھ سے جو ناپسندیدہ ہے وہ ہر حال میں ناپسندیدہ ہے۔ زبردستی کوئی کسی کو اچھا یا برا نہیں لگ سکتا۔ میں کیسے ان کی

پذیرائی کروں۔ میرے دل میں کوئی گنجائش، کوئی مثبت تاثر ہی نہیں ہے۔ دھمکی اور اختیار سے انتقام کے لیے حاصل کی گئی ہوں میں۔"

اپنا اس کے ذہن سے آغا کے لیے بنا ہوا منفی تاثر ختم کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

پھر کتنے ہی دن بیت گئے۔

آغا ہارون نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے معمولات میں کم ہی مداخلت کرتا پھر اس کی اپنی بے تحاشا مصروفیات تھیں۔ کبھی کنسٹرکشن کمپنی کے سلسلے میں لاہور، کراچی کے چکر لگتے۔ کبھی کالج، ہاسپٹل اور اسکول کے مالی و انتظامی امور کے سلسلے میں ذمہ دار افراد ملاقات کے لیے آرہے ہیں۔ کبھی آئندہ کے منصوبوں کی تکمیل کے لیے انجینئرز اور منتظم حضرات سے میٹنگ طے کی جارہی ہے۔

"وہ مخصوص نوابانہ عیاشیاں کس وقت کرتے ہوں گے موصوف۔"

شہ لالہ بے چینی سے منتظر تھی اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے۔

"یہ سنجیدہ قسم کی مصروفیات تو دکھاوا ہے محض۔ اصل "رنگ" تو بعد میں کھلیں گے۔"

اس روز شام کو وہ بے مقصد سے انداز میں لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار اسے بھگو رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات میں اس قدر محو تھی کہ بارش اور آغا دونوں کے آنے کی خبر نہ ہو سکی۔

"بارش میں کیوں بیٹھی ہو۔"

وہ خالی الذہنی کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم سے ہی کہہ رہا ہوں بھئی۔ اتنی ٹھنڈ میں بیمار ہونا ہے کیا۔"

وہ دوبارہ بولا۔ تو اسے صحیح معنوں میں ہوش آیا۔ آسمانوں پر پانیوں سے بھرے بادل تیر رہے تھے تو یقیناً کچھ دیر بعد جل تھل ہو جانی تھی۔

"بارش اچھی لگتی ہے کیا؟"

ایک لمحے کو کچھ سوچ کر وہ بھی اس کے مقابل لان چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"پتا نہیں۔" وہ بیزاری سے گویا ہوئی۔

آغا نے ایک لمحے کو اس کے گندمی گالوں پر لگے بارش کے قطروں کو دلچسپ نظروں سے دیکھا پھر ہلکا سا مسکرا دیا۔

"ایسی ہی بے نیازی سی خود میں مگن، عالم سے بے گانہ کیفیت میں، میں نے پہلی بار تمہیں تمہاری سالگرہ کے موقع پر دیکھا تھا۔ خود فراموشی کی وہ شاہانہ اور مغرور ادا مجھے تمہاری طرف متوجہ کر گئی۔ پھر ٹھیک ایک سال بعد دوبارہ تمہیں سفیدے سے ٹیک لگائے گیٹ کے آگے اسی موڈ میں کھڑے دیکھا تھا۔ لڑکیوں میں یہ ادا اچھی لگتی ہے۔ حد درجہ منجمد، محو اور بے نیاز سا شاہانہ انداز مقابل کو بات کرنے سے قبل سو بار سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ غیر مرد کی ساری جرأتیں بہا کے لے جاتا ہے۔ لڑکیوں میں نسوانی غرور اور بے نیازی ہونی چاہیے کہ یہ غیر مردوں کے دست ہوس سے بچنے کے لیے بہترین حفاظتی باڑھ کے کام کرتے ہیں۔ ہاں مگر واضح رہے، غیر مردوں کے لیے "اپنے مرد" کے لیے ہرگز نہیں۔"

وہ قدرے آگے کو جھک کر معنی خیز انداز میں زور دے کر بولا تھا۔

"ہونہہ فراڈی، جال میں کسنے کے لیے دانہ ڈال رہا ہے۔"

وہ بالکل بھی متاثر نہیں ہوئی تھی اس کی نرم خوئی سے۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی تھی۔ ہونٹ چباتے ہوئے گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے وہ گویا اپنی لاتعلقی کا اظہار کرنا چاہ رہی تھی۔

"آؤٹنگ پر چلو گی؟ راستے میں بارش بھی انجوائے کر لینا۔"

ویسے تو وہ کبھی جانے پر آمادہ نہ ہوتی مگر اس وقت بچ بچ اتنی بیزار ہو رہی تھی کہ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد تیار ہو ہی گئی۔

آغا اپنی پجیرو نکالنے لگا تھا۔ ڈرائیور، صاحب کو دیکھ کر لپکا مگر آغا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس

اپنے کوارٹر میں جانے کو کہہ دیا۔

وہ لوگ ابھی کالونی سے نکلے ہی تھے کہ بارش زور و شور سے برسنے لگی۔ اودے اودے سیاہی مائل سبز پہاڑوں پر دھند سی چھا رہی تھی۔

گاڑی کی پُرحرارت آرام دہ فضا میں کیسٹ پلیئر سے گونجنے والی دلکش آواز نے گویا اک سماں سا باندھ دیا۔

چاہی تھی دل نے تجھ سے وفا کم بہت ہی کم
شاید اس لیے ہے گلہ، کم بہت ہی کم

شہ لالہ نے دزدیدہ نظروں سے ڈرائیونگ میں مگن آغا کے بھاری بالوں بھرے سفید ہاتھوں کو اسٹیئرنگ پر حرکت کرتے دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم لب بھینچے ونڈ اسکرین پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔

جلتے سنا چراغ سے دامن ہزار بار
دامن سے کب چراغ جلا، کم بہت ہی کم
صدیوں سے یوں تو ہے یہاں انسان کا وجود
انسان ہم کو کب ہے ملا، کم بہت ہی کم

بہت خوب صورت غزل تھی اور شاید آغا کی پسندیدہ بھی۔

آجائیے کہ آپ سے پہلے نہ آئے موت
اب وقت رہ گیا ہے بہت کم، بہت ہی کم

اس کے بعد کیسٹ کا اگلا گانا شروع ہو گیا تھا۔

اے میرے ہم نشیں، چل کہیں اور چل
اس چمن میں اب اپنا گزارا نہیں
بات ہوتی گلوں تک تو سہہ لیتے ہم
اب تو کانٹوں پہ بھی حق ہمارا نہیں
دل کو بہلائیں کیسے شب ہجر میں
دل بہلنے کا کوئی سہارا نہیں
چاند بھی چھپ گیا، رات بھی ڈھل گئی
آسماں پہ کوئی بھی ستارہ نہیں

شہ لالہ حیران ہو رہی تھی کہ اس درجہ رئیسانہ مزاج والے شخص کا ذوق اتنا نفیس بھی ہو سکتا ہے۔ وہ گیت کے بولوں میں گم تھا اور شاید اس آواز کے ذریعے اسے بھی کچھ جتانا چاہ رہا تھا۔

جانے کس کی لگن، کس کی دھن میں مگن
جا رہے تھے کہیں مڑ کے دیکھا نہیں
ہم نے آواز پر تم کو آواز دی
پھر بھی کہتے ہو ہم نے پکارا نہیں
میرا ذوق نظر آزما لیجیے
گر ہو بجلی گرانا گرا لیجیے
میں بھی گھر سے چلا ہوں یہی سوچ کر
آج نظریں نہیں یا نظارہ نہیں

شہ لالہ نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ عین اسی لمحے آغا نے ونڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ نظروں کا تصادم ہوا تو آغا کی نظروں کی جارحانہ چمک سے ہراساں ہو کر اس نے "فوراً" ہی نگاہ چرالی تھی۔

"جانے کیا ارادے ہیں موصوف کے، اف اللہ اب برستے ہوئے سرد موسم میں تو گاڑی کے علاوہ کوئی جائے پناہ بھی نہیں ہے۔" اس نے جھرجھری سی لی تھی۔

بالآخر گاڑی سڑک کے بائیں طرف ایستادہ ایک سرسبز سے پہاڑ کے دامن میں رک گئی۔

انجن بند کر کے اپنی سیٹ کو آرام دہ حالت میں بیک کرتے وقت آغا قدرے ترچھا ہو کر دونوں بازو سینے پر باندھ کر ٹیک لگاتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہوا۔

یک دم شہ لالہ کا دل دھڑکا۔ وہ اس کی دسترس میں تھی۔ وہ کسی لمحے بھی ہاتھ بڑھا کر اسے گرفت میں لے سکتا تھا اور یہ احساس اسے بری طرح خوف زدہ کیے دے رہا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر دھیرے دھیرے پرے سرکتی ہوئی بالکل دروازے سے جا لگی تھی۔

آغا اس کی گھبراہٹ کو دلچسپی سے جانچ رہا تھا۔

"ایک بات تو بتاؤ لالہ؟"

وہ اپنی پوزیشن تبدیل کیے بغیر اسے نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے بولا۔

"تم مجھ سے اس درجہ بیزار اور خائف سی کیوں رہتی ہو؟ شروع سے ہی کتراتے ہوئے بے گانہ انداز میں پیش آرہی ہو۔ کیا مجھ کوتاہی سرزد ہو گئی ہے مجھ

سے!"

اس کے دوستانہ انداز شہ لالہ کو گھبراہٹ میں مبتلا کیے دے رہے تھے۔ وہ نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بدستور چپ تھی۔

"یہ رویے شادی سے پہلے بہرطور کسی قدر قابل قبول تھے مگر اب اس طرح کی بے گانگی، رکھائی اور جھنجلاہٹ کے مظاہرے بے سبب نہیں ہو سکتے۔ اگر مجھ سے کچھ شکایت ہے تو کھل کر کہو۔ میں ہر طرح کی وضاحت دینے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تمہارا دل مطمئن ہو سکے۔"

آغا کا لہجہ اپنائیت جگا رہا تھا۔ وہ اب بھی کچھ کہنے سے قاصر رہی۔

"اگر تمہیں میرے "شادیاں" کرنے پر اعتراض ہے تو اس سلسلے میں، میں اپنی جگہ پر درست ہوں۔ پہلی شادی ہوئی تو خدا نے بیوی کو اپنے پاس بلا لیا۔ دوسری جگہ کی تو نبھ نہیں سکی۔ صرف میں ہی نہیں موزیفائن کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ ہم دونوں کے مزاج اور ذہن نہیں ملتے۔"

"وہ تو میرے اور آپ کے کون سا ملتے ہیں۔"

وہ چیخ کر بولی۔ آغا ذرا سا مسکرا دیا۔

"تمہاری ذات میں ایک مضبوطی اور قطعیت ہے۔ تم اس درجہ پر اعتماد اور اٹل شخصیت کے طور پر سامنے آئی ہو کہ مقابل خود بخود تمہارے کردار کی پاکیزگی اور پختگی کی قائل ہو جاتا ہے۔ مجھے فیصلہ کن نیچر رکھنے والے، زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے والے لوگ بہت انسپائر کرتے ہیں کہ ایسے لوگ اپنی چیلنجنگ طبیعت سے کام لے کر ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتے ہیں۔ میں خود بھی ایسا ہی ہوں۔ ہاں مگر تم میں کچھ "اضافی" اوصاف ہیں جو تباہ کی راہ میں حائل ہو رہے ہیں۔"

تم ضدی اور کچھ ہٹیلی سی ہو۔ جو بات ایک بار دماغ میں بٹھا لو اس سے آگے نہیں سوچتیں اور یہ چیز بہت نقصان دہ ہوتی ہے۔ بندے کو لچک اور گنجائش ضرور رکھنی چاہیے۔ خصوصاً عورت کو اپنے "شوہر" کے مقابل ہٹ دھرمی، انا پرستی اور بد مزاجی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

اس کی ذو معنی متبسم نظروں کے جواب میں وہ جزبز سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔

"اونہہ، کیسے تاک تاک کر تیر چلا رہے ہیں۔ جانتے ہیں ناں کہ اس وقت میں سب کچھ دیکھنے سننے پر مجبور ہوں۔"

وہ بے نیازی دکھانے کو کھڑکی کی طرف گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ باہر ایک تواتر سے بارش ہو رہی تھی۔

اس لمحے اسے قیمتی مردانہ پرفیوم اور سگریٹ کی ملی جلی خوشبو اپنے بہت قریب محسوس ہوئی۔ بوکھلا کر گردن موڑی تو سٹپٹا کر رہ گئی۔ آغا اس کے قریب جھک کر اس کا ہاتھ تھامنے کو تھا۔ اس نے برق کی سی تیزی سے اپنے آپ سمیٹ کر گویا اس کی دسترس سے بچنے کی بے سود کوشش کی۔

"فکر نہیں کرو۔ تمہیں تمہاری رضا کے بغیر ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

وہ چھبتے ہوئے انداز میں بولا۔

"فی الوقت میں تمہاری موجودگی کو محسوس کرنا چاہ رہا ہوں، کم آن۔"

دوسرے ہی لمحے اس کا لرزتا ہوا سرد و گداز ہاتھ آغا کے مضبوط ہاتھ میں دب چکا تھا۔

"تم نے نیل پالش نہیں لگائی! اتنے خوب صورت اور چمکدار ناخن ہیں۔" وہ بغور اس کے ہاتھ کا جائزہ لے رہا تھا۔

"تمہارے چہرے میں، آنکھوں اور بالوں میں بلکہ پورے سراپے میں ایک خاص قسم کی چمک اور شفاف پن ہے۔ یہی چمک تو مجھے اسیر بنا گئی تھی۔" وہ بے تکلفی سے حکایت دل اسے سنا رہا تھا۔

وہ بے اختیار نروس سی ہونے لگی۔ آغا کی گہری نظروں کو وہ اپنے وجود پر متحرک محسوس کر سکتی تھی۔ اس کے دھیمے لہجے کی گمبھیرتا اسے گڑبڑانے پر مجبور کر رہی تھی۔

آغا نے اس کا ہاتھ اپنی مٹھی میں مقید کیے اس کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی۔ ایک لمحے کو اس کے دل کی بے ایمان ہوتی دھڑکنوں نے اسے اکسایا تھا۔ جی چاہا اسی ہاتھ کو بھرپور جھٹکا دے کر اس کے ٹھنڈے پڑے نازک سے گداز وجود کو خود سے قریب کر لے اور خود میں سمو کر جذبوں کی ساری پیاس بجھا لے۔ مگر وہ خود سے کیے گئے عہد کے ہاتھوں بے بس تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ گستاخی پر آمادہ کرتے اس خواب ناک ماحول کی لپیٹ میں آ کر بہک جاتا، اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر سیدھے ہوتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی کہ خود پر قابو پانے میں اسے خاصی دشواری کا سامنا ہو رہا تھا۔

۞ ۞ ۞

ریسٹ ہاؤس اور کلب کی تعمیر کے سلسلے میں کاغذی کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ آج کل آغا تندہی سے ان کی تعمیر کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ دن رات مصروف رہتا تھا۔

شہ لالہ نے کالج جانے کا معمول جاری رکھا تھا۔ صبح سے دوپہر تک وہاں وقت گزر جاتا مگر اس کے باوجود باقی دن کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ اکتا دینے والی شامیں اور بے چین راتیں۔

ایک تو بے جی بھی کالونی میں نہیں تھیں۔ شعبی بھیا انہیں اپنے ساتھ لاہور ہی لے گئے تھے۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس شام وہ بے چینی سے آغا کا انتظار کر رہی تھی۔

"صاحب کب تک آ جائیں گے؟"

شام گہری ہونے لگی تو وہ کچن میں مصروف ملازم سے پوچھ بیٹھی۔ خود اسے تو آغا کے معمولات کا علم ہی نہیں تھا۔ گھر بار میں بھی کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ گھر کا کام ملازم کرتے تھے اور آغا کی ضروریات کا خیال رکھنے کو اس کا خاص ملازم شریف الدین موجود رہتا تھا۔

"وہ جی شریف کو بہتر پتا ہو گا۔" خانساماں نے انکساری سے جواب دیا۔

شریف کو ڈھونڈتی ہوئی وہ آغا کے بیڈ روم آئی تو وہ وارڈ روب کھولے صاحب کے کپڑے سیٹ کرتا نظر آیا۔

"آج جاپانی تعمیراتی کمپنی کے صدر سے صاحب کی میٹنگ ہے بی بی جی! شام چھ بجے سے آٹھ بجے تک جاری رہے گی۔ پھر صاحب انہیں ڈنر کے لیے شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل میں لے جائیں گے۔ وہیں ان کی رہائش کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔ اندازاً رات دس بجے تک واپس لوٹیں گے صاحب۔"

شریف نے مؤدب ہو کر جواب دیا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ انتظار تو کرنا ہی تھا۔

دس کی بجائے گیارہ بج گئے تھے۔ وہ برآمدے میں سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر بیٹھی سرخ بجری کی گیٹ تک جاتی روش پر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ برآمدے کی سبز مائل روشنی والی ٹیوب لائٹس آن تھیں۔

ٹھنڈ بڑھ رہی تھی مگر شہ لالہ کو کوئی خاص محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں اتنی مگن تھی کہ گیٹ کھلنے اور پورچ میں پجیرو کے رکنے کی آواز پر بھی نہ چونکی حتیٰ کہ تھکا تھکا سا آغا قدم اٹھاتا عین اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسے حسب معمول دنیا سے بے خبر اپنے دھیان میں گم دیکھ کر وہ آہستگی سے مسکرا دیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے تعجب سے پوچھ رہا تھا۔

شہ لالہ نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

"آپ کا انتظار۔" اس نے مختصراً بتایا۔

"کیا۔" آغا اچھل پڑا۔ ایک لمحے کو اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آیا۔

"دوبارہ کہو کیا کہہ رہی تھیں؟" وہ پینٹ کے پائنچے اوپر سرکا کر اس کے قریب سیڑھیوں پر بیٹھ کر بے تابی سے پوچھنے لگا۔

"بھئی آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک بات کرنی تھی۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"اوہ تو گویا بات کرنے کے لیے انتظار ہو رہا تھا۔"

وہ ڈھیلا پڑ گیا، چہرہ بجھ سا گیا تھا۔

"بہر حال ارشاد فرمائیں۔ مگر سنو کیا ہی اچھا ہو جو تم میرے بیڈ روم میں آ کے بات کر لو۔ میں سخت تھکا ہوا ہوں اور چینج کر کے گرم بستر میں گھسنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ یہاں ویسے بھی ٹھنڈ لگ رہی ہے۔" وہ کچھ پس و پیش کے بعد راضی ہو گئی۔

"آپ چینج کر لیں، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

کاش اس آمادگی کے ساتھ تم ہمیشہ کے لیے میرے بیڈ روم میں آنے کی بات کرو۔" وہ اٹھتے اٹھتے شرارت سے اسے دیکھ کر کہہ گیا۔

"دیکھیے، اب لڑائی کا آغاز آپ کی طرف سے ہو رہا ہے۔"

اس کا چہرہ کچھ غصے اور کچھ شرم سے سرخ پڑ گیا تھا۔ آغا ہنس کر اس کے بالوں کی لٹ کھینچتا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

وہ کم از کم آدھے گھنٹے بعد اس کے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو وہ آرام سے لحاف میں دبکا ہوا نیم دراز سا اس کا منتظر تھا۔

وہ جھجکتے ہوئے کر اندر آ گئی۔ دروازہ پوری طرح کھلا رہنے دیا تھا۔

"بھئی دروازہ تو بند کرتی آؤ، سارے ہیٹنگ سسٹم کا ستیاناس ہو جائے گا۔"

"میں بس دو منٹ میں جا رہی ہوں۔"

وہ اپنا "سیف وے" بند کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

"دراصل بات یہ ہے..."

وہ یونہی کھڑے کھڑے کہہ کر نکلنے کا ارادہ باندھے ہوئے تھی کہ آغا نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"آرام سے بیٹھ کر بات کرو، ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ بھئی شریف کافی بنوا کر لا رہا ہے، تم بیٹھو ادھر صوفے پر۔ بیڈ پر بیٹھنا تو غالباً گوارا نہیں کرو گی۔"

اس نے بیڈ کے مقابل میرون مخملیں صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے آخر میں جیسے چھیڑنے والے انداز میں ٹکڑا لگایا تھا۔

وہ خود کو سخت لاچار محسوس کرتے ہوئے ہونٹ چپاتی مارے باندھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ بات شروع کرتی، شریف کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر چلا آیا۔

اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی نفیس ٹرے تھی جس میں کافی کے دو مگ رکھے تھے۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کو تھما کر وہ مؤدبانہ واپس مڑا اور جاتے جاتے دروازہ اچھی طرح بند کر گیا۔

آغا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

شہر لالہ اپنی جگہ پہلو بدل کے رہ گئی۔ اب وہ دوبارہ اٹھ کر تو دروازہ کھولنے کی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔

"ایسا ہے کہ میں چاہ رہی ہوں ایک دو ہفتوں کے لیے لاہور شجی بھیا کے پاس چلی جاؤں۔ اپا اور بے جی سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔"

اس نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے جلدی سے مدعا بیان کیا۔

"ایسا کرتے ہیں ان لوگوں کو یہاں بلوا لیتے ہیں۔" آغا کی تجویز پر وہ برہمی سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس سے کیا فائدہ۔ میں لاہور جانا چاہ رہی ہوں۔"

"گویا ماحول میں تبدیلی کی خواہاں ہو؟" آغا کے پوچھنے پر اس نے سر ہلا دیا۔

"تو پھر ایسا ہے کہ ہم ہنی مون ٹرپ کے لیے نکل جاتے ہیں۔ پہلے شمالی علاقہ جات چلیں گے پھر وہاں سے بیرون ملک سوئٹزر لینڈ، سنگاپور اور ہانگ کانگ... کیا خیال ہے؟"

آغا کی آنکھوں سے بلا کی شرارت ٹپک رہی تھی۔

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ مجھے اسی زندان میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہوتا دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔"

وہ زہریلے انداز میں بولی۔

"اس درجہ بدگمانی بھی اچھی نہیں ہوا کرتی میری جان۔"

وہ اس کی توقع کے برعکس بڑے سکون سے بولا تھا۔

"بات یہ ہے کہ تمہاری غیر موجودگی میں آغا پیلس

کی ہر شے اداس اور بے رنگ سی ہو جاتی ہے۔ اس کے مکینوں سمیت، پھر ایک دو ہفتے تو بہت زیادہ ہوتے ہیں۔"

"کوئی زیادہ نہیں ہیں۔" وہ زور دے کر بولی۔

"چلیے میں دس دن بعد لوٹ آؤں گی؟" وہ مفاہمت پر آمادہ نظر آئی۔

"دس دن...!" آغا نے دہرایا۔ "یار دس صدیاں لگیں گی ہمیں۔" اس نے جھرجھری لے کر کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی، بس آپ مجھے ایک دو دن میں بھجوا دیں لاہور۔"

وہ ہٹیلے پن سے بولی۔ آغا دلچسپی سے اس کے ضدی اور خود سر تاثر جانچ رہا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ میں شریف سے کہہ کر انتظامات کروا دوں گا۔"

وہ تو اسے یونہی تنگ کر رہا تھا ورنہ اسے کیا اعتراض تھا اس کی جانے پر۔

"مگر یہ کیا، کام نکلوا کر شکریہ و نذرانہ دیے بغیر جا رہی ہو۔"

اسے اٹھنے کے لیے پر تولتے دیکھ کر وہ چھیڑے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

"کیا مطلب۔" وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی اور اچنبھے سے بولی۔

"ہائے، مطلب مطلب نہ پوچھا کرو زندگی۔"

وہ شریر انداز میں کہتے ہوئے بستر سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ چاکلیٹی کلر کے مخملیں پٹی والے سلیپنگ گاؤن میں اس کا دراز قد مزید نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کی پرشوق نگاہ اور آنچ دیتا لہجہ شہر لالہ کے اوسان خطا کرنے لگا۔

وہ اٹھ کر جانا چاہتی تھی مگر آغا اس کے عین مقابل اس طرح کھڑا تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑی ہوتی تو سیدھی اس کے سینے سے ٹکرا جاتی۔

"سنو۔" وہ ہولے سے جھک کر محبت بھرے نرم گرم انداز میں مخاطب ہوا۔

اس کے بھاری پن میں کچھ تھا کہ شہر لالہ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

"دیکھیے، آپ وعدہ خلافی مت کریں۔"

وہ بمشکل تمام اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں سر جھکائے بول رہی تھی۔

"مجھے اپنا عہد یاد ہے۔" وہ پنجوں کے بل اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ اب وہ کسی طور اٹھ کر نہیں جا سکتی تھی۔

"مگر یار، تم بھی تو اب سزا میں ترمیم کرو کچھ، یہ انتظار جان لیوا بنتا جا رہا ہے، چھ ماہ سے کنویں کے قریب رہ کر پیاسا ہوں۔" اس کا دھیما جذباتی لہجہ بے قابو سا ہو رہا تھا۔

شہر لالہ کی ٹانگیں کانپنے لگیں، ہونٹ خشک ہونے لگے۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا، وہ اتنا قریب تھا کہ لمحے کے ہزارویں حصے میں بہ سرعت اسے چھو سکتا تھا۔ اس کی آنچ دیتی قربت شہر لالہ کے رخسار جلائے دے رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ مروڑتی ہوئی بری طرح سٹپٹائی ہوئی تھی۔

"مجھے جانے دیں پلیز۔"

جانے کس طرح جرأت سے کام لے کر وہ کہہ پائی تھی۔

جواب میں وہ چپ چاپ بھرپور نظروں سے اس کے خدوخال کا جائزہ لیتا رہا۔

"لالہ پلیز، اب بس کرو۔"

بہت دیر بعد اس کی سرگوشی نے سکوت توڑا۔

"مان جاؤ ناں۔"

وہ اپنے بے قابو ہوتے جذبات پر بند باندھے ہنوز حد پار کرنے سے خود کو باز رکھے ہوئے تھا۔ اور وہ بے درد لحظہ لحظہ اس کا ضبط آزما رہی تھی۔

"آپ ضد و زبردستی سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔"

اس کے سحر انگیز لہجے کے خمار سے وہ اندر سے کمزور پڑنے لگی تو حفاظتی دیوار اٹھائے ہوئے ایک دم جھنجلا کر پھٹ پڑی تھی۔

آغا کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلتے

ہوئے تیزی سے اس کے سامنے سے اٹھا اور زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے باتھ روم میں مقید ہو گیا۔

شہر لالہ اپنے اڑے اڑے حواس مجتمع کرتی ہوئی بجلی کی سی تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

لمحوں کا طلسم زائل ہوا تو وہ اپنی کمزوری پر خود کو لعنت ملامت کرنے لگی۔ ابھی تک دل کی دھڑکنیں معمول پر نہیں آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"بہت شاندار گھر ہے آپ کا۔"

وہ تعریفی نظروں سے پورا گھر گھوم پھر کر جائزہ لے رہی تھی۔

"کمپنی کی طرف سے ملا ہے۔" اپیا خوشی خوشی بتا رہی تھیں۔

"خیر کتنا ہی اچھا سہی، تمہارے آغا پیلس سے اس کا کیا مقابلہ۔ وہ تو سچ مچ کا شاہی محل ہے۔"

"چھوڑیں۔" وہ اپیا کے ستائشی انداز پر منہ بنا کر بولی۔

"مجھے تو قید خانہ لگتا ہے، ویران اداس اور بے جان سا۔"

شعبی بھیا نے اسے دو دنوں میں سارا لاہور گھما دیا تھا۔ اس بار وہ بڑی گہری نگاہ سے اپیا اور شعبی بھیا کی ازدواجی زندگی کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور بہت ساری باتوں کے انکشافات اب ہو رہے تھے۔

وہ چونکہ شروع سے شہر کے ہاسٹلز میں رہتی تھی اس لیے گھریلو معاملات سے خاصی حد تک بے بہرہ تھی۔ پہلی بار اس نے دیکھنے والی نگاہ سے معاملات دیکھے اور بھونچکا سی رہ گئی۔

شعبی بھیا گھر میں موجود ہوتے تو بھی ہر وقت اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں الجھائے رکھتے تھے۔ حالانکہ اب ارسل کے ساتھ ساتھ گاڑی کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی تھی۔ پھر گھر بھر کی ذمہ داری بھی اپیا کے کندھوں پر تھی۔

"میرے موزے کہاں رکھے ہیں، رومال کیوں نہیں دھویا۔ افوہ کپڑوں پہ استری کرنا بھی یاد نہیں رہا بیگم صاحبہ کو۔"

وہ واضح طور پر جھلائے ہوئے کھردرے انداز میں پکارتے تھے۔ اپیا افتاں و خیزاں بیڈ روم کی طرف لپکتیں۔

"بس ابھی کر دیتی ہوں سب کچھ۔" گھڑیا کی نبض بدل رہی تھی۔

اسی اثناء میں ارسل ناشتے کے لیے ماں کو پکارنے لگتا۔ اپیا کا ایک پاؤں ادھر ہوتا اور ایک ادھر۔ کچن کا کام، گھر بھر کی صفائی، کپڑوں کی دھلائی سے لے کر شوہر اور بچوں کی ضرورتوں کا خیال، ہر کام کے لیے اپیا جوابدہ تھیں اور اس کے باوجود شعبی بھیا ناخوش رہتے تھے۔

"کس قدر پھوہڑ ہو تم، شوہر کی ضروریات کا خیال نہیں۔" وہ برملا کہتے۔

کبھی سالن میں نمک یا مرچ تیز ہو جاتا تو بگڑنے لگتے تھے۔

"اتنے برس گزر گئے تمہیں ڈھنگ کا کھانا پکانا نہیں آیا۔ حد ہے۔"

اور اپیا چپ چاپ سنتی رہتیں۔ کبھی منمناتے ہوئے صفائیاں دینے لگتیں۔

شہر لالہ سخت استعجاب کے عالم میں اپیا کو دیکھتی رہ جاتی۔

"کمال ہے اپیا شعبی بھیا آپ کی اتنی انسلٹ کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ حکم کی باندی بنی پھرکی کی طرح ان کے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہیں۔" وہ ناراضی سے کہہ رہی تھی۔

جواب میں اپیا ہولے سے مسکرائیں۔

"بھئی انسلٹ کی اس میں کیا بات ہے۔ اگر شوہر آپ کی کوتاہی پر ڈانٹ دے یا غصہ کرے تو بیوی کو خاموشی سے پی جانا چاہیے۔ وہ صحیح بات پر ہی تو ٹوکتے ہیں۔ حق رکھتے ہیں اس بات کا۔ ایسی معمولی معمولی باتوں کو توہین و تحقیر سمجھ کر بیوی محاذ کھول بیٹھے تو گزارا ہو گیا سمجھو، سارے گھر کا سکون اور ترتیب تہس

نہس ہو جائے ایسے تو۔"

اور وہ ہونق سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

اس نے تو کبھی جھوٹے منہ آغا سے نہیں پوچھا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں، اس کے جوتے کپڑے، کھانے پینے اور آرام و سکون کا خیال رکھنے کی ذمہ داری شریف کے سر پر تھی۔ رہے گھر کے کام تو اس کی بلا جانے ملازمین کس لیے تھے۔ پھر وہ آغا پیلس کو اپنا گھر کب سمجھتی تھی جو مالکانہ ذمہ داریاں نبھاتی۔ اور آغا نے کبھی ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس روز وہ اپیا کے ساتھ بازار گئی تو اپیا کو ان کی پرانی کلاس فیلو مل گئی۔ پرجوش طریقے سے سلام دعا کے بعد ایک دوسرے کے ہاں آنے کی دعوت دی جانے لگی۔

"پرسوں ہماری ویڈنگ اینورسری ہے۔ کچھ پرانی دوستوں کو بھی مدعو کیا ہے جو لاہور میں آباد ہیں۔ تمہیں ضرور آنا ہے۔ اسی بہانے ماضی کی دوستوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

اپیا کی دوست صباحت نے بصد اصرار کہا تھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" اپیا مسرت سے بولیں۔

"پرانے دوستوں سے ملاقات کا تصور بذات خود بڑا خوش کن ہوتا ہے۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ ضرور آؤں گی۔"

مگر جب شعبی بھیا سے بات کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

"میں نے سائٹ پر جانا ہے پرسوں اور تمہیں بھی جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر کبھی چلی جانا، ایسی بھی کیا قیامت آ رہی ہے۔"

اور اپیا دل مار کر رہ گئیں۔ شہر لالہ کو علم ہوا تو ایک بار پھر متعجب کھڑی رہ گئی۔ اس نے تو کالونی میں کہیں آنے جانے کے لیے رسماً بھی آغا کو مطلع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

"بھئی آپ کا اتنا دل چاہ رہا ہے۔ ایسے مواقع بار بار تو نہیں آتے شعبی بھیا سے ضد کریں جانے کے لیے۔ وہ مصروف ہیں تو کم از کم آپ کو تو اجازت دے سکتے ہیں۔"

"چھوڑو۔" اپیا بے دلی سے بولیں۔

"اصرار کر کے ان کا موڈ کیوں خراب کروں۔ صباحت سے فون پر معذرت کر لوں گی۔"

اپیا کا سارا جوش و خروش ماند پڑ گیا تھا۔ شہر لالہ کو دلی تکلیف ہوئی۔

"پھر بھی آپ ان کے نام کی مالا جپتی ہیں؟" وہ جھلا کر ان پر برس پڑی۔

"کتنے بے حس ہیں شعبی بھیا، آپ کی خوشی اور جذبات کا کچھ احساس نہیں۔" وہ طیش سے بولی۔

"میں ان کی مرضی اور خوشی کی پابند ہوں۔ وہ نہیں چاہتے تو میں ان کی رضا کے خلاف قدم کیسے اٹھا سکتی ہوں۔" اپیا اداسی سے بولیں۔

"اونہہ۔" شہر لالہ نے کوفت سے سر جھٹکا۔

"آپ خوامخواہ ان کی خود پسندی کو شہہ دے رہی ہیں، دھڑلے سے کہہ دیں کہ مجھے ہر صورت جانا ہے۔"

"اس طرح گھر نہیں چلا کرتے ثریا!"

اپیا نے اس کے گال چھو کر نرمی سے کہا۔

"عورت کو اپنا گھر بسانے، بنانے اور چلانے کے لیے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اپنی بے جا انا، خود پرستی، ضد اور شوق کو لگام دینا پڑتی ہے۔"

"اور جواب میں اسے کیا حاصل ہوتا ہے؟" وہ زہر خند ہوئی۔

"سر چھپانے کو ایک چار دیواری، مضبوط چھت، ایک سائباں مل جاتا ہے شوہر کے روپ میں۔" اب وہ مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ "یہی گھر عورت کی آخری پناہ گاہ ہوتا ہے۔" وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ "عورت کو مصلحت سے کام لے کر جھک کر عاجزی سے، بے غرضی سے معاملہ سلجھا کر اپنی جڑیں مرد کے گھر اور دل میں مضبوط کرنا پڑتی ہیں، ورنہ تو دو دنوں میں سارے گھر کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے۔ اگر آپ حاکم ہو تو اس

کے ساتھ گزارا کرنے کے لیے دوسرے شخص کو لا محالہ محکوم بننا پڑتا ہے ورنہ گھر نہیں بنتے۔"

"کیا شجی بھیا کو آپ سے محبت نہیں ہے؟ میرا تو خیال تھا وہ آپ کو بہت چاہت سے بیاہ کر لائے ہیں۔" وہ الجھ کر پوچھ رہی تھی۔

"اس میں کیا شک ہے' وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں' دلی رضامندی سے اپنایا ہے۔" وہ فخریہ بولیں۔

"مگر یہ کیسی محبت ہے' اتنی اجارہ داری' تسلط' حاکمیت اور رعب۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"یہ بھی محبت کے انداز ہوا کرتے ہیں۔ اب تمہارا کیا خیال ہے مجنوں یا رانجھے کی طرح دن رات میرے نام کی تسبیح پڑھتے رہیں یا رومانوی ڈائیلاگ جھاڑا کریں۔ مرد کی محبت اسی طرح کی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کی طلب کرنا بے وقوفی ہے۔ مرد' عورت کے آرام و آسائش کا خیال رکھے اور اس کا ہو کر رہے۔ بس یہی بہت کافی ہے۔ رہا رعب' غصہ اور حاکمیت تو مشرقی مرد میں یہ اوصاف تو شروع سے موجود رہے ہیں۔ ان سے کیا الجھنا۔ اب ہر کوئی آغا ہارون کی طرح دیوانہ اور عاشق زار نہیں ہوا کرتا کہ بیوی کی ہر بدتمیزی اور بدلحاظی برداشت کر جائے۔

تم عقل سے سوچو تو اندازہ ہوگا کہ تم دنیا کی خوش قسمت ترین عورتوں میں سے ایک ہو۔ تمہاری اک نگاہ کرم کے لیے وہ اپنی پلکیں بچھائے منتظر رہتا ہے۔ تمہاری من مانیاں برداشت کرتا ہے۔ تمہاری تمام تر بے اعتنائی کے باوجود تمہیں تمہارے حال پر چھوڑے ہوئے ہے۔ اپنا کوئی حق تمہاری رضا کے بغیر استعمال نہیں کر رہا۔

بے وقوف لڑکی! اب بھی ہوش کے ناخن لے لو۔ شہزادیوں کی طرح گھر میں بسا رکھا ہے آغا نے تمہیں' اس کی قدر کرو اور فضول کی ضد چھوڑ کر اپنا آپ اس کے نام کر دو ورنہ سے گزر گیا تو بری طرح پچھتاؤ گی۔"

واقعی اپیا صحیح کہہ رہی تھیں اور کتنا اس کا کردار اور نفس آزمانا مقصود تھا' اتنی مدت بیت گئی تھی۔ اگر اس کے کردار میں کوئی جھول ہوتا تو اب تک سامنے آجاتا۔

اس کے برعکس اس کی نرم خوئی' مصلحت پسندی اور اپنے کام سے لگن نے اس کی شخصیت کے مثبت پہلو ہی اجاگر کیے تھے۔

وہ کس درجہ اس پر مہربان تھا۔ اپنی طبیعت کے برعکس محض اس کی خوشنودی کے لیے خود پر جبر کرتا تھا۔

وہ بدتمیزی کرتی تو در گزر کر جاتا۔

رکھائی کا مظاہرہ کرتی تو صرف نظر کر دیتا۔

اکتاہٹ دکھاتی تو اس کی خوشی کے لیے' دل بہلانے کے لیے گھمانے لے جاتا۔

کبھی اپنے ذاتی کام کے لیے اس کو آوازنہ دی تھی۔ گھریلو امور کے سلسلے میں کبھی اس کی بازپرس نہیں کی حالانکہ وہ گھر کی مالکن تھی ذمہ دار تھی۔ مگر اس نے از خود اس پر کسی ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالا تھا۔

اپیا کی ازدواجی زندگی کے معاملات سے موازنہ کیا جاتا تو وہ ایک لحاظ سے آغا پیلس میں ٹھاٹھ سے زندگی گزار رہی تھی۔ ہر قسم کی الجھن' پریشانی' ذمہ داری اور جواب طلبی سے آزاد رہ کر۔

وہ پوری رات اپنا احتساب کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

دس دن مکمل ہو چکے تھے اس کے قیام کو۔ آغا تقریباً" روز ہی فون پر اس کی خیریت دریافت کرتا تھا۔ رات کو ہی فون پر اس نے بتایا تھا۔

"میں کل صبح کی فلائٹ سے آرہا ہوں تمہیں لینے۔ شام کی فلائٹ سے ہم واپس آجائیں گے۔"

اور صبح پوری تیاریوں سمیت وہ اپیا کے روبرو کھڑی تھی۔

شجی بھیا' آغا کو ایئرپورٹ ریسیو کرنے کی غرض سے جا چکے تھے اور کسی لمحے میں بس آنے والے تھے۔

"اپیا! مجھے اب اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔" وہ

سر جھکا کے بولی۔

دراصل میرے ذہن میں شروع سے یہ تاثر رہا تھا کہ امیر کبیر، جاگیردار وڈیرے، نواب اور رئیس قسم کے لوگ ہر قسم کے اخلاقیات سے عاری ہوتے ہیں۔ عیاش طبع، بے حس، خود غرض اور مغرور۔ عام لوگوں کو اپنی رعایا خیال کرتے ہیں اور ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا اور میں انجانے میں "آغا کو بھی اسی ٹائپ کا بندہ سمجھ بیٹھی تھی۔ اس لیے شروع سے اس سے متنفر اور گریزاں رہی تھی۔

کچھ اس کے رویے کی سختی، رعب اور حاکمیت پسندی کو میں اس کی شخصیت کا حصہ سمجھ کر مزید اس سے کترانے لگی تھی۔ ایسے میں اس کے پروپوزل نے میرے تن بدن میں آگ لگادی۔ میرا خیال تھا وہ محض مجھے نیچا دکھانے کے لیے اتنی عام سی شکل و صورت والی لڑکی کی طرف بڑھا ہے۔ بس اس طرح کی غلط فہمیوں نے مجھے اس تک پہنچنے سے روکے رکھا۔

بہرحال گزرتے وقت نے میرے خدشات دھو ڈالے ہیں اور اب مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر امیر آدمی بدکردار اور نفس پرست ہو۔ آخر وہ لوگ بھی تو انسان ہوتے ہیں کوئی درندہ صفت خون آشام بھیڑیے تو نہیں ہوتے جو ہم ان کے بارے میں بدگمان رہتے ہیں۔

اچھے برے لوگ تو ہر طبقے میں موجود ہوتے ہیں پھر بدنیتی اور عیاشی کا الزام محض روسا اور امراء پر ہی کیوں عاید کیا جائے۔ ان میں بھی تو نیک طبیعت کے انسان دوست اور مخیر لوگ موجود ہوتے ہیں۔"

"صد شکر کہ تمہیں عقل آگئی ورنہ میں تو مایوس ہو چلی تھی تمہارے طور طریقوں سے۔"

اپیا نے مسکراتے ہوئے اسے گلے لگالیا۔ پھر گڑیا کے رونے کی آواز سن کر اندر لپکیں۔ اسی لمحے کھٹکے کی آواز پر شہر لالہ نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اور جیسے اس کی روح فنا ہوگئی۔

آغا کے چہرے پر شعلوں کی لپک تھی اور آنکھوں سے غضب کی چنگاریاں سی برس رہی تھیں۔

"بہت خوب۔" بالآخر وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔

"تو یہ تھی تمہارے گریز کی وجہ۔ بھلا کب تم نے مجھے کسی برے فعل میں یا ایسی ویسی خواتین سے چہلیں کرتے دیکھا تھا؟ یا کسی غریب سے وحشیانہ سلوک کرتے دکھائی دیا تھا تمہیں۔ کیا میرے روم فریج میں "بوتلوں" کی قطاریں سجی ہوئی دیکھی تھیں۔ یا میری خوابگاہ سے کسی حسینہ کو برآمد ہوتے دیکھا تھا؟ بولو جواب دو نا۔"

آغا کی رگ رگ میں انگارے دوڑ رہے تھے اور اس کی شعلہ فشاں نظریں شہر لالہ کو بھسم کردینے کے درپے تھیں۔ ضبط سے وہ مٹھیاں بھینچے نچلا ہونٹ دانتوں سے چل رہا تھا۔

وہ اس درجہ غضب ناک اور مائل بہ وحشت تو کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ شہر لالہ کا چہرہ سفید پڑگیا اور آنکھیں خوف سے پھیلنے لگی تھیں۔

"مجھ جیسے بدکردار، بدچلن اور اخلاقیات سے عاری رئیس کے پاس تم جیسی پارسا اور مقدس و محترم ہستی کا کیا کام، اوکے تم بخوشی یہاں رہو، ہمیشہ کے لیے۔ اب مجھے تمہارے پلٹ کر آنے کا قطعی انتظار نہیں رہا میری طرف سے تم آزاد ہو۔"

یہ کہہ کر وہ آندھی طوفان کی طرح الٹے قدموں واپس چلا گیا تھا۔ اور شہر لالہ کا تو وہی حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"کیا ہوگیا۔ آغا اتنے غصے میں کیوں تھے؟"

شجی بھیا وحشت زدہ سے بھاگے چلے آئے تھے۔

"میں نے روک کر پوچھنا چاہا تو انہوں نے درشتی سے مجھے ایک طرف ہٹا دیا اور گیٹ سے باہر نکل گئے۔"

"وہ۔۔۔ وہ ناراض ہوگئے ہیں مجھ سے، شجی بھیا!"

وہ بلک بلک کر رو دی۔ اپیا بھی حواس باختہ سی دوڑی آئی تھیں۔ صورت حال واضح ہوئی تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔

"آپ مجھے واپس بھجوا دیجیے شجی بھیا! میں ابھی اور اسی وقت کالونی واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"اس وقت کس طرح بھجوا دوں تمہیں، شام کی فلائٹ سے چلی جانا۔"

شجی بھیا پریشانی کے عالم میں کہہ رہے تھے۔

"تمہارا اس وقت جانا مناسب نہیں، آغا بہت غضبناک موڈ میں واپس لوٹے ہیں۔ فوری طور پر تمہیں سامنے دیکھا تو خدانخواستہ معاملہ سنگین ہو سکتا ہے۔ ٹھہر کر جانا ہی بہتر ہوگا۔ تب تک ان کا غصہ بھی کچھ سرد پڑ جائے گا۔" اپیا نے اسے صلاح دی تھی۔

سوئے اتفاق شام کی فلائٹ نہ مل سکی اور اس نے وہ پوری رات کانٹوں پر بسر کی تھی۔ دوسری صبح منہ اندھیرے وہ تیار ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ شجی بھیا نے صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے اسے بھجوا دیا۔ شہر آکر ٹیکسی کے ذریعے وہ کالونی پہنچی۔

"شریف! تمہارے صاحب کہاں ہیں اس وقت؟"

اس نے آغا پیلس پہنچتے ہی سب سے پہلے شریف الدین کو طلب کیا تھا۔

"وہ جی، میں خود بھی لاعلم ہوں۔" شریف خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔

"کل شام سے گھر نہیں آئے، ساری رات میں انتظار کرتا رہا۔ آج صبح چھ بجے کے قریب فون کر کے گھر کے حالات پوچھے تھے۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ کہاں ہیں بس اتنا کہا کہ رات کو دیر سے لوٹوں گا۔"

"اوہ۔"

تفصیل سن کر وہ بے قرار سی ہوگئی تھی۔ بہرحال اتنی تسلی تو ہوگئی تھی کہ رات کو لوٹ آئیں گے۔

نہا دھو کر تازہ دم ہو کر پہلی بار پورے آغا پیلس میں اوپر نیچے پھر کر اچھی طرح جائزہ لیا۔ صفائی ستھرائی اور دیگر انتظامی امور دیکھے۔ ملازمین کو کچھ ترامیم کے لیے ہدایات دیں۔

شام کو کچن میں گھس گئی۔ دو تین ڈشز شریف سے پوچھ کر صاحب کی پسند کی بنائیں، پھر نئے سرے سے خود کو سجایا سنوارا۔

سرخ جھلملاتے نفیس سے سوٹ میں یاقوت کا جڑاؤ سیٹ اور ہلکا میک اپ کیے اس کی چھب ہی نرالی ہوگئی تھی۔ باغ سے بیلے کی کلیاں توڑ کر بالوں میں گجرے بھی سجا لیے تھے۔

اب وہ جی جان سے روٹھے سیاں کے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔ شریف کو اس نے اپنے کوارٹر میں جانے کا کہہ دیا تھا۔

"میں خود ہی کھانے کے لیے پوچھ لوں گی صاحب کو۔"

اس نے خود بھی ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر لان میں چہل قدمی کرتی خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرتی رہی۔ آغا کی سابقہ شوخیاں یاد آرہی تھیں۔ وہ ایک لمحہ جب اسے اپنی کمزوری کا احساس ہوا تھا۔ جب جسم و جاں میں پر حدت سنسنی سی پھیلتی چلی گئی تھی۔

"سنو۔" اس نے کس طرح جان کھینچ لینے والے انداز میں پکارا تھا کہ وہ پگھل پگھل گئی تھی۔

"مان جاؤ نا۔" وہ خوابیدہ ارمان جگاتا دھیما مخمور سرگوشیانہ انداز۔

وہ سوچ سوچ کر نئے سرے سے محجوب ہوئی جا رہی تھی۔

"شاید یہی محبت ہے، بے اختیار کردینے والی، بے بس کر ڈالنے والی اپنے جادو اثر حصار میں لے کر کل عالم سے بے گانہ کرنے والی۔"

واقعی محبت اچانک ہی منکشف ہوتی ہے اور قلب و روح کو اپنے طلسم میں جکڑ لیتی ہے۔ خبر ہی نہیں ہونے پاتی یہ لمحہ کب آن کر بیت جاتا ہے۔ محبت چھپ کے دل پہ وار کرتی ہے۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے خدا خدا کرکے اس کی جیپ آغا پیلس داخل ہوئی تھی۔

فوری طور پر سامنے نہیں جانا چاہیے۔ کیا خبر غضب سے بھر کر کچھ کر بیٹھیں۔ وہ یہی سوچ کر کچن میں چلی گئی اور کھانا گرم کرنے لگی۔ پھر ٹرالی میں سجا کر

دانستہ وہیں موجود رہی تاکہ وہ جب تک چینج کر کے فریش ہو جائے۔

"کھانا لے آؤ شریف!"

کچن میں انٹرکام سے اس کی تھکی ہوئی سپاٹ آواز ابھری تھی۔ آغا کے خیال کے مطابق شریف کو ہی کچن میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اچھل پڑی، ایک بجنے کو تھا۔

دھڑکتے دل سے ٹرالی دھکیلتی اس کے کمرے کے آگے رکی تو قدم من من بھر کے ہونے لگے۔

"کیسے اندر جاؤں؟"

بالآخر وہ ہمت کر کے دروازہ دھکیلتی اندر چلی آئی۔ وہ حسب توقع بستر پر نیم دراز تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں اور آنکھوں میں غصے کی سرخی چھلکنے لگی۔

"تم۔۔۔ تم سے کس نے کہا تھا یہاں آنے کو، بلکہ اس گھر میں داخل ہونے کو۔"

وہ ایک دم برس پڑا تھا۔

"اپنے گھر آنے کی کون اجازت مانگتا ہے؟"

اگرچہ وہ خود کو بہادر ظاہر کر رہی تھی مگر دل اندر سے سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ آغا اس وقت اتنا بے رحم نظر آ رہا تھا کہ فی الواقع شہہ لالہ کے چھکے چھوٹنے لگے تھے۔

"اپنے گھر؟" اس نے استہزائیہ کہا۔

"یہ ڈرامے بازی کسی اور کے ساتھ کرنا۔ فوراً سے پیشتر میرے کمرے سے نکل جاؤ اور صبح آغا پیلس سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانا۔ اب یہاں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔"

اس کا کٹھور لہجہ بلا کا سفاک اور سرد تھا۔ شہہ لالہ کی ریڑھ کی ہڈی تک خوف سرایت کرنے لگا۔

"تو کیا ہوا۔ آپ کے دل میں تو جگہ ہے نا میرے لیے، وہیں بسیرا کرنے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔"

تخت یا تختہ کے مصداق وہ جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بعجلت کہہ گئی۔ آغا نے کڑے تیور لیے اسے گھور کر دیکھا۔

شہہ لالہ کے چہرے پر، سراپے کی آرائش و زیبائش اور رویے میں سراپا آمادگی اور سپردگی ثبت تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے بے وقوف بنانے کی۔" وہ برہمی سے رخ موڑ کر گویا ہوا۔ "تم جا سکتی ہو اب؟"

"آپ کھانا تو کھا لیجیے۔ میں نے بھی آپ کے انتظار میں ابھی تک نہیں کھایا۔" وہ اس کا دھیان بٹانے کو جلدی سے بولی۔

آغا نے جواب نہیں دیا۔ نیم دراز ہو کر آنکھوں پر بازو رکھ کر گویا لاتعلقی کا اظہار کر رہا تھا۔

وہ حوصلے جمع کرتی ہوئی بیڈ کے قریب آ گئی۔ اس کے سرہانے آ کر آہستگی سے جھک کر جھجکتے ہوئے اس کے سیاہ بالوں والے توانا سپید بازو پر ہاتھ رکھ کر ہٹانے کی کوشش کی۔

آغا کو جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ۔" وہ خفگی سے بازو چھڑانے لگا۔ لہجے کی تندی اور بے رحمی میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ شہہ لالہ کو کچھ تسلی ہوئی۔

اس نے دوبارہ اس کا آہنی ہاتھ تھام کر جیسے اٹھانے کی سعی کی۔

"پلیز بس کریں نا، اب اٹھ جائیں۔ کھانا کھا لیں۔"

"تمہیں ہی نہ کھا جاؤں میں۔"

آغا نے وحشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اسے کھینچا۔ وہ چونکہ اس کے لیے تیار نہیں تھی، لہٰذا اپنی جھونک میں اس پر آ رہی۔ دوسرے لمحے وہ سنبھل کر بیٹھی تو آغا نے اس کی دونوں کلائیاں موڑتے ہوئے مجرموں کی طرح پشت کی جانب لے جانے کی کوشش کی۔ وہ درد سے چیخ اٹھی۔

"اف اللہ چھوڑیں نا۔" تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے مگر وہ ہنوز خود کو مضبوط اور ہشاش ظاہر کر رہی تھی۔

"میں تو بدکردار اور عیاش رئیس ہوں۔ کیوں آئی ہو ایسے شخص کے بیڈروم میں۔"

آغا کی عزتِ نفس پر زبردست طریقے سے چوٹ پڑی تھی۔ اسے اپنی تذلیل بھلائے نہیں بھول رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا ساری دنیا تہ و بالا کر دے۔

"بولو نا۔" اب اس نے شہہ لالہ کے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے تھے۔

"اف۔۔۔ ہارون! آپ تو جان نکالنے کے درپے ہو گئے ہیں۔"

رخساروں پر بہتے آنسوؤں کے قطرے پوروں سے صاف کرتی ہوئی وہ زبردستی ہنس کر بولی۔

ہارون آغا کے بھڑکتے ہوئے سینے پر جیسے نرم نرم پھوار پڑنے لگی۔ زندگی میں پہلی بار شہہ لالہ نے اس درجہ اپنائیت و یگانگت کے ساتھ اس کا نام لے کر پکارا تھا۔ ہارون تو اسے اس کے ملنے والے بھی نہیں کہتے تھے۔ آغا صاحب ہی زبان زدِ عام ہو گیا تھا۔

آغا کی اس کے بالوں پر گرفت نرم پڑنے لگی۔ خود بخود اس کا شعلہ ساماں موڈ سرد پڑنے لگا تھا۔

یہ کس نے پکارا ہے عدم اپنی چاہ سے
احساسِ برتری سے خدا ہو گیا ہوں میں

آغا کو بے ساختہ شعر یاد آ گیا تھا۔

"میری طرف سے اپنا دل صاف کر لیں ہارون!"

ہمیشہ وہ ہی آگے بڑھا تھا۔ اس نے پیش قدمی کی تھی۔ اب شہہ لالہ کی باری تھی اور پھر محبوب کے در پر جھکنے میں کیا حجاب، وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کا مجازی خدا تھا۔ اس کا ہار سنگھار، اس کا چھچھماتا سراپا سب کچھ اسی کا تو تھا۔

آغا کو اچانک ہی احساس ہوا تھا اس قربت کا، وہ خود چل کر اس تک آئی تھی۔ پوری سپردگی سے خود کو پیش کر رہی تھی۔ اس لمحے کا تو اس نے اک عمر انتظار کیا تھا۔

"کھانا کھا لیں نا۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

وہ اس کی نگاہ سے امنڈتی جنوں خیزی سے گھبرا کر جلدی سے بول پڑی۔

"تمہیں نہ کھاؤں پہلے۔ کتنا ستاتا ہے لڑکی تم نے۔"

اس سے پہلے کہ وہ اس کے گستاخ ارادوں کا پتا دیتے شوخ تیوروں سے بوکھلا کر پرے سرکتی آغا نے ایک جھٹکے سے گھسیٹ کر قریب کر لیا اور اس پر جھک کر اس کی ناک کھینچتے ہوئے شریر سے انداز میں گویا ہوا۔

اس کا مارے شرم کے برا حال ہو رہا تھا۔

"سارے بدلے لوں گا تم سے گن گن کر۔" آغا کے انگ انگ سے سرور چھلک رہا تھا۔

شازیہ چوہدری

وہ ایف الیون کی مارکیٹ میں "انٹیریر ڈیکور" کی عظیم الشان بلڈنگ میں داخل ہوئی تو سامنے ہی شہروز سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

"تمہارے لیے ایک کام آیا ہے' ایک کینیڈین فیملی پاکستان میں سیٹل ہوئی ہے' انہیں اپنے گھر کی ڈیکوریشن پلس فرنشنگ کرانی ہے۔ میڈم نے تمہیں اسائن کیا ہے یہ پروجیکٹ۔"

"اوہ۔" ارسلہ نے دلچسپی سے سرہلایا تھا۔

"کیا وہ کینیڈا کی شہریت رکھتے ہیں؟ کیونکہ پھر تو انہیں ڈیکوریشن اور فرنیچر وغیرہ کا اسٹائل بھی وہیں کا سا چاہیے ہوگا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"نہیں' ماں باپ پاکستانی ہیں۔ بچوں میں سے بھی بڑی بیٹی کی پیدائش یہیں کی ہے۔ باقی دونوں بچے کینیڈا میں پیدا ہوئے۔ بڑی بیٹی ایک سال کی تھی جب وہ لوگ کینیڈا شفٹ ہوئے تھے۔ اب چودہ برس بعد وطن واپس آئے ہیں پچھلے ماہ۔ پہلے رشتہ داروں کے ہاں رہے' اب پچھلے ہفتے اپنا گھر خریدا ہے۔ فیملی گھر میں شفٹ ہوچکی ہے ضروری اشیاء کے ساتھ مگر گھر ظاہر ہے ابھی خالی ہے۔ پہلے انہوں نے کسی اور انٹریر ڈیکوریٹر کو ہائر کیا تھا۔ اس نے پردے لگوادیے تھے پھر کسی وجہ سے اسے یہ پراجیکٹ چھوڑنا پڑا تو انہوں نے ہماری کمپنی سے رجوع کیا۔"

شہروز نے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

"میڈم آصفہ اس پراجیکٹ کو خصوصی اہمیت دے رہی ہیں۔ رچ فیملی ہے۔ ظاہر ہے ہینڈسم اماؤنٹ پے کرے گی۔ انہیں ہر چیز نہایت معیاری اور اعلاو

ناولٹ

ویدہ زیب درکار ہے۔"

"پھر تو اور بھی اچھا ہے' ظاہر ہے' ہم سب پیسے کے لیے ہی کام کر رہے ہیں۔ میری گاڑی پچھلے کئی دنوں سے کافی تنگ کر رہی ہے۔ اگر اس پروجیکٹ سے ٹھیک ٹھاک کمیشن ملا تو میں اس کا نیا انجن بنواؤں گی۔ سات ہزار کا خرچہ ہے اس کے روز روز کے چوک پہ بند ہو جانے کا خطرہ تو نہیں رہے گا۔" ارسلہ نے اپنی ٹیبل پر بیٹھ کر پیڈ اور پین اٹھا لیا تھا۔

"کل شام چار بجے اس ایڈریس پر پہنچ جانا۔" شہروز نے ایک کارڈ اس کے حوالے کیا۔

"ہوں' مسٹر سفیان شاہ۔ ڈائریکٹر جنرل سفیان بلڈرز۔" وہ کارڈ پڑھ رہی تھی۔

"مسٹر سفیان چار بجے آفس سے آجاتے ہیں۔ اگر لیٹ بھی ہوئے تو وہاں ان کی بوڑھی ملازمہ بچوں کے ہمراہ موجود ہوگی۔"

"کیا مطلب؟" ارسلہ نے بھنویں اچکائیں۔ "کیا مجھے مسٹر سفیان سے تفصیلات طے کرنا ہوں گی اور ان کی مسز؟"

"وہ پاکستان میں ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد واپس کینیڈا چلی گئی ہیں۔"

"مگر کیوں؟" ارسلہ کا متجسس انداز نہایت فطری تھا۔

"کسی کام سے گئی ہیں۔" شہروز نے مختصراً بتایا۔

"کس قسم کا کام؟" وہ الجھن رفع کرنے کے لیے پوچھ بیٹھی۔ شہروز نے اس سوال پر گھور کر اسے دیکھا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ ارے بھئی ہوگا کوئی کام' مجھے ان کے پرسنل افیئرز سے کیا لینا دینا۔ تم تو بال کی کھال اتارنے بیٹھ جاتی ہو بعض اوقات۔"

"اچھا بھئی! ناراض کیوں ہوتے ہو۔ چلی جاؤں گی کل۔ بھئی! یہ بتاؤ' کوئی ٹیبل ورک ہے یا پھر میں آف کر لوں۔" وہ براؤن لیدر بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پہ منتقل کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے' جاؤ تم' اگر کچھ کام ہوا بھی تو میں دیکھ لوں گا۔" شہروز حسن میں یہی تو خوبی تھی کہ وہ ہمیشہ اس کا بوجھ اور پریشانیاں سمیٹنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

وہ آفس سے باہر آگئی۔ سامنے پارکنگ ایریے میں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ مارکیٹ حال ہی میں بنی تھی اور نسبتاً ویران اور خاموش سی تھی۔

"اُفوہ۔ اب یہاں سے چکلالہ اسکیم تھری تک کا طویل ترین راستہ' کباڑہ ہو جائے گا ڈرائیو کرتے کرتے۔" اس نے گاڑی کا لاک کھولنے کے بعد لاشعوری طور پر اپنے کندھے دبائے تھے۔

جب وہ گھر پہنچی تو پاپا شاہین فاؤنڈیشن سے واپس آچکے تھے۔ اس کے پاپا میجر ضیاء ریٹائرڈ تھے اور حکومت کی طرف سے ملے ہوئے اس خوبصورت اور کشادہ اپارٹمنٹ میں اپنی دو بیٹیوں کے ہمراہ رہتے تھے۔ ان کے اپارٹمنٹ کے عین اوپر والا اپارٹمنٹ ان کے بڑے بھائی کرنل سجاد کی ملکیت تھا۔ اتفاق سے دونوں بھائی آرمی میں رہے تھے۔ اور آگے پیچھے ہی ریٹائر ہوئے تھے۔ کرنل سجاد کی فیملی اچھی خاصی تھی اور ہر وقت ان کا اپارٹمنٹ "بارونق" اور "پُرشور" رہتا تھا۔

دونوں بھائیوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد "شاہین فاؤنڈیشن" جوائن کر لیا تھا۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام۔" میجر ضیاء نے بہت گرمجوش مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔

"بھئی جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ٹیبل پر آجاؤ۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

"اُفوہ' ایک تو آپ بھوک کے بہت کچے ہیں۔ اور بھوک لگ رہی تھی تو ایک گھنٹے سے کھانا سامنے رکھ کے کیوں بیٹھے تھے۔ کھا لیا ہوتا ناں۔"

"اپنے بچوں کے بغیر میں کیسے کھا سکتا تھا۔ نہ تم آئیں نہ روشان کالج سے لوٹی۔" وہ ٹیبل پر آگئے تھے۔

ن لیٹ آئے گی۔ اس کی کلاس فیئر
یکٹس کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے' اس
نکشن ہے۔ فورتھ ایئر کے اعزاز میں
ی ہے اور اپنی روشان فیئرویل پارٹی کی
ے۔" وہ ہنس پڑی۔
گے میں تو وہ یوں بھی ہمیشہ آگے رہتی
ے بھی تبصرہ کیا تھا۔
ن میں تم سے خاصی مختلف ہے۔ لاابالی اور
یعت کی مالک ہے۔"
ے کی اپنی فطرت' اپنا مزاج ہوتا ہے پاپا! اور
ے کہ انسان اپنے رنگ میں ہی اچھا لگتا
یز نیا رویہ اور متوازن زندگی گزارنے کے
ور سیکھیں مگر اپنے فطری انداز میں رہتے

تنقید تو نہیں کر رہا تھا جو اتنی حمایت آئی ہے
ف سے۔" پاپا مسکرا کر اسے دیکھنے لگے۔
ی ہو گئی۔
ی پاپا ہے۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو پاپا۔" وہ
ے ان کے کندھے تھام کر جھک گئی تھی۔
ت خوش نصیب ہیں جنہیں آپ جیسے پاپا

پاپا کی کچھ اور قسمیں بھی ہوتی ہیں؟" میجر
نے مصنوعی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا

میرا مطلب ہے' آپ سب سے اچھے پاپا

کھا جیسے ٹوائے شاپ ہوتی ہے ویسے ہی پاپا
ہوتی ہے جہاں سے۔۔۔" وہ سر ہلانے لگے۔
" ارسلہ نے ٹھنک کر انہیں گھورا تھا۔
ے۔" وہ ہنس کر اٹھ گئے تھے۔
پ کو چائے چاہیے ہوگی۔" وہ چائے کا پانی

چائے لیتا ہوں۔" یہ ان کی برسوں پرانی عادت تھی اور دیکھا دیکھی ارسلہ اور روشان کو بھی یہی عادت پڑ گئی تھی۔

"میں اسٹڈی روم میں جا رہا ہوں۔" وہ چائے کا کپ تھام کر مڑے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ میں لاؤنج میں بیٹھ کر کچھ آفس ورک کروں گی اور روشان کا انتظار کروں گی۔"

"اسد شارجہ سے آگیا ہے۔؟" جاتے جاتے پاپا نے مڑ کر دریافت کیا تھا۔ لہجہ سنجیدہ تھا۔

ارسلہ نے تمام تر توجہ چائے کی جانب مبذول کر لی۔

"غالباً" آچکے ہیں۔ میرا دو دن سے تائی اماں کی طرف جانا نہیں ہوا۔ روشان سے پوچھیے گا وہ تو ہر وقت ہی ادھر گھسی رہتی ہے۔" ارسلہ کا لہجہ نارمل تھا۔

"میرا خیال ہے' میں بھائی جان سے شادی کے لیے بات کر لوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟" انہوں نے تفہیمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال تو یہ ہے کہ فی الحال آپ اس قصے کو رہنے دیں۔ میں اپنی فیلڈ میں قدم جمانے کے بعد شادی کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اور اسد بھائی کا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جب تک وہ لوگ خود بات نہیں کرتے آپ کو ذکر چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔" باپ اور بیٹیوں کے درمیان ہر طرح کی بے تکلفی اور اظہار رائے کی آزادی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت اعتماد اور سکون کے ساتھ ان سے ہر طرح کے موضوع پر بات کر لیتی تھیں۔

"ایز یو وش' لیکن بیٹے! ڈھائی سال کی منگنی بہت کافی نہیں ہو گئی؟؟ میری خواہش ہے کہ اگلے سال تم اپنا گھر بسا لو۔" انہوں نے اپنی سوچ کا اظہار کیا۔

"پاپا! روشان کو بہت دیر نہیں ہو گئی؟ اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔ چار بجنے کو ہیں۔" وہ چائے کا کپ میز پر رکھنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی نظر گھڑی

کی دوڑتی بھاگتی سوئیوں پر تھی۔

"جاؤ اپنی تائی جان کے ہاں جا کر معلوم کرو۔ نیہاں آگئی ہے یا نہیں۔" نیہاں اور روشان ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ اور اسی کی وجہ سے روشان ہر وقت تائی جان کے ہاں پائی جاتی تھی۔ دونوں میں دانت کاٹی دوستی تھی۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر تائی اماں کے اپارٹمنٹ میں پہنچی تب ہی ڈور بیل بجاتے سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس اسد پر نظر پڑی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس کو بہر حال آداب تو نبھانا تھے۔

"وعلیکم السلام۔" اسد جواب دے کر بے نیازی سے ڈور بیل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

دوسرے لمحے کچن کی سائیڈ سے دروازہ کھل گیا۔ وسیع کچن میں مصروف عمل تائی اماں دونوں کو ایک ساتھ آتا دیکھ کر خاصی محظوظ ہوئیں۔

"تائی جان! وہ دو مغرور شہزادیاں ابھی تک کالج سے نہیں لوٹیں۔ کچھ خیر خبر ہے ان کی۔۔۔؟"

"نیہاں کہہ رہی تھی، ریہرسل کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے پی سی او سے فون کر کے بتایا ہے کہ آدھ پون گھنٹے تک آجائیں گی۔"

"کمال ہے، مجھے موبائل پہ نہیں بتا سکتی تھیں۔" وہ جھنجلائی۔ "میں انہیں پک کر لیتی۔۔۔"

"میں پاپا کو بتا کر آئی ہوں۔ اچھا تائی جان! میں مارکیٹ جا رہی ہوں، ہفتہ وار سودا سلف لینے۔ کچھ گروسری وغیرہ تو نہیں منگوانی؟" اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"نہیں بیٹے! البتہ اگر کوئی الیکٹریشن مل گیا تو لے آنا۔ گیسٹ روم کے باتھ روم اور اس سے ملحق اسٹور کی وائرنگ خراب ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ روحی کے کمرے کا چھوٹا فریج بھی کام نہیں کر رہا۔ کب سے خراب پڑا ہے، مگر روزانہ آج کل آج کل کر کے

میں کام رہ جاتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" گھنی مونچھوں تلے اسد کے ہونٹ بری طرح سکڑے۔ پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ "کیا گھر میں کوئی مرد نہیں ہے ان کاموں کے لیے۔ اب یہ مردوں کے بیچ گھس کر کام کروایا کریں گی۔"

وہ برہمی سے ماں کو گھور رہا تھا۔ اس پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔

"ارے بیٹا اور اور کون ہے اور کس کو پروا ہے۔ روحی سدا کا نکما اور کام چور لڑکا ہے۔ کالج کا اسٹوڈنٹ ہے۔ بیس برس کا ہے مگر عقل نام کو نہیں ہے۔ احساس ذمہ داری چھو کر نہیں گزرا۔ اسے اپنے دوستوں اور میوزک کے جنون سے ہی فرصت نہیں ہے۔ رہے تمہارے ڈیڈی تو وہ آفس سے آئیں گے تو انٹرنیٹ پہ بیٹھ جائیں گے یا دوستوں میں نکل جائیں گے۔ لے دے کے یہی بچی رہ جاتی ہے۔"

"تو بیٹ مین کس مرض کی دوا ہے۔" اسد تن… گویا ہوا۔

"بھئی، وہ تو روز گھنٹے دو گھنٹے کو آتا ہے۔ صفائی کر کے اور ایک دو مزید کام کر کے یہ جا وہ جا اور ارسلہ بچی بھی ذمہ دار ہے۔ ہمیشہ سے وہی تو کرتی آئی ہے۔" تائی اماں مگن سے انداز میں ہانڈی میں چمچہ ہلا رہی تھیں۔

"بیٹے! یہ شامی کباب مائیکرو ویو اوون میں رکھ دو۔ اسد کو چائے کے ساتھ دینے ہیں۔"

"جی اچھا۔" اس نے پلیٹ لے کے اوون میں رکھ دی جو پہلے سے آن تھا۔ اسد ہونٹ چباتا ہوا خاموشی سے اندر چلا گیا تھا۔

"میں چلتی ہوں تائی اماں۔"

"ارے بیٹا بیٹھو تو، چائے بن رہی ہے۔ پی کے جانا۔" تائی جان اس سے خصوصی شفقت کا اظہار کرتی تھیں۔

"میں پانچ منٹ پہلے پی کے آرہی ہوں پاپا کے ساتھ۔ ابھی تو بالکل بھی گنجائش نہیں ہے۔" اس نے سلیقے سے معذرت کی اور باہر نکل گئی۔

…چائے لے لو اسد۔" تائی اماں پلیٹ میں گرما گرم شامی کباب اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے … رہی تھیں۔

"…ارسلہ کے ساتھ اتنے اکھڑے ہوئے کیوں …؟"

"…مجھے اس کی مردانہ قسم کی عادتیں سخت ناپسند …"

…نے اپنے احساسات چھپانے کی قطعی کوئی … نہیں کی۔

"…عورت، نزاکت اور آہستہ روی کے ساتھ ہی … لگتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ ایکٹو، جرأت مند … الٹے سیدھے میدان میں ٹانگ اڑانے والی … مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ اوپر سے اس کی … نے اسے مزید بے باک اور بے دھڑک بنا دیا … جدھر جی چاہتا ہے جا گھستی ہے۔ یہ بے خوفی، …ری اور خود سری عورت کی شرمیلی و شائستہ … کے خلاف ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" تائی جان نے برا سا منہ بنا کر بیٹے … خیالات پر رد عمل ظاہر کیا۔

"…وہ اپنا بوجھ خود اٹھاتی ہے۔ کسی پہ انحصار نہیں … اس میں اتنا اعتماد ہے کہ وہ جو کام اپنے ذمے لیتی … سے احسن طریقے سے انجام دے سکتی ہے۔ وہ … عمل سے ثابت کرتی ہے کہ اس پہ جو اعتماد کیا جاتا … اس کی حقدار ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی برائی نظر … آتی۔ یوں بھی ان کے گھر میں کوئی بھائی نہیں … دونوں بہنیں ہی تو ہیں۔ اگر ایسے میں اس نے … کام اپنے ذمے لے لیے ہیں تو اس میں کیا برائی …"

"…آپ کے لیے نہیں ہوگی۔ میرے لیے ہے۔" … لہجہ تیز ہو گیا۔ "میں اپنی بیوی کو اپنے مقابلے پہ … نہیں دیکھ سکتا۔ وہ لڑکی ہے اور لڑکی بن کے … اور روشان بھی تو ہے ناں۔۔۔"

…روشان کا اپنا مزاج ہے۔ ارسلہ کا اپنا۔ دونوں میں کیا موازنہ کرنا۔"

"ارسلہ کو انکل نے غیر ضروری آزادی دے رکھی ہے۔" اسد کے دل میں اس کے لیے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔

"لیکن اس نے اس آزادی کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ خود کو اس کا اہل ثابت کیا ہے۔"

"منگنی آپ نے اور ڈیڈی نے اپنی پسند سے کی ہے ناں تو پسند کرتی رہیے جی بھر کر۔ مگر مجھے اس کام کے لیے مجبور نہ کریں۔"

وہ خشک انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ اپنے کمرے کی جانب تھا۔

تائی جان تشویش ناک نظروں سے اپنے بگڑے ہوئے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

اسد کا اپنا ایک مزاج اور نقطہ نظر تھا۔ جب کہ ارسلہ شروع سے ہی بہت مختلف شخصیت کی حامل رہی تھی، اپنی عمر کے بچوں جیسی اس میں کبھی …

بات نہیں رہی تھی۔ ذہین، حساس، ذمہ دار اور بلا کی محنتی۔ بحر صاحب نے اس کی صلاحیتوں کو جانچنے کے بعد اسے مقدور بھر اعتماد اور تعاون فراہم کیا تھا۔ جس نے اس کی شخصیت میں مزید نکھار اور پختگی پیدا کی تھی۔

اسد کا اسٹائل، سوچ اور نظریات ارسلہ سے میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ اسے بطور منگیتر صرف برداشت کر رہا تھا۔ کوئی خاص محسوسات بیدار کرنے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ آئندہ زندگی گزارنے کا سوچ کر وہ کوفت اور جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگتا تھا۔

"جنابِ صدر اور میرے لذیذ ساتھیو۔ السلام علیکم۔ میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اس محفل میں بلایا۔ اور اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ ویسے اظہار قاضی بھی اچھا آرٹسٹ ہے اگر اسے موقع دیا جائے۔"

نیناں نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کالج کے ہال میں اپنی باری آنے پر روشان کے ساتھ مل کر تیار کردہ آئٹم شروع کیا۔

یہ ایک مزاحیہ تقریر تھی۔

"ارے بھئی یہ کیا بکواس ہے۔" اس کی کلاس فیلو ہما نے برا سا منہ بنایا تھا۔ مزید ایک دو نے بھی نکتہ چینی کی۔

"آگے تو سن لو پہلے...." روشان نے جھنجلا کر کہا۔

"دوستو! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ فورتھ ایر وہ کلاس ہے جو کبھی کبھی "واقعی" کلاس میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ عام طور پر آپ انہیں کیفے ٹیریا اور گراؤنڈ میں بغیر مائیکرواسکوپ کے دیکھ سکتے ہیں۔ کم کم کلاسیں لینا ان کی عادت ہے بقول شاعر۔

اے فورتھ ایر، ساڈی فورتھ ایر
ساری ٹیچرز کرن ایدھی سیوا
کلاس بیچ نہ آن والے
تے نخرے دکھان والے

"نیناں نے عطا اللہ عیسیٰ خیلوی بابے کے گانے کا [illegible] حشر کیا تھا۔

"فورتھ ایر کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ کبھی کبھی کلاس لے کر ثواب کمانے میں کوئی حرج نہیں [illegible] عبدالستار ایدھی بہت ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ [illegible] کو عیدی بالکل نہیں دینی چاہیے۔ اس سے [illegible] جاتے ہیں۔ طبیعت بگڑ جائے تو شاعر کے اس مشورے پر عمل کرنا چاہیے

جو دکھتا ہو گلا نزلے کے مارے
تو کر نمکین پانی کے غرارے

"چیٹنگ... چیٹنگ... یہ تو ڈاکٹر یونس بٹ کا اسٹائل ہے۔" ثوبیہ کے گروپ نے شور مچایا۔

"ارے بھئی اسٹائل ہی لیا ہے کوئی چوری تو نہیں کی۔ کاپی کرنے میں کیا حرج ہے۔ آج کل تو انسان تک کی کاپی بننے لگی ہے۔" نیناں نے روشان کے ساتھ شور مچا کر پھر چپ کرا دیا تھا۔

"غراروں سے یاد آیا" آج کل غراروں کا بڑا فیشن [illegible] ہے۔ فیشن تو پھر فیشن ہے ناں جی۔ مثال کے طور [illegible] ہماری فورتھ ایر کا چھٹی ٹائم فل میک اپ کے بہانے بہانے سے گیٹ کے چکر لگانا اور ہمارے ہیروز "کا قطار اندر قطار ٹو دب مستعد ہو کر [illegible] ہونا۔" نیناں سنجیدگی سے پڑھ رہی تھی۔ اب دبی دبی ہنسی بکھر گئی۔

"بہت ماریں گی فورتھ ایر کی "باجیاں"۔" ہما نے ہنسی روکتے ہوئے کہا تھا۔

"اب کچھ بات پارٹی کے بارے میں ہو جائے۔ پارٹی کرنا اور پارٹی بنانا اچھی بات ہے۔ پارٹی میں [illegible] طرح کے آئٹم ہوتے ہیں لیکن وہ چاہے کسی بھی ہو اس کا مقبول ترین آئٹم "ریفریشمنٹ" ہی ہوتا ہے۔ اور دوستو! فریش رہنا کسے اچھا نہیں لگتا۔ ہماری حکومت تو ہمیشہ ہی "فریش" رہتی ہے۔ ہر سال نئے نئے چہرے وزیر اعظم کی کرسی پہ دیکھنے کو [illegible] صورتحال بیچارے پاکستان ہسٹری کے [illegible] کے لیے بہت دردناک ہے۔"

"[illegible] اب مزہ آیا ناں۔ یہ آئیڈیا کس کا تھا [illegible] تقریر کا۔"

"[illegible] دونوں کا۔" روشان نے فخریہ سر اٹھایا تھا۔

"[illegible] آگے بھی تو سنو، دل تھام کے۔" نیناں [illegible] میں آ گئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا پیپر دوسری طرف [illegible] کر کے دوبارہ سلسلہ جوڑا۔

"حاضرین! آپ جانتے ہیں سب سے لمبی [illegible] روزے کی ہوتی ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ [illegible] پکڑتا ہے اور فورتھ ایر کو دیکھ کر سارا کالج عبرت [illegible] ہے۔ اللہ اللہ، یہ فیشن کی بہاریں، یہ میک اپ [illegible] نظارے، یہ ادا، یہ ناز، یہ انداز آپ کے کالج سے [illegible] ہماسا بن گئے۔" وہ گنگنانے لگی تھی۔

"[illegible] دوستو! کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ ہماری [illegible] قسمی آرٹسٹ قیصہ جی کیا خوب ڈانس کرتی ہیں۔ [illegible] سے میرا تو ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ ہماری کینٹین [illegible] یہ تازہ بنی ہوئی اور بار بار گرم کی گئی گرما گرم [illegible] اچھی ہوتی ہے۔ چکھیے اور دعائیں دیجیے۔"

[illegible] نے اپنا آئٹم پیش کرنے کے بعد کچھ الوداعی [illegible] کے بعد اجازت لی۔ سب نے تالیاں بجائیں۔

"اب سمجھ میں آیا میں نے فیئرویل پارٹی میں یہ [illegible] کیوں شامل کیا ہے۔" روشان راج ہنس کی طرح [illegible] اکڑائے ہوئے تھی۔

"اب اگلا آئٹم میرا ہے۔ یہ ایک گروپ [illegible] ہے۔ نیناں تم بھی اپنی جگہ سنبھالو۔" اس [illegible] میں نیناں بھی شامل تھی۔

"پہلے ہمارے گروپ کا ڈانس آئٹم پرفارم کرنے [illegible] ذرا جلدی ہے۔" ہما نے کہا تھا۔

[illegible] صدیقہ کیانی کے "دوپٹہ میرا ململ کا" پر [illegible] پرفارم کرنا تھا۔ اس کے بعد ایک مزاحیہ خاکہ پیش کیا [illegible] چونکہ لڑکیاں آپس میں مل کے ریہرسل کر رہی [illegible] اس لیے غیر سنجیدگی، لاابالی پن، ہنسی مذاق اور [illegible] کے شور شرابے کی وجہ سے ابھی تک کوئی تسلی بخش ریہرسل نہیں ہو سکی تھی۔

مشاعرے کے آئٹم کے لیے ممبر لڑکیاں ہی پوری نہیں ہو رہی تھیں۔

"یہ کس قسم کا مشاعرہ ہے۔ کہیں ڈیڈ آئٹم ہی نہ ثابت ہو۔" ہما نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔

"ایک تو تم ہر کام میں پہلے سے شور مچانا شروع کر دیتی ہو۔" روشان نے اس کی طبیعت صاف کی تھی۔

"ارے بھئی، مزاحیہ مشاعرہ ہے اور خاص طور پر فائنل ایر والوں کے اعزاز میں لکھا گیا ہے۔ تم پہلے ہمارے گروپ کی پرفارمنس دیکھو۔ پھر تنقید کی قینچی اٹھانا۔"

روشان منتخب کی گئی لڑکیوں کو اسٹیج پر ایک مخصوص نیم دائرے میں بٹھا کر مائیک پکڑ کر شروع ہو گئی تھی۔

"حاضرین آ گئے ہیں شیخ صاحب۔ اب یہ ٹوپی سنوارنا بند کریں۔" اس نے اپنی ایک ساتھی کو ٹوکا تھا۔

"او، اچھا جی اچھا۔ کیمرہ سیمرہ آن ہے ناں۔ ہاں تو بہت ہی معزز سامعین معافی چاہتا ہوں۔"

"پہلے میں اپنا کلام سناؤں گا۔" روشان نے خیالی پگڑی سنبھال کر کھنکار کر عرض کیا۔

ہسٹری لے کے ہم پہ کیا گزری
بڑی دکھ بھری کہانی ہے
کچھ نہ پوچھو اے فائنل والو
کس مصیبت میں زندگانی ہے
ابھی پاکستان بنانا ہے
اور مغلوں کی خبر لانی ہے

"واہ۔ بہت خوب۔" تنقید کرنے والے خاصے محظوظ ہوئے تھے۔

اب اجتماعی کھی کھی شروع ہو گئی تھی۔

"اب میں دعوت دیتا ہوں محترم "قلیل شفائی" صاحب کو کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔"

روشان کے دعوت دینے پر اس کے ساتھ بیٹھی کرن نے مائیک تھام لیا۔

عرض کیا ہے۔"

اے ہسٹری کے کورس اب تو ختم ہو
پڑھ پڑھ کے ہم پاگل ہونے والے ہیں

"واہ واہ کیا پیش گوئی فرمائی ہے۔" روشان لہک کر کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے اس سے اگلے ساتھی "احمد ناراض" کو دعوت دی۔

کاموں کی اس قدر بھرمار دیکھ کر
جی چاہتا ہے فائنل ہی چھوڑ جائیں ہم

"اب آتے ہیں مسٹر بوگن ویلیا۔۔۔ سوری مون ایلیا صاحب۔۔۔" مون ایلیا صاحب اپنے مجہول حلیے میں مائیک کو اپنے آگے کھینچتے ہیں۔

کالج میں پڑھ رہے ہو تو کیوں چپ ہو اس قدر
اک آسمان سر پہ اٹھائے ہوئے چلو

"ایک شعر عرض ہے۔" خان بگڑ آبادی نے اپنی باری پر گلا صاف کیا۔

نوٹس بھی اچھے بناتی ہے میری فائنل مگر
منہ بنانے میں تو اس کا کوئی ثانی ہی نہیں

"اوئے ہوئے کیا تیر جگر میں پار ہوگا۔ فورتھ ایر تو کھولتے کڑاہے پر جا بیٹھے گی۔" ہما نے مزہ لیا تھا۔

"معزز سامعین آپ کو یقیناً" ہمارا مشاعرہ پسند آیا ہوگا۔ آخر میں سارے اسٹوڈنٹس کے حق میں دعا۔۔۔ ہاتھ اٹھالیں سب کے سب۔۔۔"

مجھے قیدِ مکتب سے یارب چھڑا دے
پڑھانا ہے جو کچھ وہ گھر پہ پڑھا دے
قادر ہے ہر شے پہ مختار ہے تو
ذرا میرے پرچوں کے نمبر بڑھا دے

"مزہ آگیا۔"

"کیوں' تم تو کہہ رہی تھیں ڈیڈ آئٹم ہے۔" روشان نے بھنویں اچکائی تھیں۔

"اچھا بھئی' ساڑھے چار ہو رہے ہیں۔ اب چلتے ہیں۔ آخری ٹرپ دس منٹ بعد روانہ ہونے والا ہے۔" نغمہ نے گھڑی دیکھی تو سب کو وقت گزرنے کا دھیان آیا۔

"ارے بھاگو' ٹرپ نہ نکل جائے۔" نیناں نے روشان کو دیکھ کر شور مچایا۔

"میں ٹرپ سے نہیں جاؤں گی۔" وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں پرائیویٹ بس سے جائیں گے۔" روشان اس کی طرف دیکھے بغیر کہہ رہی تھی۔

"کیا۔۔۔؟" نیناں کو جیسے بچھو نے کاٹ لیا تھا۔

"ہاں۔۔۔" روشان اس کا بازو پکڑ کر مرکزی گیٹ کی طرف آگئی۔

"ارمغان کھڑا ہوگا۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے بس دس منٹ لگیں گے' پھر ہم پرائیویٹ بس سے گھر پہنچ جائیں گے۔ اسی ٹائم پر جس پہ کالج بس ہمیں پہنچاتی ہے۔"

"ارمغان۔۔۔؟؟؟" نیناں کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئیں۔

"ہاں۔۔۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

"تم جانتی ہو اس کا انجام؟" نیناں بہت سنجیدگی سے اس کا چہرہ پڑھنے لگی۔

"ہاں۔۔۔ کیا انجام ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ' پاپا خفا ہوں گے' ارسلہ ناراض ہوگی۔ لیکن پھر وہ مان بھی جائیں گے۔ آئی ایم شیور۔۔۔ ارمغان کوئی غیر تو نہیں ہے۔ میرا سگا ماموں زاد ہے۔ پاپا' ماموں کی فیملی سے رشتہ نہیں رکھنا چاہتے مگر میں تو ایسا چاہتی ہوں نا۔۔۔" اپنی حرکت کے جواز تلاش کر رہی تھی۔

"چچا جان نے برسوں سے تمہارے ماموں کی فیملی کا گھر میں آنا بند کر رکھا ہے۔ وہ ان کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اور تم ان سے رشتہ جوڑنے جا رہی ہو۔" نیناں حیران تھی۔

"تم اپنی ننھی سی عقل کو زحمت نہ دو۔ بس منہ بند رکھنا' گھر جا کے نہ بک دینا۔" وہ گیٹ کے باہر قدم رکھ چکی تھی۔

"وہ رہا ارمغان۔۔۔!" روشان تیزی سے سیاہ پینٹ اور پنک شرٹ میں ملبوس ایک اسمارٹ سے لڑکے کی

جانب بڑھ چکی تھی۔

نیہاں ٹھنڈی سانس لے کر گیٹ سے کچھ فاصلے پر لگے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

دس بارہ منٹ بعد روشان سرشار سی قدم اٹھاتی واپس آچکی تھی۔

"یہ تم کیا کرنے جا رہی ہو روشان؟" نیہاں کو فکر ہو رہی تھی۔

"ارے بھئی کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ ایک ہی خاندان ہے ہمارا۔ گھر پر نہیں مل سکتے' اس لیے وہ مجھ سے بات کرنے کی خاطر یہاں آجاتا ہے کبھی کبھار۔ وہ بتا رہا تھا ممانی' پاپا سے ہمارے رشتے کی بات کرنے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔"

"چچا جان کبھی بھی نہیں مانیں گے۔ یہ تم جانتی ہو۔"

"میں منوانا جانتی ہوں۔ اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔"

روشان کا لہجہ سپاٹ ہو گیا تھا۔

نیہاں نے چپ سادھ لی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ گلی نمبر ۸ کے "شاہ ہاؤس" کی بیل بجاتے ہوئے اشتیاق سے گیٹ کے اندر جھانک کر گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔

"جی کون۔۔۔؟" اوپر ٹیرس کی گولڈن گرل سے ایک چودہ سالہ لڑکی نے جھانکا تھا۔ اس نے جینز اور بلیو ایپرن رکھا تھا۔

"میں "انٹیریئر ڈیکور" سے آئی ہوں۔ ڈیزائنر ہوں۔ آپ کا گھر ڈیکوریٹ کرنے کے لیے اسائن کی گئی ہوں۔ مسٹر سفیان شاہ گھر پر ہیں؟"

"جی آپ آجایئے اندر۔۔۔ پاپا بس پہنچنے ہی والے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد گیٹ کھل گیا۔ چوکیدار نے ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

بہت پرشکوہ طرز تعمیر تھا۔ ڈرائنگ روم کا فرش چاکلیٹ براؤن اور وائٹ کلر کے پرنٹڈ خوبصورت چوکور ٹائلوں پر مشتمل تھا۔ عارضی طور پر ایک سادہ سا صوفہ سیٹ رکھا گیا تھا۔

اس نے اوپر نیچے کے کمروں کا جائزہ لیا۔

"کیا سارا گھر ڈیکوریٹ کرانا ہے۔ میرا مطلب ہے اوپر کا پورشن بھی؟" اس نے نیچے آکر چودہ سالہ بچی سے پوچھا تھا۔ اس سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی عانیہ تھی۔ چھوٹا بھائی آٹھ سال کا تھا' فریدوں۔ بچوں کی شائستگی' تہذیب اور تمیزداری قابل رشک تھی۔ کینیڈا میں پلنے بڑھنے کے باوجود ان کے ہر انداز میں مشرقی سبھاؤ اور مقامی رنگ ڈھنگ نمایاں نظر آتا تھا۔

"مس! آپ کافی لیں گی یا کولڈ ڈرنک۔۔۔؟"

"تھینکس۔۔۔ بس آپ اپنے پاپا کو بلوا دیں۔"

"مس! عانیہ نے فون کر دیا ہے۔ ان کا آفس یہاں سے بمشکل دس منٹ کی ڈرائیو پہ ہے۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔"

تانیہ نے جواب دیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔ بیٹے! کیا حال ہے آپ کا۔۔۔؟" ایک معمر خاتون اندر داخل ہوئیں۔

"یہ اماں ہیں۔ پاپا کے گاؤں کی رہنے والی ہیں۔ گھر کی دیکھ بھال کے لیے پاپا انہیں ساتھ لے آئے ہیں۔" تانیہ نے تعارف کروایا تھا۔

وہ بچوں سے باتوں میں مصروف تھی کہ سفیان شاہ آگئے۔

"السلام علیکم! آئی ایم سوری مس! آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔" لائٹ براؤن تھری پیس سوٹ میں قدرے بھاری سراپا اور بھرپور سراپا لیے وہ بردباری اور شائستگی کا واضح تاثر دے رہے تھے۔

"کس قسم کی لک چاہتے ہیں آپ اپنے گھر میں؟ میرا مطلب ہے ویسٹرن یا ایسٹرن اسٹائل یا دونوں کا مکسچر۔۔۔" ارسلہ نے پروفیشنل انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

"...کے لیے سب سے بہتر گے"

...چھوڑتا ہوں۔ پہلے میں نیچے ...شل آپ ڈیکوریٹ کروادوں گا' پھر کچھ گیپ ...فرنش اور ڈیکوریٹ کروادوں کا' پھر کچھ گیپ ...اوپر والا پورشن۔ میں نے اپنا بزنس کینیڈا سے پاکستان شفٹ کیا ہے اس لیے فی الحال ...مہنگی میں اسٹوری کی شاہانہ قسم کی ...افورڈ نہیں کرسکتا۔ آپ مجھے اپنی فیس بھی ...گا۔"

...ہمیں تو ادارہ ہی طے کرے گا۔ ہمیں تو صرف ...ملتا ہے۔ آپ فرنیچر اور ڈیکوریشن کی چیزوں ...کے اپنی رینج بتایئے۔ کتنا بجٹ بنا رکھا ہے آپ ...؟"

...میرے ناقص اندازے کے مطابق دو لاکھ فرنیچر ...اور ایک لاکھ ڈیکوریشن کے لیے کافی رہے گا۔ ...کیا خیال ہے؟" اس سے رائے طلب کر رہے ...ارسلہ اس وقت سرخ اور سبز کھلتے ہوئے رنگوں ...شلوار سوٹ اور سرخ دوپٹے میں ملبوس تھی۔ گہری ...آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور چہرے پر سنجیدہ و ...بے نیاز مگر نہایت چونکا دینے والا بھرپور تاثر ہر وقت ...رہتا تھا۔

...اس کی بے نیازی ہی اس کی شان تھی۔

"...جی۔۔۔" وہ اپنے کسی خیال سے چونک کر ان کی ...متوجہ ہوئی جو بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ آپ نے رینج بتادی ہے میں اسی کے ...فرنشنگ کروادوں گی۔ لیکن کارپٹنگ کے لیے ...علیحدہ سے بجٹ نکالنا ہو گا۔"

"...اس کی فکر نہ کریں' وہ میں ایک دو دن میں ہی ...دوں گا۔ اور فرنشنگ کے لیے اگر آپ کو مین پاور ...ضرورت ہو تو میرے پاس بہت سے ورکر ہیں۔ ...ضرورت آپ مجھے آفس کال کر کے انہیں ...لیجئے گا۔"

"...کریں۔"

"...اب میں چلتی ہوں' کل آؤں گی۔ پردوں کے لیے ...کھڑکیوں کا ناپ لینے کے لیے ایک ورکر ساتھ لاؤں ...اس کے علاوہ فرنیچر کے لیے کیٹلاگ بھی لیتی

آؤں گی آپ ایک نظر دیکھ کر پسند کر لیجئے گا۔ تاکہ اس کا آرڈر دیا جاسکے۔"

"اوکے مس! بس ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ جو کچھ کرنا ہے' آپ لوگوں نے ہی کرنا ہے۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ حال ہی میں کینیڈا سے آیا ہوں اور مجھے کسی مارکیٹ یا شاپ کا علم نہیں ہے۔"

وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"آپ بے فکر رہیں' ہماری کمپنی ان تمام معاملات کو دیکھ لے گی۔ وہاں مثل ورکرز بھی ہیں جن کا ایسے ہی کاموں سے واسطہ رہتا ہے۔"

"ہاں بھئی کیا رسپانس ہے۔" وہ آفس آکر میڈم آصفہ کو رپورٹ دینے کے بعد باہر نکلی تو شہروز نے استفسار کیا تھا۔

اس نے مختصراً اپنا تجربہ بتایا۔

"جب بھی کام کے لیے نکلو پہلے وہاں رہنے والوں کی تمیز و تہذیب اور شرافت کا یقین کر لیا کرو۔ آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔" اس نے ہر بار کی طرح ارسلہ کو تاکید کی تھی۔

"اُفوہ! یہ گھسی پٹی نصیحت نہ کیا کرو بار بار' مجھے بھی پتا ہے۔ اس وقت تو چائے منگواؤ اچھی سی۔"

اس نے پرسکون سی ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔

❋ ❋ ❋

"کیسی رہی تمہاری ریہرسل' کل تو فنکشن ہے ناں۔۔۔؟" روشان جمعرات کو دیر سے گھر لوٹی تو ارسلہ اس کی منتظر تھی۔

"بہت زبردست' کیا تم کل آؤ گی میرے کالج' ہماری پرفارمنس دیکھنے؟" وہ بیگ اور فائل لاؤنج کے صوفے پر رکھ کر کشن لے کر وہیں کارپٹ پر دراز ہو گئی تھی۔

"نہیں یار' مجھے سفیان شاہ صاحب کے فرنیچر کے لیے آرڈر دینا ہے۔ کل کا دن بہت مصروف گزرے گا۔" ارسلہ نے معذرت چاہی۔

"افوہ، تم آتیں تو تمہیں اندازہ ہوتا ہم نے کتنے اچھے آئٹم تیار کیے ہیں۔ ابھی نیناں کے ساتھ مل کے ریہرسل کروں گی۔ تم دیکھنا تو سہی۔ وہ تھوڑی دیر بعد ادھر آئے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی تو میں یہیں ہوں۔ یہ پاپا ابھی تک نہیں آئے۔" ارسلہ نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔

"کہاں گئے ہیں۔" روشان نے بے فکری سے پوچھا۔

"واک پہ نکلے تھے' تایا کے ساتھ۔"

"کہیں دونوں "ریٹائرڈ آرمی آفیسرز" آپ کی اور اسد بھائی کی ڈیٹ فکس کرنے تو نہیں بیٹھ گئے۔" روشان نے شرارت سے بڑی بہن کی طرف دیکھا۔

"اس موضوع پر میری پہلے ہی پاپا سے بات ہو چکی ہے۔ تم چائے پیو گی؟" وہ کچن کی طرف مڑتے ہوئے گویا ہوئی۔

"نہیں البتہ اگر اورنج جوس مل جائے تو نہایت شکر گزار ہوں گی۔" روشان کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نیناں آئی تو دونوں مل کر "کالج کا خبرنامہ" تیار کرنے لگیں۔

"ہمارے نامعقول ذرائع کے مطابق کالج کی لائبریری کی سربراہ اور انتظامیہ نے کتابوں کی عدم دستیابی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے آئندہ سے ہر قسم کی نصابی کتب کے خاتمے کا فیصلہ کیا ہے ان کے اس مستحسن اقدام کو تمام اسٹوڈنٹس نے خوب سراہا ہے۔

ایک اور خبر کے مطابق آج کالج کینٹین میں جنگ عظیم سوم کی سی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ طالبات کے جنگجو گروہوں نے کرسیوں کے ذریعے زمینی حملے کیے جب کہ کتابوں' پلیٹوں اور چمچوں کے ذریعے ہوائی حملے کر کے ایک دوسرے کو بھاری نقصان پہنچایا۔ اقوام ورندہ نے اس جنگ کو بہت پسند کیا ہے۔ امید ہے آئندہ چند روز میں پانی پت پارٹ ٹو کی ریہرسل بھی اسی جوش و خروش سے منعقد کی جائے گی۔"

نیناں خبریں پڑھ کر سنا رہی تھی اور ارسلہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

"اب آپ سنیے موسم کا حال' کالج ہوسٹل سے موصول شدہ اطلاعات کے مطابق ہوسٹل میں پانی کی لائن بند ہو جانے کے باعث پورا ہاسٹل خشک سالی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کالج انتظامیہ نے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ سے تعاون کی اپیل کی ہے کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ملا کر پانی بنانے کی کوشش تیز کر دیں۔ اس کے علاوہ پرنسپل اور ایگزامینیشن کمیٹی کے کمرے کا موسم سخت گرم رہا۔ اس وقت خبرنامہ کمیٹی شدید عتاب کا شکار نظر آ رہی ہے' اس سے پہلے کہ مجھ سمیت اس کمیٹی کو اٹھا کے پھینکا جائے ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔"

"بہت خوب۔" پاپا بھی اس دوران آ چکے تھے اور ان دونوں کے تیار کردہ مزاحیہ خبرنامے سے محظوظ ہو رہے تھے۔

"پاپا! پہلے ان سے پوچھیں کہاں سے نقل کیے ہیں یہ سارے آئیڈیاز۔" ارسلہ نے بہن کو چھیڑا۔

"جی نہیں۔ ہم نے محض انسپائریشن لی ہے۔ محنت ہماری اپنی ہے۔ بنایا بھی خود ہی ہے۔" دونوں تڑپ ہی تو گئی تھیں۔

ان کی پارٹی اختتام پذیر ہوئی تو گھر والوں نے سکون کی سانس لی ورنہ شام چار پانچ بجے تک ان کے انتظار میں وسوسوں میں گھرے رہتے تھے۔

اس دن موسم خاصا خراب ہو رہا تھا۔ ارسلہ بھی جلدی واپس آ گئی تھی۔

"ارسلہ بیٹے! میں ذرا کرنل ستار کی طبیعت پوچھنے جا رہا ہوں۔ روشان کے کالج کے آس پاس ہے ان کی کوٹھی۔ اگر ٹائم ہوا تو واپسی میں روشان اور نیناں کو پک کرتا ہوا آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے پاپا! یوں بھی موسم بھی عجیب ہو رہا ہے۔"

❁ ❁ ❁

موسم حسیں ہے لیکن
تم سا حسیں نہیں ہے
ہر اک ادا تمہاری
واللہ دلنشیں ہے

ارمغان آج بہت موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔

"ارمغان پلیز' میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔ تم الٹے سیدھے گانے گا کر مجھے مزید ٹینشن نہ کرو۔"

احساس جرم اور پاپا کے اعتماد کو پہنچنے والی ٹھیس کا بوجھ گراں اس کا رواں رواں نادم ہو رہا تھا۔

"ارسلہ اور پاپا کو یہی معلوم ہے کہ میں کالج گئی ہوں انہیں پتا چل جائے کہ میں صبح سے کالج سے غائب ہوں تو وہ کیا سوچیں گے۔ ہائے میرے پیارے اللہ!"

ارمغان بڑی ترنگ کے عالم میں اسلام آباد کی بھیگی شاہراہ سڑکوں پر موٹر سائیکل چلا رہا تھا' جب کہ بار بار گھڑی دیکھتی روشان کا شدید ٹینشن کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن ہونے کو تھا۔

"جلدی چلاؤ ارمغان! ہو سکتا ہے موسم کی خرابی کے باعث پاپا یا ارسلہ مجھے اور نیناں کو پک کرنے آ جائیں۔ نیناں اکیلی بے چاری اس صورت حال سے نہ نپٹ سکے گی۔ ہمیں ہر حال میں پاپا کے آنے سے پہلے کالج گیٹ پر پہنچنا ہے۔"

"جو حکم جناب عالی!" وہ مسکرا دیا۔ "ورنہ دل تو یہی کر رہا ہے کہ اس آنکھ مچولی کھیلتے بادلوں کے سنگ ہم بھی اسی طرح اڑتے پھریں۔ بادلوں میں تیرتے رہیں۔"

"مائی گاڈ ڈیڑھ بج رہا ہے۔ نیناں بے چینی سے منتظر ہو گی۔" روشان کو رہ رہ کر ہول اٹھ رہے تھے۔

وہ بائیک سے اتر رہی تھی جب اس کی نظر کالج گیٹ سے قدرے ہٹ کر پارک کی سمت گئی' ٹیوٹا کرولا کے دروازے سے ٹیک لگائے براہ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے پاپا پر پڑی۔ وہ ہلکے نیلے سفاری سوٹ میں ملبوس دونوں ہاتھ سینے پر باندھے پتھرائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ کالج کے بجائے کہیں باہر سے آ رہی تھی۔

ایک لڑکے کی بائیک پر۔

اور وہ لڑکا ارمغان تھا۔ اس کے ماموں کا بیٹا جنہیں پاپا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

اس سے زیادہ انتہا کیا ہو سکتی تھی' روشان سفید چہرہ لیے بائیک سے اتری۔ ارمغان اسے اتار کر بائیک موڑ چکا تھا' اس وحشت ناک صورت حال سے اسے اکیلے ہی نپٹنا تھا۔

❁ ❁ ❁

"پاپا پلیز! کھانا کھا لیں آپ نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔"

ارسلہ آہستگی سے ان کے اسٹڈی روم میں داخل ہوئی تھی۔

انہوں نے سرخ بے خواب آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بیٹیوں کو اسی لیے لاڈ پیار' مان اور آزادی دی جاتی ہے کہ وہ باپ کی عزت کو چوراہے پر لا آئیں۔؟ ساری دنیا کہتی تھی بیٹیوں کو زیادہ لاڈ محبت نہیں دیا کرتے۔ ان کی تربیت سخت ہونی چاہیے تاکہ وہ آئندہ نسلوں کی حفاظت کی امین بن سکیں' لیکن میں ان کی باتیں مذاق میں اڑا دیا کرتا تھا کہ میرے لیے بیٹا' بیٹی برابر ہیں۔ دونوں کو ایک جیسا مان' پیار اور اعتماد ملنا چاہیے۔ کیا میں نے تم لوگوں پر بھروسا کر کے غلط کیا تھا۔؟؟" وہ ذہنی شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہے تھے۔

"پلیز پاپا! آپ ایسا نہ سوچیں۔ وہ کہہ رہی ہے میں ارمغان کے ساتھ ایسی ویسی جگہ پہ ہرگز نہیں گئی تھی بلکہ ماموں ممانی کے گھر گئی تھی۔ ممانی نے اسے بلوایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کے ارادے سے قطعی نہیں گئی تھی۔ اور نہ کبھی وہ ایسا کرنے کا سوچ سکتی ہے۔"

ارسلہ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ "پاپا! ہمیں اس وقت اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ تم جاکر اپنا کام کرو۔" یہ پہلی دفعہ تھی کہ وہ اس سے اتنی رکھائی سے مخاطب ہوئے تھے۔

ارسلہ باہر آکر روشان پر برس پڑی۔

"آخر کیا ضرورت تھی تمہیں پاپا کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی۔ گھر سے کالج کے لیے نکلیں اور وہاں سے چپکے سے کھسک گئیں اس لڑکے کے ساتھ۔ شیم آن یو روشان! یہ کتنی گری ہوئی حرکت ہے۔ تم نے نہ صرف ہمیں بلکہ اپنے اساتذہ کو بھی دھوکا دیا۔"

"تم یقین کرو ارسلہ! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن ارمغان دو تین دن سے بار بار کہہ رہا تھا کہ ماموں، ممانی مجھے یاد کررہے ہیں۔ وہ یہاں تو نہیں آسکتے تھے اس لیے میں ان کے ہاں چلی گئی۔ ویسے وہ یہاں کیوں نہیں آسکتے۔ پاپا کو اتنے ناپسند کیوں ہیں وہ؟ حالانکہ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ پتا ہے ممانی بار بار تمہارا پوچھ رہی تھیں۔"

ارسلہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"جس بات سے والدین روکتے ہیں، اس سے رک جانا چاہیے۔ خوامخواہ کے جواز نہیں ڈھونڈنے چاہئیں۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی پاپا کی ناپسندیدگی کی۔"

"کوئی وجہ نہیں، بس وہ کچھ غریب ہیں۔ اس لیے پاپا کو اچھے نہیں لگتے۔" روشان نے بگڑ کر کہا۔

ارسلہ اور روشان کی امی لاشانہ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ خدا نے انہیں حسن کی دولت سے نواز رکھا تھا۔ میجر ضیاء جو اس وقت نئے نئے کیپٹن بنے تھے اچانک ان کی نظر کا شکار ہوگئے۔ لاشانہ چار بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ ایک بھائی بھابھی تھے جو ان کے ذمہ دار تھے۔ رضوان نے کچھ سوچ کر ہی کیپٹن ضیاء سے بہن کی شادی کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ضیاء صاحب جدی پشتی امیر تھے۔ آرمی لائف تو محض ان کا شوق، ان کی پسند تھی۔ لاہور کے نواحی علاقے میں ان کی وسیع زرعی اراضی تھی۔ شادی کے بعد بہن کے گھر آکر انہوں نے بھی کاروباری [illegible]

کبھی کسی ناگہانی آفت کا حوالہ دے کر اور کبھی کسی بہن کی شادی کے اخراجات کے لیے کیپٹن ضیاء سے آئے دن رقمیں مانگنا شروع کردیں۔ ضیاء صاحب اپنی عزیز از جان بیوی کے منہ کو دیکھ کر اپنے نکمے اور کام چور سالے کو نوازتے تھے۔ پھر چند سال بعد لاشانہ کی وفات کے بعد بھی جب رضوان نے اپنی ہڈحرامی اور بے غیرتی کا مظاہرہ ترک نہیں کیا تو ضیاء صاحب کو سختی سے کام لینا پڑا۔

اس دن لاشانہ کی دوسری برسی تھی۔ رضوان نے کاروبار کے لیے پچاس ہزار مانگے تھے۔ دونوں میاں بیوی آٹھ سالہ ارسلہ اور پانچ سالہ روشان کو چوم چاٹ رہے تھے۔

ضیاء صاحب کو ان کے خود غرض رویے کی یہ لپا پوتی زہر لگ رہی تھی۔

"برائے مہربانی آپ دونوں میاں بیوی دوبارہ یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کریں۔ میری بچیاں ماموں، ممانی کی محبت کے لیے مری نہیں جارہیں۔ یوں بھی آپ کی بہن اس دنیا میں نہیں رہی۔ اب آپ کا اس گھر سے کوئی رشتہ، واسطہ نہیں ہے۔ رہی بچیاں تو وہ سراسر میری ذمہ داری ہیں۔ آپ کی "محبتوں" کے بغیر بھی وہ بڑے آرام سے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی صاحب۔" رضوان فوراً چاپلوس انداز میں مخاطب ہوئے تھے۔ مگر ضیاء صاحب کو ان لالچی اور فریبی لوگوں سے مزید تعلق رکھنا منظور نہیں تھا لہٰذا دو ٹوک دوبارہ نہ آنے کا کہہ دیا تھا۔

❁ ❁ ❁

"اسے کہہ دو ارسلہ! میری محبتوں اور میرے مان کا اتنا عبرت ناک صلہ نہ دے۔ وہ لوگ اس کے گرد جال بن رہے ہیں۔ ان کا ہر الٹا قدم نیا فریب ہے۔ تم دونوں کے نام لکھی گئی میری دولت کو ہتھیانے کا۔" وہ ہارے ہوئے انداز میں اگلے دن اپنے کمرے سے برآمد ہوئے تھے۔

"پاپا۔ وہ۔" ارسلہ کو بتانا محال لگ رہا تھا۔

[illegible] رضوان ماموں کا ابھی فون آیا تھا۔ وہ روشان کی [illegible] رشتہ مانگنے آپ کے پاس آرہے ہیں۔ روشان [illegible] نے ساری صورت حال ارمغان کے گوش گزار [illegible] تھی فون پر۔ اسی وجہ سے۔"

[illegible] ارسلہ سر جھکائے مجرمانہ لہجے میں انہیں مطلع [illegible] تھی۔ ضیاء صاحب کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

[illegible] ت بری طرح توڑا ہے مجھے روشان نے۔ میں تو [illegible] نظریات سے ہار گیا ہوں۔ خود اپنے آپ میں [illegible] گیا ہوں۔"

[illegible] ے میرے پاپا۔" ارسلہ کا دل دکھ گیا۔ [illegible] ے روشان پر بھی جی بھر کے غصہ آیا۔ [illegible] روشان نے کہا ہے کہ شادی کرے گی تو صرف [illegible] ف ارمغان سے۔ ورنہ تمام عمر یونہی گزار دے [illegible]

[illegible] رسلہ نے انہیں اس کے آخری فیصلے سے آگاہ [illegible] تھا۔

[illegible] اپنے دامن میں انگارے بھر رہی ہے بے [illegible] ے۔" وہ بڑبڑائے تھے۔

[illegible] روہ اپنی ہٹ کی پکی ہے۔ اس کی ضد ہے تو آپ [illegible] ہیں۔ پھر کچھ بھی سہی ارمغان ہے تو ہمارا ماموں [illegible] کا رشتہ بنتا ہے۔ اتنا بھروسہ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

[illegible] رنے دبے لفظوں میں موجود صورت حال کی سنگینی کا [illegible] دلایا اور باپ کو آئندہ اقدام کے لیے سوچ بچار [illegible] کے لیے نکتہ پیش کیا۔ ضیاء صاحب کے [illegible] ے نیچے ڈھلک گئے۔ اولاد پر سختی کرنے والوں [illegible] سے تو وہ کبھی بھی نہیں رہے تھے۔

✲ ✲ ✲

[illegible] نٹ۔" ارسلہ نے نہایت غصے کے عالم میں [illegible] بونٹ نیچے ٹھپ سے مارا تھا۔

[illegible] اس مصیبت کو بھی ابھی خراب ہونا تھا۔ شاہ [illegible] کے ہاں جانا ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے آفس [illegible] کام نکال کے چار بجے پہنچیں گے۔ بلکہ پہنچ چکے [illegible] صرف دس منٹ ہی تو رہ گئے ہیں چار بجنے

میں۔"

پریشانی کے مارے وہ با آواز بلند بڑبڑا رہی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے موبائل سے آفس کا نمبر ملایا۔

"شہروز! میری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ ایف ایٹ مارکیٹ کے پاس۔ بتاؤ کیا کروں؟"

"کیا ہوا۔؟" وہ فوراً بولا۔

"پتا نہیں چلتے چلتے خود ہی بند ہوگئی ہے۔"

"خود ہی کیسے بند ہوگئی؟"

"اُفوہ! ایک تو بات بے بات جرح کرنے لگتے ہو۔ مجھے کیا پتا کیسے بند ہوگئی۔ یہ تو گاڑی سے ہی پوچھ کے بتا سکتی ہوں کہ تمہیں کیا مرض لاحق ہوا ہے۔" وہ جل کر کہہ رہی تھی۔ "تم یہ بتاؤ اب کیا کروں؟"

"جاہل لڑکی! میں اس لیے وجہ پوچھ رہا تھا کہ اگر کوئی چھوٹی موٹی گڑبڑ ہے یا کرنٹ کی تار اتر گئی ہے تو میں تمہیں بتادیتا ہوں کہ کیسے نقص دور ہوگا۔" اس نے وضاحت کی۔

"اچھا میں بونٹ کھولتی ہوں، تم بتاؤ۔ کیا چیک کروں۔ کرنٹ کی تار کہاں ہوتی ہے۔" وہ بونٹ کھول کے موبائل کان سے لگا کے کھٹر پٹر کرنے لگی۔ شہروز کچھ ہدایات دے رہا تھا مگر وہ سیدھی سیدھی اس کے سر سے گزر رہی تھیں۔

"اُفوہ! میں خود ہی پہنچتا ہوں، تم سے نہیں کچھ ہوگا۔ بیس منٹ لگ جائیں گے۔" تنگ آکر شہروز نے کہا۔

"دیر ہوجائے گی شہروز۔ تم جانے کب پہنچو گے، میں پہلے ہی لیٹ ہورہی ہوں۔ میں ٹیکسی نہ کرلوں؟"

"ہرگز نہیں، جب میں آرہا ہوں تو رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ فوراً بولا۔

"رسک کی کیا بات ہے، جانے کتنی لڑکیاں روزانہ ٹیکسی میں اکیلی سفر کرتی ہیں۔ آخر میں گاڑی لے کے بھی تو اکیلی ہی آتی جاتی ہوں۔"

"لڑکیاں بے شک کرتی ہوں گی مگر تمہارا ایسا تجربہ ہوگا۔" وہ فون رکھ چکا تھا۔

"تو یہ خوامخواہ میں میرا 'گاڈ فادر' بنا رہتا ہے۔ اس

کے پہنچتے پہنچتے کتنی دیر ہو جائے گی مجھے۔ اور ادھر وہ شاہ صاحب میری جان کو رو رہے ہوں گے۔" وہ بڑبڑائی۔ وہ تھوڑی دیر میں اپنی سرخ آلٹو لے کر اسے ڈھونڈتا ہوا آن پہنچا۔

"اور میری اس گاڑی کا کیا ہو گا؟" اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تمہیں کلائنٹ کے گھر ڈراپ کر کے واپس آ کر اسے کسی مکینک کو دکھاتا ہوں' اگر نقص معمولی ہوا تو اسے تمہارے پاس لے آؤں گا نہیں تو فون پر انفارم کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' اگر ورکشاپ لے جانی پڑی تو تم مجھے اپنی گاڑی میں پک کر لینا۔ آفس جا کر پاپا کو فون کر کے ان کا آفس ڈرائیور منگوا لوں گی۔"

وہ سفیان شاہ کے بنگلے کے آگے اترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"او کے مگر اپنا حلیہ تو درست کر لو۔ سارے بال بکھر گئے ہیں۔ یہ لو۔" اس نے جھک کر ڈیش بورڈ سے برش نکالا جس کے ہینڈل پہ شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ ملاحظہ کیا۔ گھنگھریالے بالوں کی چھوٹی بڑی لٹیں پیشانی اور گردن کے ارد گرد ناگن بن کر لپٹی ہوئی تھیں۔ سیاہ بے حد چمکدار خوبصورت آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر انہیں مزید واضح اور روشن کر رہی تھی۔

بال درست کر کے از سر نو پنوں میں جکڑنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شہروز اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے دیکھنے پر نظروں کا زاویہ بدل کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

"خدا حافظ۔" وہ گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

"آئی ایم سو سوری' سفیان شاہ صاحب! آپ کو اتنی دیر تک انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ دراصل میری گاڑی۔۔۔"

وہ جاتے ہی شروع ہو گئی تھی۔

صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لہجہ رسانیت اور نرمی لیے ہوئے تھا۔

وہ بے ساختہ شرمندہ سی ہو کر بیٹھ گئی۔

"یہ لیجیے۔" ارسلہ نے فائل ان کی طرف بڑھائی۔

"اس میں فرنشنگ اور ڈیکوریشن کا اسٹائل' کلر اسکیم اور ان پر آنے والی لاگت کی ڈیٹیل ہے۔" براؤن شلوار قمیص میں ملبوس سفیان شاہ نے بغور فائل کا جائزہ لیا' ان کے چہرے پر سنجیدگی اور ایک عجیب سا ساتاثر قم تھا۔

"ٹھیک ہے' جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ ظاہر ہے آپ پروفیشنل ہیں۔ اماں! ابھی تک چائے نہیں آئی۔" فائل بند کر کے انہوں نے کچن میں مصروف عمل اماں کو آواز لگائی تھی۔

"آ گئی' السلام علیکم بیٹی!" اماں چائے کے لوازمات سے سجی ٹرالی لیے اندر آ گئی تھیں۔

دو چار پروفیشنل باتوں کے بعد وہ معذرت کر کے اٹھ گئے تھے۔ ان کی گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی دونوں بچے اس کے پاس آ گئے۔

"تھینک گاڈ۔ ابھی ابھی ہمارے ٹیوٹر گئے ہیں' آپ بتائیے مس! آپ کیسی ہیں؟"

"بالکل ٹھیک۔ ذرا مجھے اپنا کمرہ تو دکھائیے گا۔" ان کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے ضروری پیمائش بھی لے رہی تھی۔

اگلے دن وہ شہروز کے ساتھ مارکیٹ گئی۔ سفیان شاہ کی طرف سے چیک مل چکا تھا۔ شام کو منتخب سامان لوڈ کر کے ان کی کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔ وہ اور شہروز ورکرز کی مدد سے سامان سیٹ کراتے رہے۔ گو کہ یہ شہروز کا پراجیکٹ نہیں تھا لیکن وہ پراجیکٹ میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ دونوں وہاں سے آفس آ گئے اور کچھ ضروری ۔۔۔ کرنے لگے اسے پیل میڈم آصفہ ۔۔۔

ڈارک گرین لیدر کے صوفے' ڈارک گرین اور سلور پہ مشتمل ڈارک گرین ۔۔۔ دوسرا صوفہ سیٹ سلور اور گرین سلک کے ۔۔۔ والا ہے اور ڈیکوریشن کے لیے گرین کرسٹل کے خوبصورت گلدان اور کچھ روایتی ۔۔۔ کچھل قسم کے ۔۔۔ پینٹنگز مثلاً دیواروں پر رگ (rug) لٹکانا ۔۔۔ شاندار قسم کی پورٹریٹ' اس کے علاوہ چھوٹے ۔۔۔ نازک کرسٹل پیس۔ اب رہ گیا بچوں کا کمرہ اور ۔۔۔ صاحب کا کمرہ۔ اپر پورشن وہ لوگ بعد میں کرائیں ۔۔۔

"ان کی مسز کب تک آ رہی ہیں؟" شہروز یونہی ۔۔۔ بیٹھا۔

"بچے کہہ رہے تھے' وہ کینیڈا میں ہیں اپنی کسی ۔۔۔ کے پاس' وہ دو تین ماہ میں آئیں گی۔"

"کیا وہاں جاب کرتی ہیں یا ان کے والدین رہتے ۔۔۔"

"نہ جاب کرتی ہیں' نہ میکہ ہے وہاں۔ بس کسی ۔۔۔ ایک ہفتہ پاکستان رہ کر وہ واپس کینیڈا چلی گئی ۔۔۔"

"یہ کیا چکر ہے۔" شہروز متعجب نظروں سے اس کی ۔۔۔ دیکھنے لگا۔

"بچے تو یہی کہتے ہیں کہ ماما کسی کام سے وہاں رکی ۔۔۔ آخر کون سا کام ہو سکتا ہے۔ کوئی کورس وغیرہ ۔۔۔ کر رہی ہوتیں تو کم از کم بچوں کو تو خبر ہوتی۔ پس پردہ ۔۔۔ ہے۔ خود شاہ صاحب بھی اس موضوع سے ۔۔۔ کتراتے ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

"بس۔" شہروز نے ہاتھ اٹھا دیا۔ "ہمارے پاس ۔۔۔ اپنے مسائل کم ہیں بات کرنے کے لیے جو ادھر ادھر ۔۔۔ کی پریشانیاں سمیٹ رہے ہیں۔ تم سناؤ' تمہارے پاپا کی ۔۔۔ طبیعت کچھ سنبھلی۔"

"ان کی طبیعت تو ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئی ۔۔۔" ارسلہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "روشان کی ضد ۔۔۔ رشتہ ارمغان سے طے تو کر دیا ہے مگر وہ خوش ۔۔۔

"ارمغان کرتا کیا ہے؟" شہروز کو اول روز سے سارے قصے کی خبر تھی۔ ارسلہ اس سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔

"گزشتہ تین سال سے ایم بی اے کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اس بار کر ہی گزرے۔ ایم بی اے پاس کرنے کے بعد اسے بہتر نوکری حاصل کرنے کے مواقع مل جائیں گے۔ صورت حال اتنی بھی مایوس کن اور بری نہیں ہے کہ تم اور انکل یوں ہی ہار بیٹھیں۔ ہمیں اچھائی کی توقع کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے انسان کو تھکن نہیں ہوتی' وہ تازہ دم رہتا ہے۔ یہ بتاؤ' شادی کے کب ارادے ہیں۔" چائے آ چکی تھی۔ شہروز اس کی چائے اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ماموں' ممانی کا تو بس نہیں چلتا' آج ہی بیاہ کے لے جائیں۔ رکاوٹ پاپا کی طرف سے ہے' وہ مجھے اور اس کو اکٹھا بیاہنا چاہتے ہیں۔" شہروز بے وجہ کاغذ پر پین سے لائنیں کھینچنے لگا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور ساری توجہ کاغذ پر تھی۔

"پھر کیا طے ہوا؟" اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں۔ تایا جان کی طرف سے فی الحال کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی اور خود میں بھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔ میری کوشش یہ ہے کہ میں پہلے روشان کی شادی کر دوں' مبادا اس کے ذہن میں خیال آئے کہ میری وجہ سے اس کی خوشیاں اس سے دور کھڑی ہیں۔"

"بالکل۔" وہ قدرے ریلیکس نظر آیا۔ "ضروری تو نہیں ہے بڑی کی پہلے ہو اور چھوٹی کی اس کے بعد۔" وہ اپنی میز کی دراز کھول رہا تھا۔

"اچھا' یہ کارڈ رکھو نیا سال شروع ہونے والا ہے۔ وش تو میں تمہیں رات بارہ بجے کے بعد ہی کروں گا' بہرحال کارڈ حاضر ہے۔"

"مائی گاڈ شہروز! تم عید بقر عید ہر تہوار پر' ہر موقع پر مجھے وش کرنا اور کارڈ بھیجنا نہیں بھولتے۔ بہت کیئرنگ ۔۔۔

اینڈ شیرنگ قسم کے دوست ہو۔" ارسلہ کو بے ساختہ سی خوشی ہوئی تھی۔ وہ کارڈ کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ بہت خوبصورت سا منظر تھا' شام کا سورج ڈوبنے کا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔

"جب بھی مدد کی ضرورت ہو' آنکھیں بند کر کے پکار لینا۔" وہ کارڈ پڑھ رہی تھی اور محظوظ ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں زور و شور سے روشان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ظاہر ہے' زیادہ "کھپ" ارسلہ کے لیے ہی تھی کہ وہی باہر کے کام سنبھال رہی تھی۔ پاپا بھی سرگرم عمل تھے لیکن بہت بجھے بجھے انداز میں۔ ممانی اب بڑے حق سے یہاں آیا کرتی تھیں اور باتوں باتوں میں اپنی فرمائشیں اور چیزوں کے بارے میں اپنی پسند' ناپسند بتا دیا کرتی تھیں۔

ارسلہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔

تایا سجاد کی فیملی کو اس اچانک اور انوکھے قسم کے فیصلے پر خاصا اچنبھا ہوا تھا۔ نیناں جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموش رہی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ یہ بیل منڈھے چڑھ جائے گی۔

بہر حال وہ ہر حال میں خوش اور مطمئن رہنے والی' بے فکری لڑکی تھی۔ اس نے اپنی ساری توجہ شادی کو بھرپور اور ہنگامہ خیز بنانے میں لگا دی تھی۔

شادی سے ایک ہفتہ پہلے اسے مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔

وہ واقعہ شادی سے ٹھیک تین دن قبل ہوا۔

"میں فرنیچر لوڈ کروانے جا رہی ہوں پاپا کے ساتھ۔ تمہیں تھریڈنگ اور فیشل کے لیے پارلر کس ٹائم جانا ہے۔" ارسلہ نے ڈراپ کرنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

"وہ شام کو جانا ہے' آپ لوگ جائیں۔"

اس دن روشان ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خاموش الجھی ہوئی بلکہ فکر مند سی دکھائی دی تھی۔

ارسلہ واپس آ کر اس سے پوچھنے کا سوچتی ہوئی چلی گئی مگر واپس آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

جس سے پوچھنا تھا' وہ گھر سے غائب تھی۔

ارسلہ تایا جان کے ہاں عجلت میں آئی تھی۔ وہاں بھی نہیں ملی۔ آس پاس کے اپارٹمنٹ میں بہانے سے گھس کے دیکھا مگر کہاں۔ پارلر فون کیا۔ ادھر سے جواب آیا۔ "ہم تو خود انتظار کر رہے ہیں۔"

یا خدا کہاں چلی گئی۔ زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

میجر ضیاء کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہاتھوں پیروں سے جان نکلی جا رہی تھی۔

"پاپا... پاپا! پلیز' آپ ریلیکس رہیں۔ میں اسے ڈھونڈ لاتی ہوں۔ یہیں کہیں ہو گی شہر کے کسی شاپنگ سینٹر میں۔ اپنی مرضی کی کوئی چیز خریدنا ہو گی اور اس نے کہاں جانا ہے۔ پرسوں اس کی شادی ہے اور اس کی پسند سے ہو رہی ہے۔ اس موقعے کا وہ شدت سے انتظار کر رہی تھی پھر اسے رائیگاں کیوں جانے دے گی۔ اسے بھی موقع کی نزاکت کا پورا پورا احساس ہو گا۔"

وہ خود بھی از حد پریشان تھی لیکن باپ کا مرجھایا ہوا خوفزدہ چہرہ دیکھنے کی تاب نہیں ہو رہی تھی۔ وہ خود کو زبردستی مطمئن دکھانا چاہتی تھی۔

"عزت صدیوں کی محنت اور جدوجہد کے بعد خاندان کے سر پر دستار بن کے سجا کرتی ہے ضیاء۔"

رات کے ساڑھے گیارہ ہو گئے تو تایا سجاد نے سخت لہجے میں ضیاء صاحب کو مخاطب کیا تھا۔

"میں جانتا ہوں بھائی صاحب!" وہ بے بسی کی انتہائی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ آنکھیں بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ ارسلہ نے اپنے آفس فون کر کے شہروز کو پک کیا اور اب دونوں اسپتال چھانتے پھر رہے تھے۔

پوری رات گزر گئی۔

بڑی قیامت کی رات تھی۔

ماموں' ممانی اور ارمغان کو اس بات کی اطلاع پہنچ گئی تھی کہ کل سے لڑکی غائب ہے۔

"یہ سب آپ لوگوں کی سازش ہے۔ جان بوجھ کر اسے چھپایا ہے۔" ارمغان نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

وہ بہت جارحانہ موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ آتے ہی اس نے بے وجہ برس برس کر چلانا شروع کر دیا تھا۔ ضیاء صاحب صبر کے گھونٹ پی کر اس کی لن ترانیوں کے جواب میں خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی بے بسی قابل دید تھی۔

"آپ لوگوں نے مجھے ذلیل کرنے، میرے خاندان کا نام بدنام کرنے اور ہمارے سے جان چھڑانے کے لیے لڑکی کو کہیں بھجوا دیا ہے۔"

وہ شعلہ بار نظروں سے ضیاء صاحب کو گھورنے لگا۔

"ہوش تو ٹھکانے ہیں میاں صاحبزادے!" ضیاء صاحب چپ رہے مگر ان کی جگہ سجاد صاحب بول پڑے تھے۔ ان کی ساری فیملی ضیاء صاحب کے گھر پر جمع تھی۔ تائی جان، ننھیال، ماما، سب ارسلہ اور ضیاء صاحب کی تسلی و تشفی کر رہے تھے اور ان کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ روبی تو دو دن کے لیے صوبائی سطح پر کھیلے جانے والے کالج کے کسی میچ کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا، البتہ اسد موجود تھا مگر اس کا چہرہ، لہجہ اور انداز کسی قسم کی ہمدردی اور اپنائیت سے مبرا تھا۔

"یہ سب آپ کا قصور ہے چچا جان! بیٹیوں کو بے لگام اور بے مہار کھلا چھوڑنے کا نتیجہ دیکھ لیا آپ نے۔ کسی کام نہ آئی آپ کی یہ "لبرل" سوچ۔ بہت مان اور غرور تھا ناں آپ کو اپنی بیٹیوں پر۔" اسد نے کسی کا لحاظ رکھے بغیر کہا۔

ادھر ارمغان نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔

"مجھے ہر قیمت پر روشان چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔" وہ روشان کے کمرے کے چپے چپے کا جائزہ لے رہا تھا گویا اسے اچانک کہیں سے برآمد کر لے گا۔

"ہم نے تو اپنی مری ہوئی بہن کے پیچھے پیچھے رشتہ جوڑا تھا۔ کیا خبر تھی اندر ہی اندر اور ہی گل کھلائے جا رہے ہوں گے۔" رضوان نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"شرم کریں آپ، غائب ہونے والی لڑکی آپ کی بھی کچھ لگتی ہے۔ کم از کم سگی بھانجی کا رشتہ تو

تھا۔ اسی کا خیال کر لیجیے۔" ارسلہ روہانسی سی تھی۔ ساری رات کی خواری کے بعد وہ یوں بھی بہت نڈھال ہو رہی تھی۔

"تایا جی! کسی طرح ان لوگوں کو تو نکالیں یہاں سے۔ یہ تو بولے ہی چلے جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے پپا کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے ان کی حرکتوں سے۔" ارسلہ نے موقع پا کر تایا سجاد سے بات کی تھی۔ تایا جی نے طریقے سے انہیں ٹالا۔

"اب وہ آ بھی گئی تو کیا حاصل۔ رات تو پوری گزر گئی۔ اعتبار تو بس ایک ہی بار کا ہوتا ہے۔ اب آئے بھی تو اسے سنبھال کے اپنے پاس ہی رکھیے گا، ہماری پہلے ہی بہت بدنامی ہو چکی ہے۔ اب کس منہ سے لوگوں سے کہتے پھریں گے کہ جو شادی کارڈ آپ کو دیا گیا تھا، اس کو کینسل سمجھ لیجیے۔" ممانی اور ماموں بہت جل بھن کر تبصرہ کر رہے تھے۔ "دلہن صاحبہ گھر سے غائب ہیں۔"

وہ لوگ گھر چلے گئے، دو گھنٹے بعد ان کا فون آیا۔

"ہم نے جن لوگوں کو کارڈ دیے تھے، ان سے معذرت کر دی ہے کہ کسی وجہ سے فی الحال یہ شادی ملتوی کر رہے ہیں۔"

"اوہ۔" ضیاء صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ جو ایک امید تھی کہ کہیں سے معجزہ ظہور پذیر ہو جائے گا اور وہ اس ذلت سے بچ جائیں گے، وہ خاک میں مل گئی۔

انہیں بھی —— ہوٹل میں ہال کی بکنگ کینسل کرانا پڑی جو کہ بڑی مشکل سے ملی تھی۔

دوپہر کو ارمغان نے پھر چکر لگایا۔ اب کے اس کا رد عمل بہت سنجیدہ تھا۔

"کچھ پتا چلا؟"

"نہیں۔" ارسلہ کا چہرہ مایوسی و پریشانی کا اشتہار بنا ہوا تھا۔

"گھر والے کچھ بھی کہیں پھوپھا جان! روشان مل جائے تو میں آج بھی اس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

پھر ضیاء کے چہرے پر ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔ پہلی بار انہیں اس لڑکے کے خلوص پر یقین آیا تھا۔ وہ کتنا اعلا ظرف تھا۔

"لیکن تمہارے والدین۔"

"انہیں میں منا لوں گا، کسی نہ کسی طرح راضی کر لوں گا۔ ایک بار وہ ملے تو سہی۔" وہ ہاتھ مل رہا تھا۔ "میں دنیا کی باتیں سن لوں گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہیں گے ناں کہ بھاگی ہوئی لڑکی سے شادی کی ہے۔ جانے کہاں کہاں سے اور کن کن مراحل سے گزر کر واپس گھر پہنچی ہے لیکن کوئی بات نہیں، وہ میری عزت ہے اور میں ہر قیمت پر اسے اپناؤں گا۔ پتا نہیں اس جیسی سمجھ دار لڑکی نے اتنی نادانی کیوں کی۔"

"سارے ہسپتال، سارے ادارے، ہر سڑک کھنگال ماری ہے۔ جانے کہاں چلی گئی وہ۔" ضیاء صاحب کی آواز میں گہری اذیت تھی۔

"ایک حل ہے میرے پاس، ادھر پنڈی میں ڈبل روڈ پر کوئی بزرگ رہتے ہیں۔ سنا ہے، وہ لوگوں کے مسائل اور پریشانیوں کا فوری حل بتاتے ہیں اور اس پریشانی کی بنیادی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ان کے پاس چلتے ہیں، شاید وہ ہماری مدد کر سکیں۔"

"میں ان ذریعوں پر یقین نہیں کرتا لیکن چلو، چل کے دیکھ لیتے ہیں۔" ضیاء صاحب اس پیری فقیری کے بہت خلاف رہے تھے مگر اس وقت بیٹی کے گھر سے غائب ہونے کا دکھ اس درجہ حاوی تھا کہ سب فراموش کر بیٹھے تھے۔

ارسلہ نے روتے ہوئے دل سے ان کی طرف دیکھا۔

اس کے اتنے پر وقار، اتنے بارعب پپا اس وقت لاچاری و بے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ان کی ذہنی حالت بہت ردی ہو رہی تھی۔

ارسلہ ہی ڈرائیو کر رہی تھی، وہ جھکے کندھوں، ستے ہوئے چہرے اور بے خواب اذیت بھری آنکھوں سمیت اگلی سیٹ پر بیٹھے جانے کس آس پر بے کلی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ارمغان پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

عجیب و غریب، تاریک بل کھاتی گلیاں عبور کر کے وہ عجیب سے بوسیدہ قسم کے مکان میں پہنچے تھے۔

یہاں پہنچ کر مزید گھٹن اور اذیت کا احساس بڑھ گیا۔ پچاس روپے فیس دے کر وہ لوگ لمبی قطار میں لگ کے انتظار کرنے لگے جو شاید گھنٹوں تک محیط تھا۔

"تو اگر یہ بزرگ کوئی کرشمہ ساز ہوتے تو خود اپنی حالت نہ سنوار لی ہوتی۔ اس پرانی دھرانی گھٹن زدہ جگہ پر رہائش پذیر ہونے کے بجائے کسی اچھی جگہ پر نہ ہوتے۔ انسان کے پاس کچھ ہو تو سب سے پہلے وہ اپنی ذات پر لگاتا ہے، اپنے لیے خرچ کرتا ہے پھر خدمت خلق کی طرف آتا ہے۔" ڈیڑھ گھنٹے بعد باری آئی۔

بزرگ عربی زبان میں لکھے ہوئے کچھ تعویذ دے کر استعمال کا طریقہ سمجھانے لگے۔ مزید توڑ کے لیے کل تشریف لانے اور پانچ سو روپے کا ایک عمل کرانے کی تاکید کی۔

"ان لوگوں کے چکروں میں نہیں آنا چاہیے پپا! اپنی جگہ خدا بن کے بیٹھے ہوتے ہیں۔ دیکھا تھا کیسے رعونت سے بات کر رہے تھے اور مسئلہ پورا سنا بھی نہیں تھا کہ ٹوک دیا۔ جیسے فائنٹ بھگتا رہے ہوں اور یہ کم فیس بھی دراصل دھوکا ہے۔ پچاس روپے غریب بھی با آسانی دے سکتے ہیں۔ پہلے یہ انہیں اپنے چنگل میں پھنساتے ہیں پھر جو پیسے والا ہو اسے آنے بہانے سے نچوڑنے لگتے ہیں اور جو غریب ہو اسے سو بہانوں میں ٹال دیتے ہیں، ان جگہوں پر تو بھی نہیں آنا چاہیے۔"

ارسلہ نے باہر آ کر پپا سے کہا۔

"میں کون سا خوشی سے آیا تھا بیٹی! بس پریشان دل ہی تو بھٹکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے اور ہمیں صرف اپنا بندہ بنا کر رکھے، حاجت روائی کے لیے وہ ایک در ہے ناں جہاں ہر کسی کی سنی جاتی ہے۔" ہم جیسے

گنہگاروں کی بھی۔" ضیاء صاحب کا لہجہ بھیگ گیا۔
ارمغان کو راستے میں ڈراپ کرکے دونوں باپ بیٹی گھر آرہے تھے کہ ارسلہ کے موبائل کی بیل بجی۔

"میں نے ریسکیو ون فائیو پر اطلاع دے دی ہے۔"

"ارے، پولیس تک بات نہیں پہنچانی تھی۔" ارسلہ تو بوکھلا اٹھی۔

"بے فکر رہو کوئی تحریری ریکارڈ نہیں ہوگا اس قصے کا۔ وہاں ایک انسپکٹر میرا واقف کار ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ یہ ایک پرسنل معاملہ ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟"

"پاپا کے ساتھ کہیں نکلی ہوئی ہوں، گھر پہنچ کر تمہیں کال کروں گی۔" اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔

"کون تھا؟"

"پاپا! شہوز تھا۔ اس کا کوئی گہرا دوست پولیس میں ہے اور اس نے یقین دلایا ہے کہ پولیس کے ریکارڈ پر آپ کا یا میرا کوئی حوالہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنے طور پر لڑکی کی تلاش جاری رکھیں گے اور سراغ ملتے ہی اطلاع دیں گے۔"

"پولیس...؟" میجر ضیاء کا سانس رکنے لگا۔ "یہ تو میں بھی کرسکتا تھا مگر میں تھانے کچہری کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"آپ بے فکر رہیے پاپا! یوں سمجھ لیجیے۔ گھر کی بات ہے۔ اگر انہوں نے بازیاب کرائی تو کبھی بھول کر بھی کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ پولیس گھر پر نہیں آئے گی۔ وہ صرف شہوز سے رابطے میں رہے گی۔ کچھ بھی آن ریکارڈ نہیں ہوگا۔" ارسلہ نے تسلی دی۔

"میری محبت اس قابل تو نہیں تھی روشان بیٹے! کہ تم اتنی بری طرح ہوتا مارتیں۔" ایک آنسو بند آنکھوں سے لڑھک کر گال پہ سفر کرتا ہوا ٹھوڑی کے پاس آکر گم ہوگیا تھا۔

گاڑی چلاتی ارسلہ نے ایک نظر باپ پر ڈالی...

گہرا شاک لگا۔ دل سے شعلے سے اٹھنے لگے۔ "ہائے روشان یہ کیا قیامت ڈھائی ہے تم نے۔"

فولادی اعصاب کے مالک، اس پیار لٹانے والے وسیع القلب انسان کو کس بے دردی سے کانٹوں پر گھسیٹ ڈالا ہے۔

شہوز کل سے اب تک مسلسل اس سے رابطے میں رہا تھا۔

کل تو وہ اس کے ساتھ پورے اسلام آباد پنڈی میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ آج پولیس سے خفیہ مدد لے رہا تھا۔ شام ہوگئی۔ کل مہندی تھی اور پرسوں رخصتی۔

ارسلہ نے مہندی کے لیے گھر کا لاؤنج کتنا شاندار قسم کا تیار کرایا تھا۔ یہ بہت بڑا ہال نما ایریا تھا جہاں سے فرنیچر ہٹا کر لڑکیوں کے بیٹھنے کا بڑا اچھا انتظام کردیا گیا تھا۔ ایک سائیڈ پر اسٹیج بنایا گیا تھا۔ دو روایتی قدیم کرسیوں کو مصنوعی پھولوں اور آرائشی لڑیوں سے بے حد خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر بھی آرائش کی گئی تھی۔ بے شمار چمکتی لڑیاں، غبارے، چمکتی پنیوں سے بنے پھول ستارے اور جانے کیا کیا کچھ۔

روشان کے لیے مہندی کا سوٹ اس نے خود ڈیزائن کیا تھا۔ ہرا گوٹا، دوپٹے کے پلوؤں پر ہرے موتی اور کانچ کی چوڑیوں کا انوکھا امتزاج۔

پاپا اس کی فرمائش پر تین دن پہلے سے ڈھولکی لے آئے تھے۔ فریج بے شمار قسم کے اسنیکس سے بھرا ہوا تھا۔ روشان، نہناں اور ارسلہ کی سہیلیاں آتیں، گانے گاتیں، کیک، مٹھائیوں اور سینڈوچز کے علاوہ ڈرائی فروٹ اور نمکو وغیرہ سے شغل فرماتیں اور رات کا کھانا کھا کے واپس جاتی تھیں۔

ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں اور اب کل سے جیسے موت کا سا سکوت طاری تھا۔

ارسلہ نے نہناں کو فون پر بٹھایا ہوا تھا۔ وہ سہیلیوں اور رشتہ دار لڑکیوں کے آنے والے فون اور ان کی آمد پر کسی ایمرجنسی کا بہانا کرکے انہیں مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔

... رشتہ داروں اور میل ملاپ

کے لوگوں میں بدنام ہوگئے ہیں۔ نہ نہ کرتے ہوئے بھی سب کو پتا چل گیا ہے۔"

تائی اماں فکرمندی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ ابھی ابھی نہناں کے ہمراہ آئی تھیں۔ تایا سجاد پاپا کے کمرے میں جانے کون سی تجویز لے کر گئے تھے۔ سوائے اسد کے وہ پوری فیملی ان کی پریشانی میں برابر کی شریک تھی۔

"اب کیا ہوسکتا ہے تائی اماں! ایسا تو ہونا ہی تھا۔ کب تک چھپا سکتے ہیں ہم اس گمشدگی کو۔" وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"ارے نہناں! یہ ٹرے کیا ہاتھ میں ہی پکڑے رہوگی۔ رکھو ادھر میز پر اور اپنے چچا اور ارسلہ کے لیے کھانا نکالو۔ کل سے کچھ نہیں کھایا پیا۔" انہوں نے لوازمات سے سجی ٹرے ہاتھ میں تھامے نہناں کو ٹہوکا دیا تھا۔

فون کی بیل پھر بجی تھی۔ نہناں نے ارسلہ کے اشارے پر ٹرے رکھ کر کونے میں جاکر فون سنا پھر اس کے پاس آگئی۔

"آپ کے آفس سے فون ہے ارسلہ!"

"جی۔" وہ مارے باندھے فون تک آئی۔

"ارسلہ! میں ہوں، شہوز۔" وہ رسان سے گویا ہوا۔ "کیسی طبیعت ہے انکل کی اور تمہاری۔ کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح اس کے لیے فکرمند تھا۔

"ابھی تائی اماں کھانا لائی ہیں، نہناں نکال رہی ہے، کچھ نہ کچھ لے ہی لوں گی۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"اوہو، سسرال والوں کی جانب سے خدمتیں ہورہی ہیں بہت خوب۔"

"اس وقت تو کوئی بات بھی خوش نہیں کررہی شہوز۔" وہ ٹوٹ سی گئی۔

"اونہوں، ہمت نہیں ہارتے۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ دنیا کی کوئی ایسی پریشانی نہیں ہے جس کو دور نہ کیا جاسکے۔ ریسکیو ون فائیو والے اپنا کام کررہے ہیں۔ اچھا اب کام کی بات سنو، میں نے کل مختلف اداروں میں اپنا نمبر لکھوایا تھا۔" احتیاط و عزت کے پیش نظر ضیاء صاحب کا نمبر نہیں لکھوایا گیا تھا۔

"ہاں... ہاں... وہاں سے کوئی رسپانس آیا؟" وہ بے صبر ہوگئی۔

"ادارہ فیض الاسلام کی ایک شاخ ہے دارالامان۔ کھنہ پل کے پاس۔ انہیں کل ایک بیس بائیس سالہ دوشیزہ ملی ہے۔ وہ سر کی چوٹ کی وجہ سے بے ہوش ہے۔ اس نے نیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ گورا رنگ ہے اور براؤن گھنگھریالے بال ہیں۔ گلے میں ایک چین بھی ہے۔" وہ مزید بھی کچھ بتا رہا تھا مگر ارسلہ سے رہا نہ گیا۔

"ہاں... ہاں... یہی حلیہ ہے۔ یقیناً روشان ہی ہوگی۔ تم مجھے وہاں لے چلو، میں گاڑی لے کر نکلتی ہوں۔ تمہیں آفس سے پک کرلوں گی۔ اپنی آلٹو وہیں چھوڑ دینا۔" وہ بے قرار ہوگئی۔

"ایک منٹ، میں آفس میں نہیں ہوں اپنے گھر پر ہوں۔ آئی ایٹ فور کے فلیٹ نمبر بارہ بلاک بی میں۔ تم کہو تو میں تمہیں تمہارے گھر سے پک کرلیتا ہوں۔"

"نہیں، شاید یہ مناسب نہ لگے۔ پاپا تو تمہارے بارے میں اچھی طرح آگاہ ہیں کہ میں باہر کے ہر طرح کے معاملات ان سے شیئر کرتی ہوں مگر شاید اسد کو یہ اچھا نہ لگے۔ میں خود آرہی ہوں۔"

وہ اڑتی ہوئی مطلوبہ جگہ پر پہنچی تھی مگر اس لڑکی کو دیکھ کر اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

"یہ روشان نہیں ہے۔" وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے واپس آئی تھی۔ شہوز کو واپس ڈراپ کرکے وہ گھر آئی تو اس کے قدم دہلیز پر ہی جم گئے۔

اڑی ہوئی رنگت، بکھرے براؤن بالوں اور ملگجے کپڑوں میں ملبوس بے اوسان سی، بے آنسو بہاتی روشان سامنے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ تائی اماں اور نہناں اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ تایا جان ایک کرسی کی پشت پکڑے کھڑے تھے۔ اسد ٹیبل کا کنارہ تھامے بری طرح روشان کو گھور رہا تھا اور پاپا

گرنے کے سے انداز میں دوسرے صوفے پر بیٹھے تھے۔

"یہ کیا طریقہ تھا پریشان کرنے کا بیٹی!" تائی اماں اس کے بال سنوارتے ہوئے خفگی سے پوچھنے لگیں۔

"ممی مجھے کسی نے اغوا کر لیا تھا۔" وہ سر جھکائے آنسو بہاتی ہچکیوں میں بتا رہی تھی۔ "میں پارلر جانے کے لیے نکلی تھی کہ مین روڈ پر ایک گاڑی رکی، دوسرے ہی لمحے وہ مجھے رومال سنگھا کر بے ہوش کر کے اٹھا لے گئے۔"

"کہاں لے کر گئے تھے تمہیں۔" ارسلہ نے ٹوٹتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"پتا نہیں پاپا! وہ ایک بند کمرہ تھا، کل شام سے آج شام تک وہیں بند رکھا پھر جانے کیا سوچ کر مجھے چھوڑ دیا مگر لے جانے سے پہلے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ گھر کے پاس آ کر پٹی کھولی ہے۔ آئی سوئیر پاپا! انہوں نے مجھے "کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"میں تو یقین کر لوں گا بیٹا کہ میری مجبوری ہے۔ میں ایک باپ ہوں مگر تم ان لوگوں کو کیسے یقین دلاؤ گی جن کے ساتھ عمر گزارنی ہے۔" پاپا دل گیر لہجے میں بولے۔

"وہ بھی یقین کر لیں گے۔ ارمغان انہیں سمجھا لے گا۔"

"مگر ارمغان کو کون سمجھائے گا۔" ارسلہ افسردگی سے اس کے پاس بیٹھ گئی اور کمر تھپتھپائی۔ اسے اپنے باپ کے حوصلے پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ کوئی روایتی باپ ہوتا تو بنا صورت حال جانے بیٹی کو مورودِ الزام ٹھہرا کر برا بھلا کہتا۔

ارمغان اور اس کی فیملی کو اطلاع دی گئی۔ پاپا خود گئے تھے۔

ارمغان تو ابھی بھی اسے اپنانے کو تیار تھا مگر ماموں ممانی بہت شور کر رہے تھے۔

"ہم کیسے سارے جہان کی کالک اپنے منہ پر مل لیں۔ ساری دنیا کو خبر ہے۔ سب ہم پر تھو تھو کر رہے ہیں۔ وہ دن باہر گزار کے آئی ہے۔ ہم کس سے سرٹیفکیٹ "لیں پاکیزگی کا۔ کیا خبر کیا کچھ بیتا ہے اس پر۔"

اب یہ حال تھا کہ پاپا مغلوب تھے اور وہ غالب۔ جانتے تھے اگر ان لوگوں نے نہ قبولا تو روشان ساری عمر یونہی گھر بیٹھی رہ جائے گی۔ ایک دنیا جان گئی تھی۔ گھر گھر رسوائی کی داستان پھیل گئی تھی۔ کون تھا جو آنکھوں دیکھی مکھی نگلتا۔

انہوں نے تایا جان کو بیچ میں ڈالا۔ وہ تین دن تک وہ ماموں ممانی کے گھر کے چکر لگاتے رہے۔ تایا جی نے مقدور بھر کوشش کی معاملہ سلجھانے کی۔ بالآخر بہت سی تاویلوں، وعدوں اور فرمائشوں کے بعد بادل نخواستہ وہ اس "رسوائی" کو بیاہنے اور گھر لانے پر مجبور ہو گئے۔

"آپ کا کیا جائے گا" آپ تو گھر سے رخصت کر کے ہمارے متھے ماریں گے۔ بھگتنا تو ہمیں پڑے گا ساری عمر۔ بھاگی ہوئی لڑکی کو گھر میں بسانا کسی کسی کا ہی جگرا ہوا کرتا ہے۔ یہ ہمارا ہی ظرف ہے جو رشتے کا لحاظ کر کے آپ کی بیٹی کو قبول کر رہے ہیں، کوئی غیر ہوتا تو۔۔۔ اور آپ نے تو ہمیں شروع سے ہی کمتر اور حقیر جانا۔ ہم سے رشتہ داری نبھانا اپنی توہین سمجھا تھا۔ آپ دیکھ لیں، کون کام آیا ہے اس صورت حال میں۔" واقعی پاپا قائل سے ہو گئے۔ (گھائل تو پہلے ہی تھے۔)

"اب ارمغان کے مستقبل کے لیے کچھ کریں۔ آپ کی بیٹی تو ہم نے نپٹا دی۔" ماموں دو ٹوک بات کر رہے تھے۔

"اسے کہیں سیٹ کرا دیں اور پانچ دس مرلے کا پلاٹ دلوا دیں۔ کل کلاں کو اپنا گھر بنانا ہو گا تو اسلام آباد پنڈی میں کوئی پلاٹ تو ہو گا نا بلکہ ایسا کیوں نہیں کرتے، آپ کو حکومت کی طرف سے چکلالہ میں دو اپارٹمنٹ ملے ہیں، ایک روشان کو جہیز میں دے دیں۔ جہیز کا سامان وہیں سیٹ کرا دیں۔ سلامی میں گاڑی مل جائے گی۔ یوں دونوں چکلالہ سے ہمیں ملنے آرام سے آتے جاتے رہا کریں گے۔ وہیں پر جو آپ نے اپنے بنس کی ایک برانچ کھولی ہے، اس میں ارمغان کو جاب دلوا دیں۔" ماموں نے تجویز دی۔

"ٹھیک ہے۔" پاپا نے خاموشی سے سارے مطالبات مان لیے۔ جن باپوں کو بیٹیوں کی وجہ سے ہارنا پڑے، وہ اسی طرح سرنگوں ہو جاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼
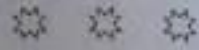
"سجاد بھائی! میں چاہتا ہوں، اب ارسلہ کو بھی رخصت کر دوں۔" روشان کی شادی کے صرف دو ہفتے بعد ضیاء صاحب از خود چل کے تایا سجاد کے پاس گئے تھے۔

"تمہاری خواہش سر آنکھوں پر ضیاء! بلکہ یہ فرمائش تو اصولاً" ہماری طرف سے ہونی چاہیے تھی مگر۔۔۔" وہ چپ ہو گئے اور ضیاء صاحب کے دل کی دھڑکن رک گئی۔

"اسد قابو میں نہیں آ رہا در اصل۔" سجاد صاحب نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ "وہ پہلے بھی کافی معترض تھا مگر اب روشان والے واقعے کے بعد۔ اچھا ایسا کرو، ارسلہ بیٹی کی جاب چھڑوا دو کچھ عرصے کے لیے۔ شاید اسد کو یقین آ جائے اور اس کے اعتراضات اور شکوک دور ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ضیاء صاحب خاموشی سے اٹھ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہمیں آپ کی سیٹنگ بہت پسند آئی ہے مس۔ صرف دو ماہ کے عرصے میں آپ نے پورے گھر کا نقشہ بدل دیا ہے اور ہمارا کمرہ تو بہت ہی اچھا سجایا ہے۔ لاؤنج، گیسٹ روم، پاپا کا بیڈ روم، فریدوں کا اسٹڈی روم۔"

پنک اونی جرسی نما شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں تانیہ شرقی نقوش، مشرقی رکھ رکھاؤ، مغربی لباس اور مغربی لب و لہجے کے ساتھ بڑا دلچسپ تاثر دے رہی تھی۔

"اچھا۔" ارسلہ مسکرائی۔

"مجھے بھی بہت اچھا لگا آپ کے ہاں آنا۔ آپ کے مینرز، آپ کی پیاری پیاری باتیں، میں واقعی بہت مس کروں گی۔"

اسے سچ مچ یہ بچے بہت عزیز ہو گئے تھے۔ بڑی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

"مس! کیا آپ دوبارہ نہیں آئیں گی؟" عانیہ پریشان نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آپ کے فادر کا سائن کیا ہوا پروجیکٹ کمپلیٹ ہو گیا ہے، میرا کام ختم ہو گیا ہے اب کیا کرنے آؤں گی۔" وہ مسکرائی۔ بچوں کے چہرے پر مایوسی پھیلنے لگی۔

"ایسا کرو، میرا موبائل نمبر لکھ لو۔ جب جی چاہے بات کر لیا کرنا بلکہ میرا ایڈریس بھی لے لو۔ آپ لوگ کبھی چکر لگانا۔ یہ بتاؤ" آپ کی ماما کی واپسی کا کیا بنا؟"

"کچھ نہیں، پاپا کہہ رہے تھے، وہ شاید مزید کچھ ماہ تک نہ آسکیں۔" جانے ارسلہ کے دل میں کیا آئی، وہ بچوں کو ٹال کے کچن میں مصروف عمل اماں کے پاس پہنچ گئی۔

"اماں! آج میرا آخری دن ہے، آج تو یہ معمہ حل کر ہی دیں۔ بچوں کی ماں کہاں ہے، وہ صرف ایک ہفتہ پاکستان رہ کر کیوں واپس چلی گئیں۔ آخر وہ کیا راز ہے جو بچوں سے چھپایا جا رہا ہے؟ یقیناً آپ جانتی ہوں گی۔ مجھے پتا ہے سفیان صاحب گھریلو معاملات میں آپ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔"

"بیٹی! در اصل بی بی کو کینسر ہے۔ آخری اسٹیج پر ہے۔ صاحب ان دنوں کینیڈا گئے ہوئے ہیں۔ بچوں سے تو بزنس ٹرپ کا بہانہ کیا ہے لیکن اصل میں وہ علاج کے لیے مزید رقم لے کر بیوی کے پاس گئے ہیں، اسی لیے اوپر والے پورشن کی فی الحال سیٹنگ نہیں کرائی۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح بی بی کو آرام آ جائے۔ بی بی وہاں علاج کے لیے رہتی ہیں اور اب پچھلے ایک ماہ سے مسلسل ہسپتال میں داخل ہیں۔ ان کے ڈاکٹر نے فون کر کے انہیں کینیڈا بلوایا ہے کہ اب چل چلاؤ ہے۔ بس جو چند دنوں کی سانسیں رہ گئی ہیں، وہ اپنے گھر والے کے ساتھ گزارنا چاہتی

ہیں۔"

"تھوہائی گلا۔" ارسلہ کے سر پر چھت آ رہی۔

اور جو سال بچے اپنی ماں کے لیے کمرہ سجائے‘ ان کی پسند کے کپڑے خریدنے‘ انہیں نئے گھر کی خوبصورت ڈیکوریشن اور سیٹنگ دکھانے کو بے چین تھے اور طرح طرح کے منصوبے بنا رہے تھے وہ۔

بچوں پر ہونے والے تقدیر کے کاری وار نے ارسلہ کا دل بھی چھید دیا تھا۔

"اللہ اپنا رحم کرے۔" وہ کچھ دیر تک بیٹھ کر آ گئی تھی مگر اس کا دل مسلسل کسی گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔

گھر آ کر ایک نئی خبر یا حکم اس کا منتظر تھا۔

"ارسلہ! تم کل آفس سے ریزائن کر دو بہت ہو گئی جاب۔ اب کچھ عرصہ گھر بیٹھو پھر میں تمہاری شادی کروں گا۔"

پاپا کے حکم پر وہ لب بستہ کھڑی رہ گئی تھی۔

یہ بھی نہ کہہ سکی کہ پاپا کس کیے کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔ اس نے آفس جانے کے بجائے فون پر ہی شہروز کو ساری صورت حال بتا کر اپنی طرف سے ریزائن ٹائپ کرا کے میڈم کو دینے کی تاکید کر دی تھی۔

* * *

"بیٹے! اب تو وہ ملازمت چھوڑ چکی ہے۔"

"کچھ بھی ہو‘ میں کسی قیمت پر اس سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ پہلے بھی مجھے کبھی پسند نہیں رہی تھی اور اب تو اس کی بہن کے عظیم ترین کارنامے کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اسد پر تایا اور تائی کی وضاحتوں‘ منتوں بلکہ دھمکیوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کسی صورت اس رشتے کو برقرار رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ مجبوراً تایا سجاد کو ضیا صاحب کو صورت حال بتا کر معذرت کرنا پڑی۔

ان کے جھکے ہوئے کندھے مزید جھک گئے۔ ٹوٹا ہوا حوصلہ مزید ٹوٹ گیا۔ کم کم بات کرنے والی عادت مستقل خاموشی میں بدل گئی۔

ارسلہ نے بغیر کسی احتجاج یا اعتراض کے ان کا جاب چھوڑنے کا فیصلہ مان لیا تھا مگر اب اسے بے مقصد انداز میں گھر میں ادھر ادھر بولائے پھرتے دیکھتے تو مزید دل برداشتہ ہو جاتے تھے۔

* * *

"مس! پاپا آپ سے اوپر والا پورشن بھی ڈیکوریٹ کروانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے آپ کے آفس فون کیا تھا۔" تابندہ کا فون آیا تھا۔

"بیٹے! اب میں یہ کام چھوڑ چکی ہوں‘ ریزائن کر چکی ہوں۔ تم بتاؤ‘ اپنی ماما کے چالیسویں پر کتنے سپارے پڑھے تھے۔"

"دو سپارے۔ عانیہ نے ایک پڑھا تھا اور فریدوں نے پہلا سپارہ۔" ان کی ماں کے انتقال کو دو ماہ گزر چکے تھے۔ بچے یا وہ خود انہیں فون کرتی رہتی تھی۔ بچوں کو بالآخر اس المیے کی خبر ہو گئی تھی۔ تدفین پاکستان میں ہوئی تھی۔

موبائل فون آف کر کے وہ پلٹی تو روشان کھلے دروازے سے اندر آ چکی تھی۔

"آؤ روشان! کیسے آنا ہوا؟" اس نے خوش دلی سے استقبال کیا۔ مخلص تو وہ آج بھی اس سے اسی طرح تھی مگر دونوں کے بیچ ایک نامحسوس سا فاصلہ‘ تکلف اور گریز آ چکا تھا۔

"میری نیہاں سے بات ہوئی تھی فون پر۔ وہ بتا رہی تھی‘ اسد بھائی نے منگنی توڑ دی ہے جبکہ پاپا آپ کو جاب چھڑوا کر گھر بٹھا چکے ہیں۔ میری وجہ سے ہوا ناں یہ سب کچھ۔"

"تمہاری وجہ سے نہیں‘ قسمت کی وجہ سے۔" وہ تحمل سے مسکرائی۔

"اور اسد بھائی تو یوں بھی مجھے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں تو بہانہ چاہیے تھا۔ رہی جاب کی بات تو سچی بات ہے‘ اب میں خود بھی اس بھاگ دوڑ سے تھک چکی تھی۔ پاپا نہ بھی کہتے تو چھوڑ دیتی۔"

"نہیں۔" وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔

"اس سب کی ذمہ دار میں ہوں‘ میری کم ظرفی‘ میرا خود غرضانہ رویہ‘ میری ذلیل اور بیچ حرکت۔ اف۔ میں کیوں اتنی اندھی ہو گئی تھی۔ پاپا اور آپ اتنے عالی ظرف نکلے‘ میرے جھوٹ کو بھی نبھاتے رہے‘ ان کی تذلیل آمیز حرکتیں اور باتیں برداشت کرتے رہے اور میں نے ان کے بہکاوے میں آ کر۔" اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شاید احساس جرم کے بوجھ سے پھٹنے پر آ گئی تھی۔

"میں کہیں نہیں گئی تھی‘ کسی نے مجھے اغوا نہیں کیا تھا۔ میں ماموں کے گھر پر تھی اس دن۔ ان کے کہنے پر یہ ڈرامہ رچایا تھا۔" ارسلہ کے اعصاب پر جیسے کوئی بم پھٹ گیا تھا۔

اس کی نہایت بے یقین نظریں اور ہوائیاں اڑتے چہرے کے تاثرات سوال کر رہے تھے۔ "مگر کیوں؟"

"ماموں‘ ممانی کا خیال تھا کہ پاپا مارے باندھے میری ضد کی وجہ سے ارمغان سے رشتہ کرنے پر راضی تو ہو گئے ہیں مگر ساری عمر اسے اور ماموں ممانی کو وہ عزت و قدر دانی نہیں ملے گی جو بیٹی کے شوہر اور سسرالیوں کو میکے سے ملا کرتی ہے۔ ارمغان ہمیشہ ان کا نمبر دو داماد رہے گا۔ پاپا سیدھے منہ بات کرنا گوارا نہیں کیا کریں گے۔ وہ دل سے اس رشتے کو قبول نہیں کر رہے۔ کچھ ایسا کیا جائے کہ وہ از خود خوشی خوشی اس بندھن کو جوڑنے کی خواہش کریں اور اسے قائم رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ اگر میں ایک آدھ دن کے لیے غائب ہو جاؤں گی اور پھر بازیاب ہوں گی تو ان کے دل میں قدر ہو گی کہ دیکھا ماموں‘ ممانی اور ارمغان ہمارے ساتھ کتنے مخلص ہیں۔ اس حال میں بھی لڑکی کو قبولنے پر رضامند ہیں۔ اس طرح پاپا دل سے ان کی فیملی کو مقام اور محبت دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

وہ بول رہی تھی اور ارسلہ سانس روکے سن رہی تھی۔

"مجھ پر جانے کون سا کمینہ‘ خود غرض لمحہ حملہ آور ہوا تھا کہ میں نے ان کی بات مان لی۔ یہ تو شادی کے وقت کھلا کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔ مقام اور محبت نہیں بلکہ مال و دولت اور آسائشوں کے حصول کے لیے یہ گھٹیا حربہ اپنایا گیا۔ اس طرح ایک تو پاپا کو نیچا دکھانے کا موقع مل گیا کہ ہم تمہاری بھاگی ہوئی بدنام لڑکی کو گھر میں بسا رہے ہیں اور دوسرا بے دھڑک فرمائشیں منوانے اور خوب پیسہ بٹورنے کا موقع ہاتھ لگ گیا جو کہ ان کا اصل مقصد تھا جس سے میں انجان رہی تھی۔ ماموں ممانی میرے ساتھ اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ ارمغان نے یہ اپارٹمنٹ ماموں کے نام کروا دیا ہے۔ گاڑی ارمغان کے نام ہے۔ پاپا کے آفس میں مفت کی کھا رہا ہے۔ بیٹھ کے نکما بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہے یا کبھی موڈ ہو تو سرے سے آفس ہی نہیں جاتا۔ مجھ پر بھی احسان کہ میں تو تمہارے باپ کے ہاں ملازموں کی طرح کام کرتا ہوں۔ تنگ آ کر پاپا نے اسے ملازمت سے نکالنے کو کہا ہے۔ ماموں ممانی مفت کی روٹیوں پر عیش کر رہے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے اتنا لگژری اپارٹمنٹ نام ہو گیا۔ اس سے پہلے پنڈی کی تنگ گلیوں میں کرایے کے دو کمروں میں رلتے تھے۔" وہ تلخی سے گویا تھی۔

"اب ایک مہربانی کرنا۔ اصل صورت حال پاپا کو ہرگز مت بتانا۔ مجھے ڈر ہے کہ اصل صورت حال جان کر کہیں وہ صدمے سے پاگل نہ ہو جائیں۔ بہت بری بیٹی کی مثال پیش کی ہے میں نے یہ قدم اٹھا کر۔ اتنا مان دینے والے باپ کی عزت کو سڑک پر روند دیا۔"

ارسلہ حقیقت جان کر از حد برگشتہ دکھائی دے رہی تھی۔

* * *

"ویلکم ہوم۔" شہروز نے سیاہ پھولدار سوٹ میں ملبوس خوش باش سی ارسلہ کو دیکھ کر بے اختیار کرسی سے اٹھ کر شرارت کی تھی۔

"کسی مہربان کی فون کال پر پاپا کو اپنے فیصلے پر [illegible] انہوں نے فوراً مجھے آرڈر کر دیا۔ کل سے آفس

جوائن کرو۔ اپنا ریزائن واپس لے لو۔" وہ شوخی سے مسکرادی۔ وہ اس کی ٹیبل کے سامنے پڑی کرسی پر براجمان ہوچکی تھی۔

شہوز کے ایک ایک انداز سے زندگی کی ترنگ اور تازگی چھلک رہی تھی۔ اسی نے فون کرکے بڑے طریقے سلیقے سے ضیاء صاحب کو قائل کرکے ارسلہ کو دوبارہ آفس جوائن کرنے کی اجازت دلوائی تھی۔ ارسلہ سے تو وہ اس ایک ماہ کی "چھٹی" کے دوران مسلسل رابطے میں رہا تھا۔ ہر معاملے سے آگاہ تھا۔

"میں نے بالآخر انہیں قائل کرہی لیا کہ ایسے لوگوں کی خاطر جن کا اب ارسلہ کی زندگی میں کوئی رول بھی نہیں رہا ہے۔ آپ اس کا بہترین کیریئر کیوں تباہ کررہے ہیں۔ اتنا عرصہ قریب رہنے کے باوجود بھی اگر وہ شخص آپ کی بیٹی کی طبیعت کو نہیں سمجھ سکا' اس سے کمپرومائز نہیں کرسکا تو پھر اس کی رائے یا پسند ناپسند کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے۔ لازمی تو نہیں ہے کہ اگر ایک اولاد آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے تو آپ اس کی فرسٹریشن دوسری اولاد کے حقوق ضبط کرکے نکالیں۔ وہ سمجھ دار آدمی تھے۔ سمجھ گئے اور فوری طور پر عمل بھی کرڈالا جس کے ثبوت کے طور پر آج تم یہاں ہو۔"

"اچھا بھئی! مہربانی' شکریہ۔ اب یہ بتاؤ' کوئی نئی اسائمنٹ ہے یا نہیں؟"

"وہی' شاہ ہاؤس کی اپر اسٹوری کی ڈیکوریشن کرانی ہے۔ وہ پارٹی تمہارے علاوہ کسی دوسرے ڈیزائنر کو سائن کرانے پر آمادہ نہیں ہے۔ کیا بات ہے کوئی چکر ورکر تو نہیں ہے۔"

تقریباً" ایک ماہ بعد جب وہ اس اسائمنٹ سے فارغ ہوئی تو سفیان شاہ نے بڑی بردباری اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پروپوز کرڈالا۔

"ویسے تو مجھے یہ بات آپ کے فادر سے کہنی چاہیے تھی مگر چونکہ میرا پروپوزل ایک خاص قسم کا "بیک گراؤنڈ" رکھتا ہے' اس لیے پہلے آپ کی طرف سے سپورٹ درکار ہے۔ تین بچے ہیں میرے۔ میری عمر تقریباً" چھتیس سال ہے۔ کیا آپ میرے ساتھ زندگی بسر کرسکیں گی۔ میری خواہش ہے کہ مجھے اور میرے گھر کو آپ جیسی سلجھی ہوئی اور میچور لڑکی کا ساتھ ملے۔ آپ سوچ لیجیے گا اچھی طرح۔ اگر منظور ہو تو میری خوش بختی لیکن کسی بھی حالت میں میرے دل میں آپ کی عزت اور وقار میں کمی ہرگز نہیں ہوگی۔"

وہ بے حد سبھاؤ سے بڑے میچور انداز میں نرمی سے کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

وہ زمانے کی گردش پر غور کرتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت بری طرح بھڑکا تھا۔

ارسلہ نے تو یونہی بات کی تھی۔ سرسری سے انداز میں اس سے نئی سچویشن شیئر کی تھی جیسا کہ وہ ہمیشہ اس سے کرتی آئی تھی۔

"مجھے تمہارا غصہ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں نے تو تمہیں صرف ایک بات بتائی ہے کہ سفیان شاہ صاحب نے اپنا پروپوزل پاپا کے حضور پیش کیا ہے۔ پہلے انہوں نے مجھ سے اجازت مانگی تھی۔ میں نے سوچا' شادی تو مجھے کرنی ہی ہے پھر روشان کی حرکت کی وجہ سے ہماری فیملی کو جو بدنامی اٹھانی پڑی اس کے بعد اس قسم کا پروپوزل کوئی ابنارمل بات بھی نہیں۔ میں سمجھ نہیں پارہی' اس میں اتنا۔۔۔"

"ہر بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے مگر جو سامنے کی بات ہو' وہ سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ بری طرح چڑ گیا۔

ارسلہ حیران پریشان اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

"یہ ایسا کیوں ہورہا ہے؟"

"تمہیں کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا ہے' جاتے ہوئے موڈ کیوں آف کررہے ہو۔ ناراضی لے کر سفر نہیں کیا کرتے۔" اس نے اپنی طرف سے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"درد لے کر بھی سفر نہیں کیا کرتے۔" وہ اسے بری طرح گھور کر پیر پٹختا باہر نکل گیا تھا۔

"خوامخواہ ناراض ہوگیا ہے۔ لو بتاؤ' اب وہ دن ڈھلے لوٹے گا۔ اتنی دیر تک خوامخواہ ٹینشن میں مبتلا رہے گا اور مجھے بھی یہاں پریشان رکھے گا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنی سیٹ پر آئی۔ ایک کارڈ لفافے سمیت رکھا ہوا تھا۔

"ارے۔۔۔" ہیپی نیو ایئر کا کارڈ دیکھ کر اسے شہوز کی فلسفیانہ وابستگی پر بے ساختہ ناز ہونے لگا۔ ہر بار' ہر موقع پر وہ اسے یاد رکھتا تھا۔

"اچھا اس لیے کہہ رہا تھا کہ ابھی میری ٹیبل پر بیٹھو۔ جب میں نکل جاؤں' تب اپنی ٹیبل پر جانا۔ گویا کارڈ کا سرپرائز دینا تھا۔"

نہیں حیات کا حاصل سمجھ لیا ہے مگر
نہیں ہم اپنا بنالیں' یہ دسترس بھی نہیں

بہت عزیز دوست۔

برسوں سے دل پر حکمران ساتھی۔

دل میں چھپے اس بھید کو آج میں تم پر عیاں کرنا چاہتا ہوں تاکہ کل یکم جنوری کو تمہارے اقرار کے پھولوں سے اپنی بقیہ ساری عمر مہکالوں۔"

بہت سارے بیتے پل آگے پیچھے اس کی نظروں میں دوڑتے چلے گئے۔ وہ جانے کتنی دیر تک ان ہی میں گم رہی۔

وہ قدم قدم پر سایہ بن کے ساتھ رہنا۔

ہر لمحہ خیال' توجہ' احساس' اپنائیت۔

روشان والے معاملے میں دن رات اپنا ہوش بھلا کر کی جانے والی کوششیں۔ ہر موقع پر وہ بے ساختہ' بے اختیار اسی پر بھروسہ کرتی تھی' اسی کو بلاتی تھی۔

"اتنے برسوں سے گونگے کا گڑ کھاکے بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے کیوں نہیں پھوٹے منہ سے۔" اگلے ہی پل اس کے موبائل کا نمبر ملا کر اس سے جھگڑ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے بے وجہ اشک بہہ رہے تھے۔

"تم منگنی شدہ مجھ سے ملی تھیں' کسی کی امانت تھیں' میں کیا کہتا اور کیسے کہتا۔" وہ اسلام آباد سے باہر آچکا تھا اور ٹیکسلا کی طرف سفر کرتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ کم کرکے اس سے بات کررہا تھا۔

"اور اب اظہار کا ارادہ باندھ کے تمہارے پاس گیا تھا کہ تم نے نئی زنجیریں دکھادیں مجھے پہنانے کو۔"

"کوئی زنجیر نہیں ہے۔" وہ بے ساختہ رودی تھی۔

"اے خبردار' یہ آنسو میری امانت ہیں۔ خبردار جو انہیں اتنی بے دردی سے بہایا تو۔ میں ایک ایک اشک کا حساب لوں گا۔ فوراً" پونچھو انہیں' ورنہ میں خود پہنچ جاؤں گا یہ نیک فریضہ سرانجام دینے۔" وہ شرارت کے موڈ میں آچکا تھا۔

"کل آجاؤ گے؟" وہ آہستگی سے پوچھ رہی تھی۔ انداز میں عجب سی اپنائیت اور نئے رشتے کا اقرار گھلا ہوا تھا۔

"کیوں' کل کیا ہے؟"

"کل ہماری زندگی کا نیا نویلا سورج طلوع ہوگا۔" وہ مان سے بولی۔

"ہاں' کل تو لازمی ہے مگر تمہارے پاس نہیں' تمہارے پاپا کے پاس۔ اس التجا کے ساتھ کہ منظوری کے ساتھ ساتھ ایک ہفتے کے اندر نکاح بھی کردیں۔ بھئی اہم کی مہر لگائیں گے آپ کے اوپر۔ رات کو بارہ بجے ہیپی نیو ایئر کہنے کے لیے فون کروں گا' انتظار کرنا۔" اس نے سرگوشی کی۔

"ضرور۔" ارسلہ نے بہت یقین کے ساتھ فون بند کیا تھا۔

شازیہ چودھری

"ڈاکٹر کہاں ہے۔ ارے کوئی دولہا کی بہن کو ڈھونڈو۔"

اور مہندی کی تیاری کے لیے ہال سیٹ کرتے ہوئے لڑکیوں میں جس کی ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی وہ عصر سے کچھ بعد کے اس ٹائم میں پچھلے لان میں بوسیدہ سی آثار قدیمہ ٹائپ کرسی پر بیٹھی سکون سے تتلیوں اور بھنوروں کو گلاب کے تختوں پر منڈلاتے دیکھ رہی تھی یوں جیسے سرکس لگی ہو اور وہ اس کی واحد تماشائی ہو۔

"کہاں گئی؟ ابھی تو ادھر تھی۔ کہیں ہسپتال تو نہیں چلی گئی۔ اس پر ڈیوٹی ادا کرنے کا بھوت شدت سے سوار رہتا ہے۔ دو ماہ ہوئے ہیں جوائن کیے ہوئے اور ہم گھڑی بھر کی سلام دعا کو ترس گئے ہیں۔"

عالیہ' اس کی تایا زاد کزن تشویش و ترشی کا مظاہرہ بیک وقت کر رہی تھی۔

"تو بتاؤ بھلا۔ سگے بھائی کی شادی ہے اور وہ بھی ماموں زاد بہن سے۔ اور اس کی لاپروائی اور بیگانگی کا جواب نہیں ملتا۔ آج اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو۔۔۔"

اماں بی ان سب کی مشترکہ دادی' ٹھنڈی آہ بھر کر نجانے کیا داستان چھیڑ بیٹھی تھیں۔

"بابا ہوتے تو ہم یہاں اس شہر میں بھی نہ آئے جاتے۔۔۔" اس نے ہال کمرے کی کھڑکی سے

ناولٹ

آوازوں پر کان لپیٹ لیے تھے۔ حالانکہ یہ اس کی ددھیال تھی مگر بچپن سے جوانی تک اتنا کم آنا جانا رہا تھا کہ وہ ڈھنگ سے اس وسیع و عریض گھر اور اس کے بے شمار مکینوں سے متعارف بھی نہ ہو پائی تھی۔

بابا کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے سو اپنی موت تک بیوی بچوں کے ساتھ مستقل لاہور میں مقیم رہے تھے۔ اماں بی اور ابا جی کے پاس مہمانوں کی طرح سال میں ایک دو دن کے لیے بچوں کو لے کر ملنے آجاتے تھے۔ پھر جب زرتاب نے میڈیکل میں داخلہ لیا تو گویا یہ رسم بھی چھٹ گئی۔ پڑھائی پڑھائی اور بس پڑھائی' زرتاب نے ایم بی بی ایس کے پانچ سال ایسی ہی تعلیمی "پندونصائح" کے ہمراہ بسر کیے تھے' اس دوران امی دل کے آپریشن میں زندگی ہار کر ان سے بہت دور چلی گئی تھیں۔ رضوان اس سے پانچ سال بڑا اس کا بھائی ہائر اسٹڈیز کے لیے امریکہ جا بسا تھا۔

اور پھر آخری تازیانے کے طور پر بابا ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے۔ چھ ماہ پہلے کا وہ حادثہ اس کی زندگی کا عظیم ترین سانحہ تھا۔ رضوان امریکہ سے واپس آ گیا۔ اول اول تو وہ لاہور چھوڑ کر اماں بی کے پاس آنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اسے اس گھر سے امی اور بابا کی خوشبو آتی تھی مگر پھر رضوان کے سمجھانے بجھانے اور ابا جی کی شفقت و حلاوت پر ان کے ساتھ آ گئی۔ لاہور میں اب اس کا تھا بھی کون' تین ماہ پہلے وہ اور رضوان یہاں آئے تھے۔ رضوان کی بات سمن سے طے تھی۔ اماں بی نے اسے شادی میں بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔ کیا خبر کب رضوان کا موڈ بدلتا اور وہ پردیس سدھار جاتا۔

اس کے قدموں کے لیے "زنانی زنجیر" کا اہتمام کرنا ضروری تھا۔

وہ تو زرتاب کو بھی لگام ڈالنے کے لیے بے تاب تھیں مگر وہ مان کر نہ دی۔ چونکہ اسے ابا جی کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے اماں بی اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس نے سرکاری ہسپتال میں جاب شروع کر دی تھی۔

"بات سنیے' آپ زرتاب ہیں؟ یا ان کو جانتی ہیں؟"

وہ بڑے دھیان سے ایک بھنورے اور تتلی کو نارنجی اور سرخ شیڈ' کے تروتازہ گلاب پر پہلے "لینڈ" کرنے کی جستجو کرتے دیکھ رہی تھی کہ عقب سے ایک تھکی تھکی سی آواز نے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ سیاہ شلوار قمیص میں تھا۔ کام کی زیادتی نے کچھ بال بے ترتیبی سے پیشانی پر بکھرا دیے تھے۔ پاؤں میں سادہ چپل' آستینیں کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی اور چہرے پر سنجیدگی کا تاثر۔

وہ یقیناً" اسے نہیں پہچانا تھا کہ وہ شاذ ہی دن کے اوقات میں گھر میں پایا جاتا تھا۔ کہیں اس پر نظر پڑی بھی ہو گی تو گھر کے مکینوں کے میل ملاپ کے لوگوں یا مہمانوں میں شمار کرتے ہوئے دھیان دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ لیکن زرتاب اسے دیکھ کر پہچان گئی تھی کہ وہ کون ہو سکتا تھا۔

کافی سال پہلے جب رضوان اپنے والد کے ساتھ اس پرانے قصبے میں واقع اپنی آبائی حویلی میں دادا دادی سے ملنے گیا تھا تو اس نے واپس آ کر سمن کو بتایا تھا۔

"ارے بھئی زری! حویلی میں ایک عجیب و غریب کیریکٹر کا اضافہ ہوا ہے۔ مجھے تو ابھی پتا چلا ہے ورنہ بات تو پرانی ہو چکی ہے۔"

"کون سی بات؟ ٹھیک طرح سے بتاؤ ناں بھائی۔"

"تمہیں پتا ہے' ابو لوگ تین بھائی ہیں اور ان کی اکلوتی بہن طیبہ جنہیں ہم نے صرف تصویروں میں دیکھا ہے انہیں پسند کی شادی کے جرم میں ہمیشہ کے لیے خاندان بدر کر دیا گیا تھا۔ وہ بیاہ کر شہر آ گئیں ایک بیٹا بھی ہوا۔ خاوند کی موت کے بعد کسی وجہ سے گوشہ تنہائی میں چلی گئیں اور اپنے بیٹے فصیح کو نانا کی منت سماجت کے بعد ابا جی کے حوالے کر دیا۔ ابا جی نے صرف اسی صورت میں اسے گھر میں رکھنا قبول کیا ہے کہ وہ ہمارے خاندان کا تعارف نہیں بنے گا

حویلی کے ملازمین کی طرح رہے گا۔ سو یہی ہو رہا ہے۔ بے چارا سیدھا سادہ کم گو بندہ ہے' چچی اور تائی امی اور اماں جی کا رویہ خاصا سرد و سپاٹ ہے۔ اماں جی کہتی ہیں اسے دیکھ کر ان کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ اس کے چال باز اور مکار باپ نے ان کی پھولوں جیسی بیٹی کو کانٹوں پر رول دیا۔ کزنز نے بھی زیادہ لفٹ نہیں کرائی۔ اصل میں وہ بندہ خود ہی پس منظر میں رہنے کا عادی ہے خاموش' تنہا اور بور' عباد بھائی کہتے ہیں فصیح کی دو منٹ کی قربت بندے کو حلق تک بیزار اور بور کر دیتی ہے۔"

اتفاق سے زرتاب جب بھی بابا کے ساتھ ایک آدھ دن کے لیے یہاں آئی اس سے براہ راست ملاقات نہ ہو سکی تھی اور اب جبکہ ہمیشہ کے لیے وہ یہاں آ چکی تھی تو عالیہ کی نشاندہی پر اس نے فصیح کا اچھی طرح جائزہ لے ڈالا تھا' ہم اس کی گھر میں غیر اہم سی حیثیت کے پیش نظر کسی نے اسے متعارف نہیں کروایا کچھ وہ خود بھی دوسروں سے میل ملاپ سے کتراتا تھا۔ وہ جھکی نظروں اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ اپنا کام ختم کرنے کے بعد کمرے میں بند ہو جاتا۔

"نہیں' وہ یہاں نہیں ہیں۔"

زرتاب نے اس کی کم علمی سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ آرام سے جواب دے کر دوبارہ اپنے من پسند مشغلے میں گم ہو گئی۔ بھنورا نارنجی و سرخ شیڈ کے پھول پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ تتلی گلابی رنگ کے پھول پر منڈلانے لگی۔

"کہاں مل سکیں گی؟ ہال میں سب انہیں بلا رہے ہیں۔"

وہ تذبذب کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کافی دن ہو گئے تھے اس لڑکی کو گھر میں چلتے پھرتے دیکھتے ہوئے۔ نہ کسی نے زحمت کی تھی اور نہ خود اس کی ہمت ہوئی تھی کسی سے پوچھنے کی کہ آخر وہ کس رشتے سے اتنے استحقاق سے یہاں رہ رہی تھی۔

وہ بہت سکون سے پھولوں کے تختے پر نظریں جمائے خدا جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ زرتاب کوئی جواب دیتی پیچھے سے عالیہ کی جھنجلاتی آواز کان پڑی۔

"زرتاب! حد ہو گئی بھئی' تم یہاں بیٹھی ہو؟ پورا گھر چھان مارا ہم نے۔"

"میں آ رہی تھی۔" وہ دھیرے سے کہہ کر فصیح کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اگلے ہی لمحے شرمندگی میں ڈوب گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب لیا۔ فصیح کی شاکی نظر نے اسے نادم کر ڈالا تھا۔ وہ مڑا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

عالیہ فل اسپیڈ میں اسے ملامت کر رہی تھی۔

"اکلوتے بھائی کی شادی اور اتنی بددلی۔ توبہ ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" وہ منمنا کر صفائیاں دینے لگی۔ حقیقت یہ تھی کہ صبح سے بلے بلے بھئی نور پنجابن دی اور شگناں دی مہندی والے گانوں کی کورس میں پریکٹس سن سن کر وہ نیم پاگل ہو گئی تھی۔ لڑکیاں مقابلے کے لیے ہر خامی پر قابو پانا چاہتی تھیں اس لیے بار بار گلے پھاڑے جا رہے تھے۔

"چل کر تیار ہو جاؤ' اماں بی نے اپنی پسند سے تمہارا جوڑا بنایا ہے۔ انہیں پتا تھا تم پر چھوڑا تو اٹھا لاؤ گی پھر کوئی کاٹن قلا لین۔"

وہ عالیہ کے ساتھ چلتی ہوئی سعادت مندی سے اس کی ڈانٹ ڈپٹ سن رہی تھی۔ دوستی اس اسٹیج پر تھی جہاں اطراف سے برسنے والے پتھر بھی پھول سمجھ کر وصول کیے جاتے ہیں۔

"جیسے باقی کزن ہیں وہ بھی ان ہی کی طرح تھا۔ مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس کا حساس دل فصیح کی شاکی نظروں میں الجھ گیا۔

سادہ دل بے ضرر اور دھیمی طبیعت والے لوگ ہمیشہ دوسروں کی تفریح و تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ ان سے سخت کلامی یا بد لحاظی دکھا کر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتا۔ دوسرے باآسانی ان کے جذبات سے کھیل جاتے ہیں اور وہ جتا بھی نہیں پاتے۔ اسے

چاہیے تھا وہ اس کی غلط بیانی پر اپنی خفگی جتاتا' اسے شرمندہ کرتا... مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا فقط ایک بے ضرر سی شاکی نگاہ اور بس۔

"اماں بی! آپ جانتی ہیں میں گھریلو معاملات میں بالکل اناڑی ہوں' اور پھر آپ سب جو ہیں انتظامات سنبھالنے والے۔"

وہ سچ سے اماں بی کی ڈھیروں ناراضی کے جواب میں انہیں رام کر رہی تھی اور یہ سچ بھی تو تھا وہ اور ابا جی اپنی ساری توانائیاں رضوان کی شادی میں خرچ کر رہے تھے۔ رضوان گھر بھر کا پسندیدہ تھا۔

وہ اٹھ کر چچی کے پورشن میں آ گئی۔ شرمائی لجائی ثمن کے چہرے پر رنگوں کی بہار چھائی ہوئی تھی۔ وہ خود کو فضاؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ زرتاب سے کرید کرید کر رضوان کی باتیں پوچھتی اور سنتی رہی' وہ واپس مرکزی پورشن یعنی ہال کی طرف آ گئی۔

"کب آئیں گے کیٹرنگ سروس والے' آرڈر بھی دیا تھا یا یونہی ہوا میں تیر چلا آئے ہو..."

چچی کے بڑے سپوت اور گھر کے سیکنڈ ان کمانڈ عباد بھائی درشتی سے فصیح سے مخاطب تھے۔ وہ کبھی بھی اس سے نرمی سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ نجانے کیا پرخاش تھی کہ مخاطب ہوتے ہوئے ان کا لہجہ خود بخود رعونت و خشونت سے لتھڑ جاتا تھا۔

"جب کہا ہے تو آ بھی جائیں گے۔ آپ تسلی رکھیے عباد بھائی!"

نجانے کیوں زرتاب سے رہا نہ گیا۔ اس نے دیکھا فصیح یکسر خاموش تھا نہ تائید نہ تردید' اس کی خاموشی نے زرتاب کو بولنے پر آمادہ کیا تھا۔ اسے عباد بھائی کا فرعونی لہجہ اچھا نہیں لگا تھا۔

"اچھا! اور اگر موصوف بھول گئے ہوں تو؟" اس کے وفائی لہجے نے عباد بھائی کو چونکا دیا' وہ ایک گہری نگاہ اس پر ڈال کر لہجہ بدل کر سوال کرنے لگے۔

"میں اپنے کام اور اپنی اوقات نہیں بھولتا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔" وہ اسے مشکل میں پھنسا دیکھ کر جواباً بولا۔ لہجہ پرسکون اور دھیما تھا۔

اسی لمحے نصیر نے کیٹرنگ سروس کے بھیجے ہوئے بندوں کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اللہ کا بندہ "دیکھا میں نہ کہتا تھا" قسم کا کوئی بھی جتاتا ہوا جملہ بولے بغیر خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

"اسے اس کی اوقات یاد کراتے رہنا چاہیے۔ باقی ماں کی نشانی ہونہہ۔" عباد بھائی نخوت سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

زرتاب کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔

گھر بھر کے رویوں نے بتا دیا تھا کہ فصیح کو ملازم سے کچھ ہی اوپر کا درجہ دیا گیا ہے اور اب اس کو یہی انداز اپنانے چاہئیں۔ خاندانی روایات کے مطابق۔

☼ ☼ ☼

شادی کے پانچویں دن ولیمہ ہوا۔ تائی کے لاڈلے سپوت خرم بھائی' ان کی بیگم اور چھوٹا بچہ یاسر سعودیہ میں تھے۔ یاسر ریپ کلاس کے پرچے دے رہا تھا اس وجہ سے وہ شادی پر نہیں آ سکے تھے۔ البتہ ولیمے پر ان کی شمولیت یقینی بنانے کے لیے تاریخ آگے بڑھا دی گئی تھی۔ پرسوں اس کے امتحان ختم ہوئے تھے اور آج وہ لوگ پاکستان پہنچ گئے تھے۔ ولیمے کی تقریب گھر میں ہی منعقد کی گئی تھی۔

مہمان دوپہر کے کھانے پہ بلائے گئے تھے اور شام کی چائے کے بعد واپس بھیجے جانے تھے۔

"زرتاب بی بی! آپ اس وقت بھی ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو جا کر فون سن لیجیے۔" وہ شامیانے کے نیچے کھانے کی میزوں کے آس پاس منڈلاتے لوگوں کو بے دھیانی کے عالم میں دیکھ رہی تھی جب پشت کی طرف سے سادہ سا لہجہ کان پڑا۔ وہ مڑی۔

فصیح کے ایک ہاتھ میں بھنے ہوئے مرغ کی ٹرے تھی جسے وہ قریبی میز پر رکھ رہا تھا۔ مہندی سے ولیمے تک کے سارے انتظامات اسی نے کیے اور کروائے تھے۔ خاندان سے حوالے کا کتنا خراج ادا کر رہا تھا۔

"کس کا فون ہے...؟" وہ یونہی مخاطب ہو گئی۔

"آپ کے ہاسپٹل سے ہے۔" زرتاب کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی اور وہی ہوا جو اس کے ذہن میں تھا۔ وہ واپس پنڈال میں آئی اور اماں بی کو تلاش کرنے لگی۔ یہاں بھی وہی سرگرم عمل نظر آ رہا تھا۔

اسے ادھر ادھر بے تابی سے کسی کو کھوجتے دیکھ کر وہ قریب آ گیا ایک سوالیہ نظر اس پر ڈالی۔ تھوڑی دیر پہلے تک وہ گولڈن و براؤن کمبی نیشن کے بھاری کامدار جھلملاتے جوڑے میں ملبوس تھی اور اب فون سن کر واپس آئی تو ہلکے آسمانی شلوار قمیص میں اوور آل بازو پر ڈالے ہوئے تھی۔

"فصیح! سنو' اماں بی کو بتا دینا میں ہسپتال جا رہی ہوں ایمرجنسی ڈیوٹی پر۔" اس نے اسے قریب آتے دیکھ کر تبدیلی لباس کی وجہ بھی بتا دی۔ بھائی کا ولیمہ تھا اور بہن کو ڈیوٹی عزیز تھی۔ بڑی عجیب پچویشن تھی۔

"آپ اپنی ڈیوٹی کا بہت خیال رکھتی ہیں۔"

"ہاں۔" وہ ہنس دی "سب کو رکھنا چاہیے۔"

"کچھ لیں گی نہیں؟" اس کی آواز میں اپنائیت تھی۔

"نہیں میں نے بہت کھایا ہے۔ شکریہ۔"

"یہ تو خیر جھوٹ ہے۔ میں کافی دیر سے آپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری گنہگار نظروں نے آپ کو فقط پلیٹ سے کھیلتے دیکھا ہے اور آپ جائیں گی کیسے؟" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل آیا تھا۔

"جیسے روز جاتی ہوں ٹرین سے۔"

"مگر اس وقت اسٹیشن پر آپ کو ٹرین مل جائے گی؟" اس نے گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔

"یقیناً کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گی۔"

وہ ڈسٹرکٹ کے سرکاری ہسپتال میں جاب کرتی تھی۔ یہاں اس تحصیل میں چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا جہاں سے گزرنے والی ٹرین ضلع اور اس کی دیگر تحصیلوں سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہاں کے بیشتر لوگ ذرائع آمد و رفت کے لیے ریل گاڑی کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ ملازمت پیشہ' کاروباری فیکٹری ورکرز اور دیگر عام آنے جانے والے۔

اسٹیشن ان کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل کا راستہ تھا۔

"چلیں میں آپ کو اسٹیشن تک چھوڑ دیتا ہوں۔"

"میں خود چلی جاؤں گی' میرا روز کا معمول ہے۔ تمہیں ہی آج پتا چلا ہے۔" وہ طمانیت سے بولی۔

"اور اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔" بے ساختہ اس کے منہ سے پھسلتا جملہ زرتاب کے قدم ٹھٹکا گیا۔

وہ جوتے کی نوک سے زمین کریدتے ہوئے اپنے دائیں جانب دیکھ رہا تھا۔

"تم نے ایف اے کے بعد پڑھائی کیوں چھوڑ دی تھی؟" وہ خاموشی کا وحشت میں مبتلا کر دینے والا خول توڑتے ہوئے مخاطب ہوئی۔

"اس لیے کہ گھر میں زمینوں کا حساب کتاب رکھنے کے لیے منشی کی ضرورت تھی۔"

"زمینیں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھیں۔" اس نے ڈانٹنے والے انداز میں اسے دیکھا۔ "پڑھائی مکمل کرنے کے بعد بھی یہ کام سنبھالا جا سکتا تھا۔"

"اور کسی کو نہ سہی مجھے خود کو تو پانا تھا نا۔ یہ دھیان میں رہے کہ مجھے اپنے اس ننھیالی محل میں صرف نام اور کمرے کی پناہ دی گئی ہے۔ نانا جان میرا تعارف اپنے قریبی عزیز کے بیٹے کے طور پر کراتے ہیں جسے لاوارث جان کر ازراہ ہمدردی گھر میں جگہ دے دی۔"

اس کا لہجہ بالکل ہموار' سیدھا اور پرسکون تھا۔ وہ لب بستہ کھڑی رہ گئی۔

"آپ کب تک واپس آئیں گی؟" حالانکہ اس قسم کے حسابات رکھنا گھر کی معمر خواتین یا ذمہ دار افراد کی ہابی تھی۔ پھر وہ کس ناتے اور کس کھوج میں دریافت کر رہا تھا۔

"شاید شام کے چھ سات بجے تک پکھ کہہ نہیں سکتی۔" وہ اسے گیٹ بند کرنے کا کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

وہ تقریباً سات بجے گھر پہنچی تھی۔ خلافِ معمول گھر میں سناٹا تھا۔ کیا ولیمے کی تقریب اتنی جلدی نپٹ گئی؟" اس نے گیٹ پر کھڑے ملازم سے دریافت کیا۔ پتا چلا دولہا دولہن اور دیگر مہمان ولیمے سے نپٹ کر چچی کے میکے میں دعوت پر گئے ہیں کیوں کہ ولیمہ ایک ہفتے بعد ہوا تھا۔ رشتہ داروں کو اپنی دعوتیں نبٹانے کی جلدی تھی۔ رضوان کو واپس امریکہ جانا تھا کہ اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔

"آپ کے لیے اماں بی کا پیغام ہے کہ تیار ہو کر فوراً" ادھر پہنچ جائیں۔"

وہ نیم دلی سے سر ہلا کر مرکزی پورشن کی طرف آ گئی۔ سٹنگ روم میں ساٹھ واٹ کا ٹمٹماتا سا بلب روشن تھا۔ گھر کی زیادہ تر لائٹس آف تھیں۔ سٹنگ روم اور کچن ملحقہ تھا۔ چھ کرسیوں کی میز، صوفہ کم بیڈ، ایزی چیئر اور صوفہ چیئر کے علاوہ فریج اور ڈیپ فریزر بھی یہیں سیٹ کیے گئے تھے۔ کوکنگ رینج کے دائیں بائیں وسیع و عریض کاؤنٹر تھا اور عین اوپر کراکری کے لیے شیلف بنائے گئے تھے۔

وہ تھکی ہاری آتے ہی صوفہ کم بیڈ پر گر گئی۔ پپوٹے مسلتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ کھینچ کر ایزی چیئر پر اچھالا، پھر سفید اوور آل اتار کر ایک طرف ڈالا اور جسم کا کھنچاؤ دور کرنے کے لیے ایک بھرپور انگڑائی لے کر دھم سے صوفے پر دراز ہو گئی۔

"چچی کے میکے جانا تو پڑے گا۔" وہ ارد گرد کے ماحول پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کسل مندی سے سوچ رہی تھی۔ وہی تصنع، جبری مسکراہٹ اور پُر تکلف گپ شپ۔ اس کا جی اوب گیا۔ یونہی سامنے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے جیسے اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ کوکنگ رینج کے پاس کھڑا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور جھپٹ کر دوپٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیا میں اتنی اندھی ہو گئی تھی کہ چھ فٹ کا بندہ کھڑا نظر نہ آیا۔" اس کا چہرہ تپ کر سرخ انار ہو گیا تھا اور خجالت کہتی تھی زمین شق ہو تو اس میں سما جاؤ۔

"چائے پئیں گی آپ؟" وہ بڑے سکون سے کپ تھامے ادھر آ گیا۔

"اتفاقاً" ہی دو کپ بن گئے۔ لیجئے نا۔" وہ اس کی شرمندگی دور کرنے کے لیے دانستہ انجان بن رہا تھا۔ نظر بھی محتاط اور جھکی ہوئی تھی مگر زرتاب کی بدحواسی کم نہ ہوئی۔ یہ میرا بیڈ روم تو نہیں تھا جو بلا جھجک آ کر گر گئی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مجھے اطمینان کر لینا چاہیے تھا کہ اندر کوئی موجود ہے یا۔

"کس چیز کی ڈاکٹر ہیں آپ؟" وہ اس کے مقابل صوفہ چیئر پر بیٹھ گیا۔

"عام سی ڈاکٹر ہوں۔ اسپیشلائز نہیں کیا ابھی۔" اس نے کپ تھام کر جھکی نظروں سے بھاپ اڑاتی چائے پر نگاہ جما دی۔ لہجہ بہت ہی مدھم اور گھبرایا ہوا تھا۔

"آپ اَن ایزی فیل نہ کریں۔ میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔ مہمانوں کی بہتات کے باعث آج کل میرا اٹھنا بیٹھنا یہیں ہوتا ہے۔ اس لیے جب غلطی دونوں میں سے کسی کی نہیں ہے تو شرمساری کیوں؟ ہم کوئی اور بات کیوں نہ کریں اچھی سی۔ آپ کس میں اسپیشلائز کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟"

اس کا انداز اتنا رسانیت لیے ہوئے تھا کہ زرتاب کے کھنچے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔

"ابھی سوچا نہیں ہے۔" وہ چائے پینے لگی۔

"دل کے امراض میں کر لیں۔" زرتاب نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

"مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اوور آل اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے، آپ تو خفا ہو گئیں اور چائے بھی نہیں پی۔" اس نے اس کا کپ دیکھا جو آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔

"میں خفا نہیں ہوں۔ تھکی ہوئی ہوں اور پھر ابھی چچی کے میکے بھی جانا ہے۔" وہ بے دلی سے قدم

بڑھانے لگی۔

"اگر آپ کا دل نہیں چاہ رہا تو مت جائیں۔"

"بہت سے کام ہمیں دل کی مرضی اور اجازت کے بغیر کرنے پڑتے ہیں۔" وہ مڑ کر ایک لحظے کو مسکرائی اور پھر باہر نکل گئی۔

فصیح نے اپنا کپ خالی کر کے میز پر رکھا۔ پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھا زرتاب کا کپ اٹھا کر چائے پینے لگا۔

❀ ❀ ❀

"زندگی کی سب سے خوب صورت حقیقت شادی ہے۔ مجھے تو اپنی اب تک گزری زندگی بے کار لگ رہی ہے۔ اصل رشتہ اور لطف تو شوہر کے دم سے ہے۔ دو ہفتوں میں ہی رضوان زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے ہیں۔ میری مانو تو تم لوگ بھی شادی کر لو اب۔"

"تو اپنی تمنا ہمیں رہنے دے۔" سدا کی منہ پھٹ عالیہ نے براؤن نقشی اور موتیوں کے کام سے بوجھل شرارے میں ملبوس ثمن کو ایک جملے میں بھگتا دیا۔

ثمن کے اٹھتے بیٹھتے شوہر اور شادی کے فوائد و اہمیت پر دیے گئے لیکچر نے انہیں حلق تک بیزار کر دیا تھا۔ زرتاب تو پھر لحاظ میں چپ رہتی تھی مگر عالیہ صاف منہ پر کہہ دیتی تھی۔

ثمن بے چاری بھی کیا کرتی زندگی میں پہلی مرتبہ خاندان والوں کے سامنے اہمیت ملی تھی۔ ڈینگیں مارنا اس کا حق بنتا تھا۔

"اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ ان دنوں ہوش کھوئے ہوئے ہے۔ شروع میں تو سب کو ہی خمار چڑھا ہوتا ہے۔ بعد میں پتا لگتا ہے آٹے دال کے بھاؤ کا۔ آغاز جانم جانو اور ڈارلنگ سے ہوتا ہے اور اختتام احمق، بے وقوف عورت، مصیبت اور جان کی دشمن پہ۔" عالیہ استہزائیہ انداز میں زرتاب سے مخاطب ہوئی۔

شادی کیا ہوئی تھی ثمن بانس پہ جا چڑھی تھی۔ شیخی بگھارنے میں تو پہلے بھی کم نہیں تھی اب اور دھار لگ گئی تھی۔ مہارانی بنی سب کی دعوتیں بھگتا رہی تھی۔ چال میں نخوت، انداز میں غرور و ناز، لہجے میں احساسِ برتری اور آواز میں نخوت رقص کرتی تھی۔ امریکہ پلٹ خوبرو جوان مرد بیاہ کے لایا تھا آخر کوئی معمولی بات تو نہیں تھی (اس کے نزدیک)

عالیہ اس کی شوخی و طراری پہ ہنسا کرتی تھی۔

"غریب کو پہلی مرتبہ کوئی نشانِ امتیاز ملا ہے۔ اب بھی بڑھکیں نہ مارے بھلا، ویسے تو معاذ اللہ ہر میدان میں صفر بٹا صفر رہی ہیں۔ ایف اے میں شاندار نمبروں سے فیل، گھریلو معاملات میں اناڑی اور اب ایک دم اتنی خاص ہو گئی ہے۔ خاوند کا لاڈ پیار، اماں ابا کی ناز برداریاں، نئی دولہن ہونے کے ناتے رشتہ داروں اور جاننے والوں کا ملنے کے لیے اشتیاق۔ اس کے لیے بدلی ہوئی فضا جنت سے کم نہیں ہے۔ تب ہی تو اپنے سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا۔ اتر آئے گی تھوڑے دنوں میں خوابوں کے آسمان سے۔ دبی دبائی گھریلو سی لڑکیاں شادی کے شروع کے دنوں میں اکثر مارے خوشی کے آپے میں نہیں رہا کرتیں۔ بڑی عام سی بات ہے یہ۔"

عالیہ ایسی ہی تھی۔ سدا کی صاف گو۔ حالانکہ مزاجاً زرتاب بھی اسی جیسی تھی لیکن وہ ظاہری اعتبار سے عالیہ سے مختلف تھی۔ بولنے سے پہلے تولنے کے کلیے پر کاربند رہتی تھی۔ وہ اس بات کی قائل تھی کہ انسان کو موقع محل دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔ بے موقع کی صاف گوئی بدلحاظی میں شمار ہونے لگتی ہے۔ کچھ وہ فطرتاً بھی نرم دل، مصلحت کوش اور امن پسند لڑکی واقع ہوئی تھی۔

وہ عالیہ پر رشک کرتی تھی، جو اپنے احساسات کو کسی مصلحت کی زنجیر پہنائے بغیر زبان پر منتقل کر سکتی تھی۔

"ثمن ڈیئر! تم اپنی خوشی میں مست رہو۔ ہماری فکر چھوڑ دو۔ شادی ایک دن سب کی ہونی ہے۔ کچھ کی جلدی ہو جاتی ہے کچھ کی دیر میں۔ اس میں اتنا اتاؤلا ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا اور اگر تم خوامخواہ بار بار ہماری شادیوں کا ذکر کر کے ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی ہو تو اطلاعاً عرض ہے کہ کم از کم مجھے اور

زری کو تم جذباتی پھندا ڈال کر شکار نہیں کر سکو گی۔ ہم دونوں اپنی ایک واضح شناخت پا چکے ہیں' زندگی میں اک مقام' اک نام رکھتے ہیں اور اپنا آپ منوانے یا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے شوہر کے نام کی ضرورت نہیں ہے۔"

عالیہ کے دو ٹوک جواب پر سمن بلبلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیسی گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔ میں ایسا تھوڑی سمجھتی ہوں۔"

"تو پھر یہ بہانے بہانے سے اپنی خوشگوار و رومان پرور زندگی کی جھلک دکھلا کر ہماری بروقت شادیوں کا تذکرہ کرنے اور در پردہ ہم پر ترس کھانے کی روٹین بند کرو۔ انسانوں کی طرح رہو۔ جذب و برداشت بھی کوئی چیز ہوا کرتی ہے۔ اتنا سا مرتبہ ہضم نہ ہوا' نیویارک جاؤ گی تو شاید ہمیں دوسرے درجے کی مخلوق سمجھنے لگو۔"

اس کے بھڑکنے کا عالیہ پر کوئی اثر نہیں ہوا' اس کا لہجہ بے نیازی لیے ہوئے تھا۔ سمن تلملا کر پیر پٹخنے لگی۔

"زری! دیکھ رہی ہو اپنی لاڈلی دوست کے تیور۔ جلتی ہے یہ مجھ سے' ہونہہ۔" جب عالیہ کے منہ کو نہ آسکی تو نند کی امداد طلب کرلی۔ زرتاب بیچ میں پھنس کر رہ گئی۔

"عالیہ تمہاری بھی دوست اور کزن ہے۔ چلو دونوں سیز فائر کرلو عالیہ! تم تو شاید اپنا لیکچر تیار کرنے جا رہی تھیں......"

عالیہ مقامی کالج میں لیکچرار تھی۔ زرتاب نے کسی طرح معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

رضوان آج کل ویزے کے چکروں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ ایک ہفتے بعد واپس جا رہا تھا۔ فی الوقت سمن کو ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی اسٹڈیز مکمل ہونے میں چھ ماہ باقی تھے پھر اس کے بعد جاب ڈھونڈنے اور سیٹل ہونے میں مزید وقت لگتا۔ رضوان نے فیصلہ کیا تھا کہ سمن کو ایک سال بعد اپنے پاس نیویارک بلائے گا تاکہ اپنی فیملی کو سپورٹ کرنا اس کے لیے مشکل نہ رہے۔ سب بڑے اس کی تجویز پر متفق تھے۔ یوں بھی خاندان میں اکثر ایسا ہوتا آیا تھا۔ بیویاں پاکستان میں شوہر کی اولاد اور گھر سنبھالتی تھیں اور مرد مڈل ایسٹ یا امریکہ میں کمائی کرتے تھے۔ سال میں ایک دو مرتبہ پاکستان آجاتے تھے اور بس۔

یہ فیصلہ سمن پر بجلی بن کر گرا۔ وہ رضوان کی بری طرح عادی ہو چکی تھی اب اس کے لیے اس کی محبت' اس کی قربت سے دور رہنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ رو رو کر وہ آدھی ہو گئی مگر رضوان کی بھی مجبوری تھی۔

"یار! تم پہلے بھی تو رہتی تھیں نا۔ اب کیا انوکھی بات ہو گئی۔" رضوان اس کے آنسو پونچھتے ہوئے تسلی دیتا۔

"پہلے کی بات اور تھی' مجھے اپنی محبت کا عادی بنا کر اب چھوڑ کر جا رہے ہیں؟"

اس کے آنسو سیلاب کی طرح رضوان کا سینہ بھگوتے چلے گئے تھے۔

"مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے۔ تم سے بچھڑنا میرے لیے بھی امتحان سے کم نہیں ہے۔ مگر مجبوری ہے ڈارلنگ! اچھے مستقبل کے لیے کچھ قربانیاں تو دینا پڑتی ہیں نا۔ میں چاہتا ہوں جب تم نیویارک میں اپنے گھر میں قدم رکھو تو تمہارے پاس زندگی کی ہر ضروری سہولت موجود ہو۔" اس نے سمن کے گال تھپتھپائے۔

جانے والوں کو جانا ہی ہوتا ہے۔ لاکھ دلجوئی کے باوجود سمن وقت رخصت بلک پڑی۔

زرتاب بھی اپنے دل میں اداسی محسوس کر رہی تھی۔ ماں باپ کے بعد وہی اک مضبوط ترین رشتہ رہ گیا تھا اور اب وہ بھی ساتھ چھوڑ رہا تھا۔

رضوان کی دن کی فلائٹ تھی' اتفاق سے زرتاب کی بھی صبح کی ڈیوٹی تھی مگر رضوان کو خدا حافظ کہنے کے لیے اس نے اپنی ڈیوٹی اپنی ساتھی ڈاکٹر طوبیٰ سے بدل لی تھی۔ اب اسے شام چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک ڈیوٹی دینا تھی۔

❊ ❊ ❊

"کیا ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحب ....!"

وہ حسب معمول پچھلے صحن میں پھولوں کی باڑھ پہ بھنوروں کا رقص انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ عباد بھائی ادھر نکل آئے۔

"کچھ نہیں عباد بھائی! یونہی اندر بیٹھی بور ہو رہی تھی تو ادھر آ گئی۔ عالیہ ابھی تک کالج سے نہیں لوٹی اور میرا ڈے آف ہے اس لیے گھر پر نظر آ رہی ہوں۔"

"سرکاری ہاسپٹل کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لمبی چوڑی ڈیوٹیاں نہیں بھگتانی پڑتی۔ نہ بے وجہ پریشرائز ہوتا ہے بندہ۔ پرائیویٹ ہاسپٹل کے ڈاکٹرز کو زیادہ ٹائم دینا پڑتا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"یہ بات نہیں ہے، جاب بہرحال جاب ہوتی ہے۔"

"مستقبل کی کیا پلاننگ ہے تمہاری؟"

"کچھ نہیں اسپیشلائز کروں گی اور اس کے بعد ظاہر ہے اپنا کلینک سیٹ کرنے کا انتظام کروں گی۔"

عباد بھائی کچھ دیر تک اس کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے۔

"باہر چلو گی سیر کرنے۔"

"ضرور چلوں گی، مگر اس وقت یہ آفر دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ ان کی عجیب و غریب آفر پہ حیران رہ گئی تھی۔

"ہر بات کی وجہ سمجھ میں آنے لگے تو کوئی مشکل مشکل نہ رہے۔ بہرحال آؤ....."

"کچھ دیر انتظار کر لیں عباد بھائی! عالیہ بھی آتی ہو گی۔ مل کے چلتے ہیں بلکہ آپ اپنی بہن ثمن سے بھی پوچھ لیجیے۔ اس کا دل بھی بہل جائے گا۔"

"میں نے سب کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔" وہ بے طرح چڑ گئے۔ "آفر تمہیں دے رہا ہوں سارے ٹبر کو نہیں کہ اٹھ کر ساتھ چل دیں۔"

زرتاب کو عجیب سا محسوس ہوا۔

چچا کے یہ بیٹے مزاج میں کبھی تولہ کبھی ماشہ کی حیثیت سے مشہور تھے۔

آج کل گھر میں ان کی شادی کے تذکرے چل رہے تھے۔

زمینوں کا کام انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا اور اباجی کے دست راست کی حیثیت سے مشہور تھے۔

❊ ❊ ❊

"عالیہ! ایک بات تو بتاؤ۔" وہ وارڈروب سے نائٹ سوٹ نکالتے ہوئے عالیہ سے مخاطب ہوئی۔ عالیہ اور وہ ایک ہی بیڈ روم میں سوتے تھے۔

"یہ فصیح کی امی یعنی ہماری پھوپھو آج کل کہاں ہوتی ہیں اور اگر یہ زندہ ہیں تو فصیح کو اپنے ساتھ شہر کیوں نہیں لے جاتیں۔ مجھے اس شخص کو دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ وہ عمر جو کچھ بننے کچھ کر دکھانے کی ہوتی ہے وہ یہاں غلامی میں تباہ کر رہا ہے۔ تیرے میرے کے احکامات کے پیچھے بھاگنا' گھر کا سودا سلف' زمینوں کا حساب کتاب' ٹوٹی چیزوں کی مرمت کرانا اور آئے گئے کا خیال کرنا۔ یہ کام اس پر زیب نہیں دیتے۔ اتنا توانا اتنا بھرپور جوان آدمی ہے۔ اس عمر کے مرد تو تعلیم سے فراغت پا کر کسی اچھی نوکری کی تلاش میں بھاگ دوڑ کر رہے ہوتے ہیں اور یہ ابھی تک بی اے کے پیپرز بھی نہیں دے سکا اور نہ ہی غالباً" اسے اس بارے میں سوچنے کی فرصت ہے۔"

"ارے بابا! کیسے سوچے اس کے کام دھندے ختم ہوں تب نا۔"

عالیہ اگلے دن کے لیے انگلش لٹریچر کا لیکچر تیار کر رہی تھی۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی ہوئی تھی۔

"مگر گھر والے تو اس کے مستقبل کے بارے میں سوچ سکتے ہیں نا! اباجی' اماں جی اس کے نانا نانی ہیں' وہ بھی سگے ان کا فرض بنتا ہے کہ اپنے لاوارث نواسے کے اچھے مستقبل کے لیے اس کی صحیح سمت میں رہنمائی کریں۔ اسے دوسرے درجے کے افراد کی طرح ڈیل مت کریں۔"

"تم اپنا ننھا سا دماغ اس مسئلے پر مت کھپاؤ میڈم! بڑے گنجلک اور پیچیدہ مسائل ہیں۔ اماں جی اور اباجی

اس مسئلے پر کسی کی بات سننے کے روادار نہیں ہیں۔ دیکھتی نہیں ہو دونوں کے رویے فصیح سے کس قدر تحقیر آمیز ہوتے ہیں۔ اماں جی تو صاف کہتی ہیں کہ اسے دیکھ کر اپنی بیٹی کی بربادی کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے اور اباجی کا بس چلے تو اس کا خون پی جائیں۔ تم دیکھتیں نہیں کہ جان بوجھ کر اس سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے اس کے باپ کے گناہوں کی سزا دینے کے لیے۔"

عالیہ نے کتاب کا دوسرا صفحہ پلٹا۔

"مگر کیا جرم ہے اس کے باپ کا۔ یہی نا کہ اباجی کی بیٹی اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی اور ایسی دیوانی ہو گئی کہ اسے پانے کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا۔ اباجی نے کہا تھا اسے چھوڑ دو یا مجھے چھوڑ دو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" بیٹی نے محبت پانے کے لیے باپ کو چھوڑ دیا اور یہاں سے بہت دور چلی گئی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد فصیح کا باپ مر گیا اور طیبہ پھوپھو منت سماجت کر کے فصیح کو اباجی کے سپرد کر کے خود روپوش ہو گئیں۔ اس سارے قصے میں فصیح کا کیا قصور نکلتا ہے' اباجی اور اماں جی کو طیبہ پھوپھو سے شکایت ہونی چاہیے نہ کہ فصیح اور اس کے مرحوم باپ سے۔"

"اس کی وجہ کیا ہے یہ تو میں نہیں جانتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس گھر میں اس موضوع پر بات کرنا سخت ممنوع ہے۔ وہ طیبہ پھوپھو کا حوالہ سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ نہ امی اور چچی پسند کرتی ہیں اور عباد بھائی کا تو تمہیں پتا ہے انہیں تو یوں بھی فصیح سے اینٹ کتے کا بیر رہتا ہے۔"

"مگر یہ غلط ہے عالیہ! جو کچھ بھی ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔ فصیح بے قصور اور غیر جانبدار ہے اس معاملے میں۔ اس کی زندگی اس کا کیریئر تباہ کر کے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی جا رہی ہے۔ اس زیادتی کا کوئی ازالہ ہونا چاہیے۔"

"مثلاً کیا؟" عالیہ غور سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"ہماری آنکھوں کے سامنے ایک شخص کا مستقبل دم توڑ رہا ہے عالیہ! کیا ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"کیا مدد کرو گی اس کی؟ کیا اپنے ہسپتال میں وارڈ بوائے لگوا دو گی! کیا کرو گی۔ ایک بندہ، جس کا بی اے بھی مکمل نہیں ہے اور جس کے پاس کوئی ہنر یا فن بھی نہیں ہے اسے تم کہاں اور کس شعبے میں فٹ کر سکو گی۔"

"کچھ نہ کچھ تو بہرحال کروں گی۔" وہ دل ہی دل میں اپنا ارادہ مضبوط کر رہی تھی۔

"مگر کس ناتے سے....؟" عالیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"انسانیت کے ناتے سے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

❊ ❊ ❊

"فصیح! ادھر آؤ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔"

زرتاب نے پچھلے صحن میں پیڑ کے پاس کھڑے انہماک سے کچھ سوچتے فصیح کو اپنے پاس بلایا تھا۔

"میں اس پیڑ کے مرجھائے ہوئے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔"

"کبھی اپنی مرجھائی ہوئی زندگی پر بھی غور کیا ہے۔" زرتاب کا لہجہ تیز اور ناراض تھا۔

فصیح نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مبہم سا مسکرایا مگر بولا کچھ نہیں۔

"زندگی جیسی قیمتی چیزیں یوں بے کار گنوانے کے لیے نہیں ہوتی۔ یہ آزمائش کے لیے دی گئی ہے اور ہر ایک کو اپنی اپنی توفیق اور استطاعت کے مطابق اس آزمائش پر پورا اترنا ہوتا ہے۔ پھر تم کنارے پر کیوں کھڑے ہو ابھی تک پار اترنے کے لیے چھلانگ کیوں نہیں لگاتے۔ کیا سوچ کر خاموشی تان کے بیٹھے ہو۔"

وہ اس کی ٹھیک ٹھاک کھنچائی کرنے کے موڈ میں تھی۔

"میری خاموشی ہی میری عافیت ہے' زرتاب بی بی!

کاش آپ سمجھ سکیں۔" وہ کہیں دور دیکھ رہا تھا۔

"میری مثال اس قیدی پرندے کی سی ہے' جس نے خود کو باور کرادیا ہے کہ اس کے پر ہی نہیں ہیں کہ وہ اڑ سکے۔ اسی لیے وہ اپنے سالم پروں کو پھڑپھڑانے کا رسک نہیں لیتا۔ مبادا ایسا کرنے کے بعد لمبی اڑان بھرنے کو جی مچل اٹھے اور وہ بے قابو ہو جائے۔ انسان جب تک صبر کرتا ہے' سکھ میں رہتا ہے۔ صبر چھوڑ دو تو ایسی تڑپ جاگتی ہے کہ ایک ایک لمحہ گزارنا عذاب بن جاتا ہے۔ اور میں اس عذاب میں خود کو مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔"

زریاب دم بخود رہ گئی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی وہ سطحی سوچ رکھتا ہے' گہرائیاں ناپنے کا فن نہیں جانتا مگر وہ تو جانے زندگی کی کن پہنائیوں میں اتر کے سطح پر آیا تھا۔

"جب اتنا سمجھتے ہو تو یہ بھی مان لو کہ انسان ڈوبے یا تیرے اسے رسک تو بہر حال لینا ہی پڑتا ہے۔ بھلا کنارے پر کھڑے ہو کر کب تک دریا کا بہاؤ دیکھتے رہو گے۔ لہریں گنتے رہو گے۔"

"آپ مجھے یہ سہانی نصیحتیں نہ کریں زرتاب بی بی! زندگی کے بارے میں سوچنا اور اسے خوش کن زاویے سے دیکھنا آپ کے لیے آسان ہے مگر میرے لیے ازحد مشکل ہے۔ آپ کا دماغ آزاد ہے میری سوچیں بندھی ہوئی ہیں۔ آپ کے خیالوں پر کسی کا پہرہ نہیں میری ہر سانس مشروط ہے۔" وہ ہونٹ چبا رہا تھا۔

زرتاب مضطربانہ ہاتھ مسلنے لگی۔

"آپ تو بس اچھی اچھی باتیں کیا کریں۔ اپنے جیسی نرم اور میٹھی۔" یک لخت وہ کھل کر مسکرا دیا اور بغور اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"تم سے کس نے کہا میں بہت نرم ہوں۔ ارے میں تو بڑی سخت اور روکھی پھیکی سی لڑکی ہوں۔"

"کس نے کہا۔" وہ بے اختیار بولا۔ "میری نگاہ اور دل تو ایسا نہیں کہتے۔" باقی جملہ دل میں مکمل کیا۔

زرتاب کو اس کی خود پر جمی چمکتی ہوئی نگاہوں سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

"ایک بات کہوں زرتاب بی بی؟" وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

"ماں کا کردار بہت فیئر ہونا چاہیے۔ ایک عورت کو اپنا وقار' اپنی عزت اور اپنے شفاف کردار کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس پر دھبہ پڑے گا تو آنے والی نسلوں کا غرور و فخر بھی اس سیاہی کی نذر ہو جائے گا۔ ایک لڑکی جب پیار پانے کے لیے اپنے گھر والوں سے بغاوت کرتی ہے اور انہیں چھوڑ کر گھر سے نکلتی ہے تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ جب وہ ماں بنے گی تو اس کا کیا اس کی اولاد کو کس کس موڑ پر بھگتنا پڑے گا۔"

فصیح کی نظر بچی' چہرہ سرخ اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"ماں باپ خوش نام اور صحیح اطوار کے مالک ہوں تو اولاد سینہ تان کر معاشرے سے اپنا حق وصول کرتی ہے' خود کو منواتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو اولاد کا سر ہمیشہ جھکا ہی رہتا ہے۔ آپ کہتی ہیں میں زندگی سے اپنا حصہ لوں اور میں کہتا ہوں زندگی نے مجھے جو دینا تھا وہ مجھے مل چکا۔ اس سے زیادہ میرا اس میں حصہ نہیں ہے۔"

فصیح کے پیروں میں چپل تھی اور وہ انگوٹھے سے اس کی سطح کرید رہا تھا۔

"فصیح! فصیح! ارے بھئی کہاں مر گیا یہ چھوکرا۔ جب کام کی باری آئے تو غائب ہو جاتا ہے۔ کونے کھدروں میں گھس جاتا ہے۔ نکما کہیں کا۔"

چچی کی تیز چبھتی ہوئی آواز پر فصیح اس پر ایک تھکی ہوئی نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

وہ گم صم کیفیت میں کھڑی کچھ سوچنے لگی۔

❁ ❁ ❁

"بھلے وہ تین سال بعد آئے یا تین ہزار سال بعد بس اتنا یاد رکھو زہرہ خاتون! وہ اس حویلی کی دہلیز کو چھونے کی حق دار بھی نہ ہو گی۔ میں اسے یہ اختیار بھی نہیں دوں گا کہ وہ اس قصبے کی زمین پر قدم بھی رکھے۔ اس سے کہنا خود کو وہیں کہیں شہر میں غرق کر لے۔ لاہور چھوٹا موٹا شہر نہیں ہے۔ اسے بھی کہیں نہ کہیں پناہ مل ہی جائے گی۔ آخر اتنا عرصہ بھی تو رہی ہے نال۔"

ہال کمرے میں ابا جی کی گھن گرج نے جہاں بہت سوں کو متوجہ کیا وہاں ناشتے کے لیے نیچے آتی زرتاب کو بھی قدم اس طرف موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے دیکھا ہال کمرے میں کوئی بھی نہیں جا رہا تھا سب آس پاس بظاہر کسی بے کار سے کام میں مشغول تھے۔

اندر صرف اماں جی اور ابا جی تھے۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے چھپ کر اس چھوکرے کے ساتھ جاتی رہی ہو اس سے ملنے۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو زہرہ! وہ اس گھر میں آئی تو میں زہر کھا لوں گا۔"

"خدا نہ کرے۔" اماں جی ہول کر رہ گئیں۔

"لیکن میری بات تو سنیے۔ وہ اتنے برس بعد باہر نکلے گی۔ پیسہ دھیلا' روزی روٹی کہاں سے کرے گی وہ۔" اماں جی کے لہجے میں منت تھی۔

"کیوں! اتنے سال سے جیل میں ہے۔ خوب ہی سیکھ گئی ہو گی زندگی گزارنے کے ڈھنگ۔ ارے تم دیکھنا۔ چند سال بعد رہا ہو کر آئے گی تو کیسی "گنوں" والی بن چکی ہو گی۔ جیل میں کس ٹائپ کی عورتیں ہوتی ہیں تمہیں نہیں معلوم کیا! جرائم پیشہ' چرسی' شرابی' دھندے والی' جعل ساز' چور......"

ابا جی کے لہجے میں طنز اور تلخی تھی۔

زرتاب کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

اس نے آہٹ پر گردن موڑ کر دیکھا۔ فصیح نجانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

سودے سلف کا بھاری تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ آنکھیں لہو رنگ تھیں اور چہرہ خطرناک حد تک پیلا۔

اس نے اذیت کی تیز لہر کو دبانے کے لیے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ زرتاب کو اس بدقسمت شخص پر جی بھر کے رحم آیا۔

تقدیر نے اس کے ساتھ کیسا مذاق کیا تھا۔

غالباً" وہ یہی بتانا چاہ رہا تھا کل۔

"معاشرے نے مجھے جو کچھ دینا تھا دے دیا۔ اس سے زیادہ میرے لیے اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

زرتاب کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔

"عالیہ! تم جانتی تھیں یہ سب......؟" اس نے موقع پاتے ہی اسے پکڑ لیا۔

"قسم لے لو جو گھر میں کبھی ایسا ذکر بھی ہوا ہو......" وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"ہمیں تو یہی پتا ہے کہ طیبہ پھوپھو کہیں روپوش ہو گئی تھیں۔ اصل حقیقت سے امی اور چچی لوگ ہی واقف ہوں گے اماں جی اور ابا جی کے علاوہ۔ لیکن وہ جیل کیوں گئیں؟ کس جرم میں اور اتنے ڈھیر سارے سال۔ اوہ مائی گاڈ۔"

اب وہ اس چکر میں تھی کہ فصیح سے سچ اگلوائے۔

"کیا کریں گی آپ یہ سب کچھ جان کر۔" فصیح کا لہجہ سخت اور قدرے غصیلا تھا۔

"کیا کروں گی؟ ارے بھئی وہ میری سگی پھوپھو ہیں۔ ان کے ساتھ جو بیتی ہے اس کو جاننے کا مجھے پورا حق حاصل ہے۔"

"تاکہ سن کر میری بے بسی اور لاچاری کا مزید مذاق اڑا سکیں۔" وہ استہزائیہ گویا ہوا۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ گھٹتا ہوا تھا شاید وہ یہ سب کچھ زرتاب سے چھپانا چاہتا تھا' شومئی قسمت کہ ابا جی کی زبانی اس پر سب کچھ افشا ہو گیا۔

"پلیز فصیح! مجھے بتاؤ۔ طیبہ پھوپھو کے ساتھ کیا ہوا۔ پلیز مجھے اپنا ہمدرد سمجھو اور ایک بات جان لو تمہارا ماضی کچھ بھی رہا ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تمہاری عزت اور وقار اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اس گھر کے کسی فرد کا۔ تم خود کو اس گھر سے یہاں کے مکینوں سے الگ کیوں سمجھتے ہو۔ پلیز فصیح! مجھے

بتاؤ تاکہ صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملے۔"

"کیا بتاؤں؟" وہ ہار کر بولا "میرے پاس بتانے کو کچھ بھی اچھا نہیں ہے زرتاب بی بی۔"

اب وہ اس کی طرف پشت کر چکا تھا۔

"میرے والد کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ شہر میں رہتے تھے۔ آپ کی طیبہ پھوپھو اس زمانے میں شہر سے ایف اے کر رہی تھیں۔ ابو ایک ہوٹل میں منیجر تھے۔ کہیں اتفاق سے ان کی ملاقات ہو گئی اور پھر یہ ملاقات پسندیدگی میں بدل گئی۔ اباجی نہیں مانے اور امی گھر چھوڑ کر ابو کے پاس آ گئیں شادی ہو گئی۔ پھر میں پیدا ہوا۔ میں اس وقت چھ سات سال کا ہوں گا جب امی ابو کے جھگڑے انتہاؤں کو چھونے لگے یہ جھگڑے تو شادی کے ابتدائی سال میں ہی شروع ہو گئے تھے مگر اب مجھے بھی ان کی سمجھ آنے لگی تھی۔ ایک دوسرے پر الزامات تم نے مجھے تباہ کیا' تمہاری وجہ سے میری زندگی برباد ہوئی۔ تم ہی بھاگ کے آئی تھیں میرے پاس' تم نے ورغلایا تھا مجھے وغیرہ وغیرہ۔

پھر ابو کسی اور عورت میں دلچسپی لینے لگے۔ اس سے دوسری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ امی غصے سے آتش فشاں بن گئیں۔ آئے دن لڑائیاں مجھے یاد ہے اس روز ابو اپنے پہلو میں ایک سجی سنوری حسین عورت کو لیے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے سرخ کامدار کپڑے اور ڈھیروں زیور پہن رکھا تھا۔

امی اس وقت تیز دھار چھری سے سبزی کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے فاتحانہ چہرہ اور پہلو میں دلہن لیے کھڑے ابو کو دیکھا پھر ہر منظر ان کی نظروں میں دھندلا گیا۔ چھری بے انتہا تیز تھی۔ وہ اٹھیں۔ چھری والا ہاتھ پشت پہ تھا۔ ابو کے قریب آئیں۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ چھری سیدھا ابو کے پیٹ میں اتار چکی تھیں۔ ابو کے لیے یہ افتاد ناگہانی تھی جب تک سمجھ پاتے زخمی ہو کر گر چکے تھے۔

"میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے عبدالاحد! میں نے کہا تھا نا میں ساری کشتیاں جلا کر تمہارے پاس آئی ہوں واپسی کا ہر دروازہ بند کر کے۔ اگر تم نے مجھے دھوکہ دیا تو میں تمہاری جان لے لوں گی اور اس کی بھی جو میرا گھر برباد کرے گی۔" وہ وحشت کے عالم میں بول رہی تھیں۔

وہ خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا.....؟" زرتاب نے جھرجھری لے کر پوچھا تھا۔

"پھر کیا ابو موقع پر دم توڑ گئے۔ وہ عورت تھانے چلی گئی۔ امی کو گرفتار کروا دیا۔ مقدمہ چلا۔ امی سے ان کے لواحقین کا پتہ لیا گیا تو انہوں نے جانے کیا سوچ کر اس حویلی کا ایڈریس دے دیا۔ اباجی اور بڑے ماموں کو آنا پڑا' پیشی پڑ اماں جی اپنی بیٹی کو سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر نیم پاگل سی ہو گئی تھیں۔

بڑے ماموں نے اونچا وکیل کروا کے امی کو سزائے موت سے تو بچا لیا مگر عمر قید مع جرمانہ بہر حال امی کا مقدر ٹھہری جرمانہ اباجی نے ادا کر دیا تھا۔

بڑے ماموں کے اصرار' اماں جی کی آہ و زاری اور چھوٹے ماموں کی رضامندی کے بعد اباجی بادل نخواستہ مجھے جیل سے گھر لے آئے۔ ایک اور بڑی جیل میں جہاں میرا جسم تو آزاد ہے مگر روح قید ہے۔"

اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔ وہ ابھی تک اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

زرتاب دھیرے دھیرے چلتی اس کے سامنے آئی تو دھک سے رہ گئی۔

وہ اونچا لمبا کڑیل مرد آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

تقدیر نے کیسا کاری وار کیا تھا اس پر۔

"میں ہر ماہ ان سے ملنے جاتا ہوں۔ کبھی کبھار اماں جی بھی چھپ کر میرے ساتھ چلی جاتی ہیں۔ پچھلی ملاقات میں امی نے بتایا کہ ان کے اچھے چال چلن اور جیل میں عورتوں کو پڑھانے کے باعث جیل کے حکام نے ان کی سزا میں دو سال کی تخفیف کر دی ہے۔ یعنی اب وہ تین سال بعد رہا ہو جائیں گی۔" وہ دھیرے سے گالوں پر بہتے پانیوں کو ہتھیلی میں چن کر ایسے ہو گیا جیسے کبھی یہ دل موم ہوا ہی نہ ہو۔

"میں تو کہتا ہوں کیا ضرورت ہے رہا ہو کے آنے کی' وہیں رہیں۔ اس دنیا میں اب ان کے لیے کیا رکھا ہے۔" وہ بے رحمی سے بولا۔

"بہت بری بات ہے فصیح! تم اس درجہ مایوس اور بد دل کیوں ہو۔"

"آپ میری جگہ ہوتیں تو میں آپ سے پوچھتا۔" وہ تلخی سے بولا۔

"جانتے ہو میں تمہاری جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں ارادے کی شفاف چمک نمایاں تھی۔

"میں تمہاری جگہ ہوتی تو کبھی دنیا کی باتوں کی پروا نہ کرتی بھلے وہ آپ کو ایک قاتل ماں اور ایک دھوکے باز عیاش باپ کی اولاد کہتی رہتی؟"

وہ سرخ طنزیہ نگاہیں اس پہ گاڑ کے بولا۔

"کسی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات اپنے ضمیر کے سامنے بہادری سے کھڑا ہونا ہے۔ اگر تم ضمیر کی عدالت میں قصوروار نہیں ہو تو دنیا سے ڈرنے یا ان سے چھپ کر پس منظر میں چلے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں جانتی ہوں کہ میں نے غلط کام نہیں کیا اور میں کسی طرح بھی مجرم نہیں ٹھہرتی ہوں تو میں دنیا کی باتوں کو سوچ کر اپنے دل کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گی بلکہ حوصلے کے ساتھ آگے دیکھوں گی۔"

فصیح کی سوالیہ نگاہیں اس پر جمی رہیں۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں سب سے پہلے معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتی۔ جس کا سب سے اہم اور اولین ذریعہ تعلیم ہے۔ تعلیم مکمل کر کے ایک اچھی جاب کا حصول اور....."

"بہت خوب۔" وہ حد درجہ تلخی سے اس کی بات کاٹ کر گویا ہوا۔

"اپنے بیک گراؤنڈ میں اتنی ساری خوش نما ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ سجا کے میں اس معاشرے میں باعزت مقام حاصل کر سکتا ہوں۔ کیا مذاق ہے۔ کیا لطیفہ ہے۔ یہ میرا بھیانک ماضی اور اس کے داغ میرا پیچھا نہیں کریں گے؟ کیا معاشرے میں عزت حاصل

کرنے دیں گے؟ محترمہ زرتاب صاحبہ! آپ کس مستقبل کی بات کر رہی ہیں۔ ہونہہ۔" وہ طنزاً" سر جھٹکنے لگا۔ جیسے کسی چھوٹی سی بچی نے بچکانہ بات کہہ دی ہو۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔" وہ زور سے چلائی تھی۔

"بہت کچھ ہوتا ہے اس دنیا میں۔ لیکن سب ریت پہ لکھا نقش ثابت ہوتا ہے۔ جو وقت کی اگلی ہی تیز لہر میں بہہ جاتا ہے۔ جب کسی قابل بن جاؤ گے تو کوئی نہیں پوچھے گا تم سے تمہارا بائیو ڈیٹا۔ سب مرتبے اور طاقت کو سلام کرتے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو اس شہر میں نہ سہی کسی دوسرے شہر میں جا کر جاب کر لو' وہاں گھر لے لو کرائے پر۔ امی جیل سے رہا ہو کر آئیں گی تو انہیں بھی خاموشی سے وہیں لے جانا اور نئے سرے سے زندگی شروع کرنا وہاں کوئی تمہارے ماضی کو نہیں جان سکے گا جب تک کہ تم خود منہ سے نہیں بتاؤ گے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

فصیح بہت دیر تک مسمرائز ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ یک ٹک اسے دیکھتا ہوا جانے خیال کے گھوڑے کہاں کہاں دوڑا رہا تھا۔

"اور.... اگر۔" بہت دیر بعد اس نے آہستگی سے سوال کیا۔

"اگر کسی جاننے والے سے آمنا سامنا ہو گیا تو۔"

اس کے انداز سے واضح تھا کہ زرتاب کا آئیڈیا سیدھا اس کے دل کو لگا تھا۔

"تو کیا ہو گا۔" وہ تحقی ولاپروائی کے ملے جلے انداز میں بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے کوئی آشنا مل گیا تو وہ تمہارے گھر کے آگے مجمع لگا کے چیخ چیخ کر لوگوں کو تمہاری اور تمہاری امی کی اصلیت بتائے گا؟ ارے کچھ بھی نہیں ہو گا بے وقوف آدمی! وہ تم سے سلام دعا کرے گا یا زیادہ سے زیادہ طنز کرے گا اور اپنی راہ لے گا اور یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے جس پر گہری ریسرچ کی جائے....."

"پھر بھی آخر کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو پتا چل سکتا ہے جہاں میں رہوں گا یا جاب کروں گا....."

وہ متذبذب تھا۔

"بے شک دنیا اتنی بڑی نہیں ہے مگر اب اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ ہر دوسرے موڑ پر آپ کو جان پہچان کا بندہ ٹکرا جائے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ بدنام زمانہ لوگ ایک محلے سے اٹھ کر دوسرے محلے میں جاتے ہیں تو اپنی نئی شناخت اور مقام بنا لیتے ہیں اور لوگ بلا حیل و حجت کے اس پر یقین بھی کر لیتے ہیں اور پھر تم تو شہر ہی بدل لو گے ایسا کرنا اسلام آباد یا پنڈی جا کر رہائش پذیر ہو جانا۔ اور یوں بھی آج کل تو ہمسائے کو ہمسائے کی خیر خبر نہیں ہوتی تم شہروں کی بات کرتے ہو' کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تمہیں صرف اور صرف ایک مضبوط ارادے اور ایک بھرپور مقصد کی ضرورت ہے۔" فصیح بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اچانک ہی اردگرد کے سارے منظر صاف ہو گئے تھے۔ سوچوں پہ لگے جالے ہٹ گئے تھے اور آگے راستہ دکھائی دینے لگا تھا۔

"آپ نے تو اپنی باتوں سے مجھے مسحور ہی کر ڈالا زرتاب بی بی! میں خود کو کسی دوسرے سیارے سے آیا ہوا تصور کرنے لگا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے کہ اتنا عرصہ میں کسی تاریک دنیا میں صبح و شام کرتا رہا ہوں آج زمین پر آیا ہوں اور قدم جما رہا ہوں۔"

وہ بہت ہلکے پھلکے انداز میں مخاطب تھا۔

"یاد رکھو ایک بار پھر۔" وہ مڑتے مڑتے دوبارہ بولی۔

"زندگی یوں بے کار گنوانے کے لیے نہیں ہوتی۔"

"صحیح کہا آپ نے۔" وہ صدق دل سے بولا۔

"یہ تو آپ جیسی چیز کو حاصل کر کے دل میں چھپانے کے لیے ہوتی ہے۔" یہ جملہ اس نے دل میں کہا تھا۔

❁ ❁ ❁

"یہ تم کیا کر رہی ہو زری! کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔ جانتی ہو ابا جی یا گھر کے کسی اور بندے کو بھنک بھی پڑ گئی تو تمہارے ساتھ اور فصیح کے ساتھ کتنا برا ہو گا۔" وہ بی اے کی انگلش لٹریچر کی بک سے پوئم کی سمری بنا رہی تھی جب عالیہ نے کڑے تیور لیے اسے مخاطب کیا تھا۔

"جو راستہ تم اس کو دکھا رہی ہو وہ تمہارے لیے بھی خطرناک ثابت ہو گا اور اس کے لیے بھی۔"

اب وہ پریشانی کے عالم میں اس کی کرسی کے بازو بیٹھ گئی۔

"ارے بھئی پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔ ہلا دیا نا پین۔"

"جہاں بیٹھ کر بھی بات کروں گی یہی بات ہو گی آج۔" عالیہ نے اس کے ہاتھ سے رجسٹر لے کر سائیڈ پہ رکھ دیا۔

"تم کیوں ابا جی اور چچا لوگوں کی مخالفت میں چل رہی ہو۔ جانتی ہو گھر میں فصیح سے کس درجہ نفرت آمیز سلوک کیا جاتا ہے!" وہ اسے ڈپٹ رہی تھی۔

"اور تم ہو کہ صاحب کا مستقبل سدھارنے کی فکر میں ہلکان ہو رہی ہو۔"

"میں کچھ نہیں کر رہی۔ میں نے تو صرف راستہ دکھایا ہے۔ اس پر چل تو وہ رہا ہے۔"

"مگر تم ہر قدم پر اس کا ساتھ دے رہی ہو۔"

وہ خفگی سے زرتاب کو گھورنے لگی۔

"اگر یہ غلط ہے تو ہاں یہ غلطی میں کر رہی ہوں لیکن بغیر کسی لالچ یا فائدے کے' ایک شخص میری آنکھوں کے سامنے ضائع ہو رہا تھا۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ کبھی ایک مرد کا سہارا بکھری ہوئی عورت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عورت ٹوٹے ہوئے پیڑ کی طرح گرے ہوئے مرد کے بچے حوصلوں کو جمع کر کے اسے پھر سے تناور درخت بنا دیتی ہے۔" زرتاب کا لہجہ ٹھوس تھا۔ عالیہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہاری کیا دلچسپی ہے اسے تناور درخت بنانے میں' سچ سچ بتاؤ؟"

"حد ہو گئی قسم سے۔" وہ بری طرح تپ کر کرسی سے اٹھی تھی۔ مگر عالیہ پر اس کے بھڑکنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"اگر بالفرض اسے گھسیٹ کر کھڑا کر بھی دیا تو کہاں تک چل پائے گا' وہ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ الہ دین کے چراغ کا جن دنوں میں اس کی حالت بدل دے اور پھر تمہارے مقابل آنے تک اسے بہت وقت لگے گا اور تم مزید انتظار کی پوزیشن میں نہیں ہو ابا جی آج کل میں تمہارا عباد بھائی سے رشتہ پکا کرنے والے ہیں۔ پھر کیوں ایک سادہ دل انسان کو آس دلا کر اسے عمر بھر کے لیے ملال بخشتی ہو۔"

"شٹ اپ عالیہ۔" وہ اشتعال سے کانپنے لگی۔

"نہ میرا فصیح سے ایسا کوئی ریلیشن ہے اور نہ عباد بھائی کے سلسلے میں میرا کوئی رجحان ہے۔ کہہ دینا اماں جی سے۔" وہ بری طرح ہونٹ چبا رہی تھی۔

"وہ تو جب مجھ سے' تم سے پوچھیں گی تب ہی بات ہو گی مگر جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟" عالیہ سابقہ پرسکون موڈ میں تھی۔

"اس کا اور تمہارا کوئی میل نہیں زرتاب! یہ کبھی بھی ممکن نہیں ہو سکے گا۔"

"میرا دماغ ابھی اتنا خراب نہیں ہوا۔" وہ گھور کر عالیہ کو دیکھنے لگی۔

"اگر نہیں ہوا تو بہت اچھی' بہت ہی اچھی بات ہے اور اگر ایسے کسی چور جذبے نے خفیہ طریقے سے تمہاری سوچوں تک سرنگ بنالی ہے تو اس جذبے کو فوراً" ختم کر دو' پنپنے سے پہلے ہی اس کا گلا گھونٹ دو اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"اگر تم نے دوبارہ ایسی بات کی تو میں تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی آئندہ۔" وہ غضب ناک ہو گئی۔

"اوکے' اوکے بابا! میں سمجھ گئی عالیہ ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بی بی خدمت خلق! جو بھی کرنا اپنا دامن بچا کر کرنا۔ اچھا آؤ ذرا باہر کا ایک چکر تو لگا کے آئیں۔ آج میں تمہیں اپنی ڈرائیونگ کے جوہر دکھاتی ہوں۔"

"کیا! تم نے ڈرائیونگ سیکھ لی!"

"اور کیا یار! عباد بھائی کی تھوڑی سی منت خوشامد کے بعد ان سے ڈرائیونگ کی الف بے کی ٹریننگ لے ہی لی۔ تم بھی ان سے سیکھ لو نا۔ تمہیں تو وہ خوشی خوشی سکھائیں گے۔"

عالیہ نے شرارت سے ایک آنکھ بند کی' زرتاب نے غصے سے کشن اٹھا کے دے مارا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بہار کا موسم کیا ختم ہوا قہر بھرا موسم گرما جان کو آ گیا۔ سردیاں کہر آلود ہوتی ہیں اور گرمیاں قہر آلود' کیا بات ہے بھئی۔"

عالیہ قیمہ پیستے ہوئے خود ہی اپنی بات سے محظوظ ہوئی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔

"وہ جو تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں تمہاری یہ بھبکے اڑاتی حالت دیکھ لیں تو شاید دروازے سے ہی پلٹ جائیں۔"

سمن نے ناک چڑھا کر عالیہ کو دیکھا تھا۔

"کیوں کیا ان کے ہاں گرمیاں نہیں آئیں یا انہوں نے کچن میں بھی اے سی لگوا رکھے ہیں؟"

عالیہ تنک کر بولی۔

"یہ تو اب تم ان ہی سے پوچھنا۔ بائی داوے چھکا چھک ٹرین سے آ رہے ہیں یا اپنی گاڑی استعمال کریں گے۔"

"ابھی وائرلیس پہ رابطہ کر کے پوچھتی ہوں۔"

عالیہ فرمانبرداری سے برجستگی کا مظاہرہ کر گئی۔

مٹن کڑاہی کے لوازمات جمع کرتی زرتاب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سمن نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ وہ یوں بھی آج کل حد سے زیادہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔ رضوان سال بعد ایک ماہ کی چھٹی گزار کر پھر واپس امریکہ چلا گیا تھا۔ اسے ساتھ لیے بغیر اس کی پڑھائی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

انتظار کی آگ میں جلتی سمن کے لیے آنے والی تنہا اور انتظار سے بوجھل گھڑیاں مزید طویل اور مہیب ہو گئی تھیں۔ وہ دن بھر بے قرار اور بے چین پھرا کرتی۔ راتوں کو نیند کی گولیاں لے کر سوتی تھی۔

"بہت غصہ آ رہا ہے مجھے تمہارے بھائی پر۔" وہ پلٹ کر خوامخواہ زرتاب سے الجھ گئی تھی۔

"تو سنا تھا نندیں بھابھیوں پر حاوی رہا کرتی ہیں۔ یہاں بھابھی نند کے کان کتر رہی ہے۔" عالیہ نے ٹھٹھا لگایا۔

"اب وہ پڑھائی مکمل کر کے لوٹے گا مائی ڈیر بھابھی سمن جی!۔" زرتاب نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"یہ پڑھائی تو میری سوتن ہی بن گئی ہے۔" وہ پیر پٹختی کچن سے باہر آ گئی۔

"بے چاری۔" زرتاب کی افسوس بھری نظروں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ "میرا بس چلے تو رضوان بھائی کو کان سے پکڑ کے لے آؤں۔ میں اسی لیے اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں تھی۔ میں چاہتی تھی پہلے رضوان پڑھائی مکمل کر کے وطن واپس آ جائے اور یہاں آ کر سیٹل ہو جائے تو شادی کا سلسلہ شروع ہو۔ مگر اباجی اور اماں جی کو بے اختیاری تھی۔ بے وجہ اس غریب کی سیدھی سادی زندگی کو انتظار اور اضطراب کا نمونہ بنا دیا ہے۔"

"خیر ان صاحب کو بھی خوب ہی "آفر" آئی ہوئی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کل کی ہوتی آج ہو جائے۔ اب بھگتے جلد بازی میں کی گئی شادی کا خمیازہ۔"

عالیہ صاف گوئی سے بولی۔

"یہ جو تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں یقیناً" اباجی یا اماں جی کے جاننے والے ہوں گے....." زرتاب نے بات کا رخ بدلا۔

"ظاہر ہے۔" عالیہ انہماک سے شامی کباب کی ٹکیاں بنا رہی تھی۔

"لڑکا کیا کرتا ہے....؟"

"یہ بھی اباجی یا اماں جی کو ہی معلوم ہو گا؟" عالیہ نے کندھے اچکائے۔

"کچھ خبر تو رکھتیں۔ کہیں ایسے ویسے کے ساتھ نہ رخصت کر دیں۔" زرتاب کو پریشانی لاحق ہوئی۔

"جو میری قسمت میں ہو گا اس سے فرار بہرحال ممکن نہیں ہے' جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"خدا کرے اچھا ہی دیکھنے کو ملے۔" زرتاب نے دعا کی۔

☼ ☼ ☼

عالیہ کی منگنی دھوم دھام سے کی گئی تھی' یہاں کے رواج کے مطابق لڑکے والوں کی ساری برادری اور اباجی اور اماں جی کے پچاس ساٹھ جاننے والے رشتہ داروں اور دوست احباب کو بمعہ فیملی دعوت دی گئی تھی۔

شام ہی سے لڑکیوں بالیوں نے ڈھولک سنبھال لی تھی اور زرتاب حسب عادت اس دھوم دھڑکے والے پنجابی گانوں کے شور سے بچنے کے لیے پچھلے صحن میں پناہ لے چکی تھی۔

"کیا بات ہے۔ آپ یہاں آ کر کیوں بیٹھ گئیں۔؟" فصیح اسے ڈھونڈتا ہوا پچھلے صحن میں آیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اسے یہیں ملے گی۔

"مجھ سے شور برداشت نہیں ہو رہا تھا۔"

"کیا آپ کو شادی بیاہ کے گانے پسند نہیں ہیں؟" فصیح نے بغور اس کا سراپا دیکھا۔

سیاہ مقیش کے سوٹ میں اس کا چہرہ کم روشنی میں بھی دمک رہا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا....؟" وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"آپ رضوان صاحب کی شادی پر بھی یہیں آ کر چھپ گئی تھیں۔ میری اور آپ کی پہلی بالمشافہ ملاقات یہیں ہوئی تھی۔"

"اوہ....." اسے سمجھ میں نہ آیا اس بات کا کیا جواب دے۔

"تمہارے بی اے کے پیپرز کیسے ہوئے؟"

"بہت اچھے' اکنامکس کا تو بہت ہی اچھا ہوا' اور انگلش لٹریچر کی تو ساری تیاری آپ نے ہی کروائی تھی ویسے پرچے دیتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں بی اے کے امتحان میں بیٹھنا بہرحال ایک پُرمزاح تجربہ ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"مجھے امید ہے تم بہت اچھے نمبروں سے بی اے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اب رزلٹ کا انتظار نہ کرو اور ایم اے اکنامکس کا کورس شروع کر دو۔ اگلے سال تمہیں پارٹ ون اور پارٹ ٹو دونوں کے پیپرز اکٹھے دینے ہیں۔ یہ تمہاری دل' تمہاری محنت اور ہمت کا امتحان ہے۔ مشکل تو بہرحال پیش آئے گی مگر مجھے یقین ہے یہ سال گزرتے دیر نہیں لگے گی اور تم خود کو ثابت کرنے میں ضرور کامیاب رہو گے۔"

اور فصیح نے اس کی امیدوں پر پورا اترنے کے لیے جان لڑا دی۔ اس کی اتنی بے رنگ' پھیکی اور ویران زندگی میں یہی تو ایک پُربہار دریچہ تھا۔

وہ اس کے لیے سرتاپا بہار کی علامت تھی۔ جیسے بہار آتی ہے تو ہوائیں ٹھنڈک پہنچاتی ہیں۔ وہ اس کے دل کی ٹھنڈک تھی۔

بہار آتی ہے تو پھول رنگ اور خوشبو بکھیرتے ہیں۔ وہ اس کی سوچوں کے آنگن کا پھول تھی۔

بہار آتی ہے تو نرم گرم سی دھوپ سارے منظر روشن کر دیتی ہے۔ وہ اس کی سرد و برفیلی صبحوں کی تر و تازہ اور حرارت بخش دھوپ تھی۔

وہ صرف اس کا تصور کر کے ہی بشاش ہو جاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پہلے تو تم اپنی تنخواہ میری ہتھیلی پہ رکھا کرتی تھیں۔ اب اتنے عرصے سے ایک دھیلا بھی نہیں دیا۔ کیا کرتی ہو اتنے پیسوں کا.....؟"

اماں جی بہت غور سے زرتاب کی صورت دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنے پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے عالیہ کے ہاتھ پیغام دے کر زرتاب کو بلایا تھا۔

زرتاب کو ان کی تفتیشی نظروں اور جارحانہ لب و لہجے سے خوف آنے لگا۔

"وہ اماں جی! اصل میں چیک ملتا ہے نا۔ میں وہیں سے اپنے بینک میں جمع کرا دیتی ہوں۔" وہ ہکلا کر بولی۔

"تو پھر فصیح کی کتابوں اور امتحان میں بیٹھنے کے لیے داخلہ فیس کون جمع کراتا ہے۔"

اماں جی بہت گہری نظروں سے اس کا چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔

زرتاب پسینے میں نہا گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تاہم کچھ دیر بعد اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"تو بتاؤ ہماری ناک کے نیچے کھیل کھیلا جاتا رہا اور ہم بے خبر رہے شک تو مجھے بھی کئی بار ہوا تھا کہ وہ بدبخت بہانے بہانے سے تمہارے گرد منڈلاتا رہتا ہے مگر تمہارے مزاج اور رکھ رکھاؤ کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے اماں جی! میں نے صرف ہمدردی کے ناتے اس کی مدد کی ہے تاکہ وہ کچھ بن جائے۔ اپنے لیے کچھ کر سکے۔"

"اس نے جو بننا تھا وہ بن چکا۔" وہ درشتی سے بولیں۔ "وہ کچھ بھی بن جائے رہے گا ہمارے قدموں کے نیچے۔ کون سی پٹیاں پڑھانے چلی ہو اسے بی بی! ہوش کے ناخن لو۔ اگر یہ صرف ہمدردی ہے تو عباد کے رشتے سے انکار کیوں کر رہی ہو؟ بہانے بہانے سے ٹال رہی ہو ہمیں۔ اب تو تمہارا اسپیشلائز بھی ہو گیا۔ اب کیا رکاوٹ ہے بولو؟" وہ ان کے لہجے کی سختی سے خائف ہو گئی۔

"اماں جی...!" کچھ دیر بعد وہ جھجکتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئی۔

"میری بات چھوڑیں۔ صرف فصیح کی بات کریں۔ اماں جی! وہ آپ کا نواسہ بھی تو ہے۔ صرف طیبہ پھوپھو کے شوہر کا بیٹا نہیں ہے' طیبہ پھوپھو کا بھی بیٹا ہے۔ اور پاپا بتایا کرتے تھے کہ آپ طیبہ پھوپھو کو سب سے زیادہ چاہتی تھیں۔ بہت لاڈلی بیٹی تھی وہ آپ کی۔ پھر ان کی نشانی' ان کی اولاد کے ساتھ اتنا حقارت آمیز سلوک کیوں؟"

اماں جی کے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔

"مر گئی میرے لیے وہ..." وہ بھرائی ہوئی ناراض آواز میں گویا ہوئیں۔

"مر گئی ہیں تو پھر چوری چھپے ان سے ملنے جیل کیوں جاتی ہیں؟" اس کی بات سن کر اماں جی کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ ان کے ہاتھ واضح طور پر کانپنے لگے۔

"ہمیں تو مار ہی دیا ہے اس نے۔ گھر چھوڑ کر شادی کرنا کیا کم رسوائی تھی جو اس کو قتل کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے عمر برباد کر کے ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی۔"

"تو آپ نے ان کی ضد پر ان کی خود شادی کیوں نہ کرائی۔" اس نے جرح کی۔

"ہم سمجھ رہے تھے گھر چھوڑ جانے کی دھمکی سن کر وہ خاموش ہو کر بیٹھ جائے گی مگر وہ تو سچ مچ ہمیں چھوڑ گئی۔ ہمارے مقابلے میں اس شیطان کو چن لیا' کیا ملا' خود بھی تباہ ہوئی اور ہمیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ اس لڑکے کو دیکھتی ہوں تو اپنی بیٹی کی بربادی کا زخم پھر سے تازہ ہو جاتا ہے۔"

"جو سلوک آپ لوگ فصیح سے کر رہے ہیں' یہ تو طیبہ پھوپھو کو مزید برباد کرنے اور ظلم ڈھانے کے مترادف ہے۔ ان کا لاڈلا بیٹا یہاں ملازموں سے بدتر حالت میں پڑا ہوا ہے۔ ملازموں کو تو پھر مہینے بھر بعد تنخواہ مل جاتی ہے اس بے چارے کو یہ آسرا بھی نہیں۔ اگر میں نے اس کی ضرورتیں دیکھ کر چند ہزار اسے دے دیے تو آپ کو اتنا ناگوار گزرا کہ آپ نے الٹے سیدھے الزامات کی بوچھاڑ کر دی؟" اب کے اماں جی خاموش رہیں۔

"آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ وہ اس کسمپرسی اور بے بسی کے عالم میں آپ کے پاس کیوں چپکا ہوا ہے۔ وہ جوان ہے۔ عاقل و بالغ ہے۔ ہاتھوں پیروں میں طاقت ہے۔ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ وہ یہاں سے جانا چاہتا تو اسے کون روک سکتا تھا۔ وہ یہاں رہنے کا پابند تو نہیں تھا وہ صرف آپ سے وابستگی' آپ سے محبت اور رشتے کے مان کی خاطر آپ سے جڑا رہا۔

آپ کا کیا خیال ہے آپ نے اسے قید کر رکھا ہے؟ یا اگر وہ یہاں سے گیا تو اسے کہیں پناہ نہیں ملے گی؟ آپ کی غلط فہمی ہے اماں جی! وہ کہیں سے بھی اپنی زندگی شروع کر سکتا تھا مگر اس نے اپنوں کے ساتھ کو ترجیح دی۔ وہ کوئی لڑکی تو نہیں تھا جسے زمانے کی گرم ہوا مرجھا دیتی؟ مرد کے لیے اس دنیا میں بڑی جگہ ہے اماں جی! اس کا ماضی کچھ بھی رہا ہو اسے بھولنے میں یہ دنیا بس چار دن ہی لگاتی ہے۔ ہاں لڑکی کا معاملہ البتہ الگ ہے۔"

"بہت بولتی ہو، تم بہرحال تم اس لڑکے کے معاملے سے دور ہی رہو تو بہتر ہو گا۔ خوامخواہ اپنے ابا جی کے عتاب کو دعوت نہ دو اور عباد کے رشتے کے لیے ..."

"پلیز اماں جی! رضوان کو تو آنے دیں۔ میرا ایک ہی ایک تو بھائی ہے اس بھری دنیا میں۔ کیا میری منگنی یا شادی اپنے سب سے قریبی خونی رشتے کی غیر موجودگی میں ہو سکتی ہے؟"

اس نے بہت سوچ سمجھ کر جذباتی بلیک میلنگ کا یہ نکتہ استعمال کیا تھا جو بہرحال کارگر ثابت ہوا۔

"ٹھیک ہے اب کے رضوان آیا تو اس کے آتے ہی تمہارا فرض ادا کر دوں گی۔ غضب خدا کا اپنی عمر تو دیکھو۔ اس عمر میں تو لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں۔ ارے وقت گزر گیا تو کوئی نہیں پوچھے گا لڑکی!"

"اچھا اماں جی!" وہ خطرہ ٹلتے ہی شکر کرتے اٹھ کھڑی ہوئی اب اسے رضوان کی لمبی مدت تک واپس نہ آنے کی دعا مانگنی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا غضب ہو گیا بھئی میں تو تمہاری اس قدر عادی ہو گئی ہوں کہ سونے سے پہلے تمہیں سارے دن کی کتھا نہ سناؤں تو چین نہیں پڑتا۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے سوتی ہوں۔"

عالیہ بری طرح جھنجھلا گئی تھی۔

"یہ عادت تو تمہیں یوں بھی اب بدلنا ہی تھی۔ شادی کے بعد تو بہرحال میں تمہاری یہ خدمت نہیں کر سکتی تھی۔ چند ماہ کی تو بات ہے۔ پھر تم اپنے نئے گھر روانہ ہو جاؤ گی۔"

زرتاب سوٹ کیس میں احتیاط سے اپنے کپڑے رکھ رہی تھی۔

"ارے تمہیں ذرا دکھ نہیں ہو رہا یہاں سے جانے کا۔؟" عالیہ نے تپ کر اس کے ہاتھ سے ہینگر چھین لیا۔

"کیا کروں، سرکاری آرڈر آیا ہے۔ ٹرانسفر ہوا ہے میرا، نوکری میں ایسا تو بہرحال ہوتا رہتا ہے۔ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ جس پر حیرت کے سمندر میں غوطہ لگانے لگوں۔" وہ پرسکون انداز میں پیکنگ کرتی رہی۔

"تم سرکاری نوکری چھوڑ کر اپنا ذاتی کلینک کیوں نہیں سیٹ کر لیتیں یہاں ویسے بھی اچھے کلینک کی کمی ہے۔"

"وہ بعد کا منصوبہ ہے۔ فی الحال تو نوکری کروں گی۔"

ابا جی اور اماں جی بڑی مشکل سے اسے اکیلا بھیجنے پر راضی ہوئے تھے۔ نوکری چھوڑنے پر بھی حتی الوسع زور ڈالا گیا۔

عباد بھائی بہت مشتعل نظر آ رہے تھے۔

"آخر کیا چاہتی ہو تم؟" وہ غصے کے عالم میں اس کے پاس چلے آئے۔

"کیوں خوامخواہ معاملہ لٹکا رہی ہو۔ واضح جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟"

"کیا جواب دوں۔ یہ تو بڑوں کے معاملے ہیں، یوں بھی ابھی رضوان واپس نہیں آیا۔ وہ آجائے تو بات آگے بڑھے گی۔"

وہ مصلحت سے کام لینے پر مجبور تھی۔

"آپ جا رہی ہیں...؟" فصیح موقع پا کر اس کے پاس آیا تھا۔ اس کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی۔

"ہاں، جانا تو ہو گا، میرا پنڈی ٹرانسفر ہو گیا ہے۔"

"میرے سفر کو ادھورا چھوڑ کر جا رہی ہیں۔" اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔

"کیونکہ مجھے یقین ہے باقی کا سفر تم بڑی سہولت سے طے کر لو گے۔ وقت کم ہے۔ ایم اے کے امتحانات سر پر ہیں۔ اس وقت سب کچھ بھول جاؤ اور پوری توجہ پیپرز پر رکھو۔ اس کے بعد یہاں یا کسی اور شہر میں اچھی جاب کی تلاش شروع کر دینا۔"

"یہ مراحل آپ کے بغیر کیسے طے کروں گا؟" وہ واضح طور پہ اداس دکھائی دے رہا تھا۔

"اب یہ سارے مرحلے ہی آسان ہیں۔"

"مگر میں خود کو کیسے سمجھاؤں کہ آپ کا ساتھ صرف اندھیروں تک میرے ساتھ تھا، روشنی آتے ہی آپ مجھے اس کی چکا چوند میں الجھا کے خود سائیڈ پر ہو گئی ہیں۔"

"اچھا چھوڑو یہ باتیں، کچھ اور کہو۔"

"کہہ دوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

تم جو پل بھر کو ٹھہر جاؤ تو یہ لمحے بھی
آنے والے کئی لمحوں کی امانت ہو جائیں
تم جو ٹھہر جاؤ تو یہ رات یہ مہتاب
یہ سبزہ یہ گلاب اور ہم دونوں کے خواب
سب کے سب ایسے مبہم ہوں کہ حقیقت ہو جائیں
تم ٹھہر جاؤ کہ عنوان کی تفسیر ہو تم

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پڑھ رہا تھا۔ زرتاب کا دل یوں کانپا جیسے شدید طوفان باد و باراں میں گھرا ڈولتا ہوا جہاز۔

تم سے تنگ اوقات کا موسم بدلے
رات تو کیا بدلے گی حالات تو کیا بدلیں گے
تم جو ٹھہر جاؤ تو میری ذات کا موسم بدلے
مہرباں ہو کے نہ ٹھہرو تو پھر یوں ٹھہرو
جیسے پل بھر کوئی خواب تمنا ٹھہرے
جیسے درویش مدح نوش کے پیالے میں کبھی
ایک دو پل کے لیے نئی دنیا ٹھہرے
تم ٹھہر جاؤ کہ مدارات کے مے خانے سے
چلتے چلتے کوئی ایک آدھ سبو ہو جائے
اس سے پہلے کہ کوئی لمحہ آئندہ کا تیر
اس طرح آئے کہ پیوست گلو ہو جائے

"پلیز فصیح۔" زرتاب نے بہت سنجیدگی اور خفگی سے قدم آگے بڑھا دیے۔

"میں نے تو صرف ایک نظم سنائی ہے۔" وہ انجان بن کر سادگی سے وضاحت کرنے لگا۔

"آپ کو کیا لگا؟" اس نے متبسم نگاہ اس پر ڈال کر چہرہ موڑ لیا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ خائف سی ہو کر باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

پنڈی ٹرانسفر کے بعد اس کی زندگی بہت مصروف ہو گئی۔ وہ وہاں ہاسٹل میں رہتی تھی اکثر دو ہفتے بعد ویک اینڈ پر گھر آجاتی تھی۔ وقت کچھ اور آگے سرکا۔

رضوان کو ابھی تک واپس آنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ عالیہ کی شادی ہو گئی اور بالآخر فصیح نے ماسٹرز کے پرچے دے دیے تھے۔ اور جب چھ ماہ بعد رزلٹ آیا تو فصیح کو اپنی اس کامیابی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔

اسے آج اپنا آپ بہت مضبوط اور مکمل محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے اب اس کے پاس سر اٹھا کر چلنے کی طاقت آگئی ہے۔

"اب میں اپنے لیے اور اپنے سے وابستہ رشتوں کے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔" اس نے طمانیت سے سوچا۔ زرتاب نے جانے سے پہلے کہا تھا۔

"تمہاری جگہ یہاں نہیں ہے فصیح! تمہارا گھر وہ ہو گا جو تم اپنے لیے اور اپنی ماں کے لیے بناؤ گے۔ یہاں تم ایک مہمان ہو اور مہمانوں کو گھر والوں پر غیر ضروری بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ تمہاری فیملی تمہاری ماں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔"

"اور تمہارے ساتھ بھی۔" اس نے سوچا۔

"صاحبزادے کے بڑے پر نکل آئے ہیں۔ ذرا پوچھیں تو نوابزادے سے آج کل شہر کے بار بار چکر کیوں لگائے جا رہے ہیں۔" عباد کا لہجہ نفرت سے سلگ رہا تھا۔

ابا جی نے کافی بگڑے تیوروں سے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ جہاں عباد بھائی پہلے سے موجود تھے۔

"کیوں بھئی خبیث کے پتر! کہاں دفع ہوتے ہو روز روز....." ابا جی بھڑک کر شعلہ بن گئے۔

"میں نوکری کی تلاش میں جاتا ہوں۔" ادب مانع تھا اس لیے سر جھکا کر جیسے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔

"بہت خوب' اب یہ دو ٹکے کا انسان نوکری کرے گا۔ اپنی مرضی کرے گا۔" عباد بھائی نے طنزیہ اس کی طرف دیکھا۔

"کس سے پوچھ کر تم یہ سب کر رہے ہو۔" ابا جی نے دانت پیس کر پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

"یہ جو تم نے ہماری نافرمانی کر کے اپنی ضد سے پرچے دے دیے یہی تمہارے لیے بہت کافی ہے۔ یہاں رہنا ہے تو پھر ہماری مرضی اور شرطوں کے مطابق رہنا ہوگا۔ ورنہ دفع ہو جاؤ جہاں جی چاہے۔" وہ بہت ناراضی سے گویا تھے۔

"تمہارے ذمے جو کام لگائے گئے ہیں وہی تمہاری نوکری ہے' ہمیشہ کے لیے۔ سمجھ گئے؟" عباد بھائی حقارت سے بولے۔

فصیح کو اپنے دل و دماغ ٹھنڈا رکھنے کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑی۔

"جس تعلیم کو اتنی تاخیر سے حاصل کیا ہے اسی کو استعمال میں لانا چاہتا ہوں۔" اس نے احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے احتیاط سے اپنا مدعا بیان کیا وہ چاہتا تو ضد یا ہٹ دھرمی سے بھی کام لے سکتا تھا مگر وہ احسان فراموش نہیں کہلانا چاہتا تھا۔ کچھ بھی تھا اس حویلی نے اسے اس وقت پناہ دی تھی جب وہ بھری دنیا میں اکیلا بھٹکنے کو تھا۔ گو کہ اس احسان کا تاوان وہ ابھی تک ادا کر رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں تمہارے منہ میں کس کی زبان بول رہی ہے۔ اس نے کچھ دن ترس کھا کے پڑھائی لکھائی کا سامان کیا کر دیا خود کو ہیرو سمجھنے لگے' ابا جی میرا تو خیال ہے اس کی زرتاب پر نیت خراب ہے۔ اس بھولی بھالی لڑکی کو اپنے چنگل میں پھنسا کر مجھ سے بدظن کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے تو وہ مجھ سے شادی سے بدک رہی ہے۔"

"بس کریں عباد بھائی!" وہ بری طرح پھٹ پڑا۔ اب بات اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔

"ایسے گھناؤنے الزام لگاتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔" اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔

"میرے ساتھ بدتمیزی کرتے ہو' میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔ گندی ماں کی گندی اولاد۔"

وہ چنگھاڑتے ہوئے اس کے پاس آئے اور گریبان میں ہاتھ ڈال کے دوسرے ہاتھ سے زوردار تھپڑ لگانا چاہا۔ مگر ان کا ہاتھ ایک جھٹکے سے فصیح نے روک لیا تھا۔

"بس عباد صاحب! بہت ہو گیا۔ بہت سہہ لیے آپ لوگوں کے طنز اور طعنوں کی مار' بہت لے لیا آپ نے میری برداشت کا امتحان۔ آپ نے کوئی جانور نہیں پالا تھا گھر میں۔ نہ میری ماں نے تاوان کی صورت میں مجھے آپ لوگوں کو سونپا تھا کہ ہر طرح کے بدترین سلوک کا حق دار سمجھا جاتا' ابا جی اگر میری ماں کے گناہوں کا کفارہ پورا ہو گیا ہو اور آپ کے سینے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہو تو مجھے اجازت دیجیے گا۔ میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

وہ عباد بھائی کا ہاتھ جھٹک کر پرے کرنے کے بعد سرخ آنکھیں لیے ابا جی کے پاس آ رکا' اس کے لہجے میں درد تھا۔

"تیری تو..... ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے۔" عباد بھائی کف اڑانے لگے۔

حیرت انگیز طور پر ابا جی ابھی تک خاموش کھڑے تھے۔ فصیح سلگتے ہوئے اعصاب لیے ایک ان دیکھے الاؤ میں جلتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

پھر اس نے وہاں سے نکلنے میں دیر نہیں لگائی۔

اس کی اگلی منزل پنڈی کا جنرل ہاسپٹل تھا جہاں زرتاب ان دنوں تعینات تھی۔ اتفاق سے وہ ڈیوٹی آورز میں ہی اسے مل گئی۔

"تم یہاں.....؟" وہ حیران تھی۔

"یوں اچانک آ گئے؟ کیا نوکری ڈھونڈنے آئے ہو؟"

"اس کے لیے شاید اتنی جلدی نہ آتا۔ مگر اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ آنا ہی پڑا۔"

وہ خود کو بہت حد تک پرسکون کر چکا تھا۔ تمام واقعات اس کے گوش گزار کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

"یہاں کہاں رہو گے فصیح؟ اور وہ بھی پیسوں کے بغیر۔"

"اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

مجھے کچھ رقم چاہیے ادھار' اتنی کہ جس سے ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہ سکوں اور جب تک نوکری نہیں ملتی اپنے کھانے پینے اور رہنے کا بندوبست کر سکوں۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے بیگ سے چیک بک نکال کر دس ہزار کی رقم لکھی اور اسے چیک تھما دیا۔

"مجھے یقین ہے بہت جلد تم یہ قرض لوٹانے کے قابل ہو جاؤ گے۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی تھی۔

"شکریہ۔" سفر اتنا سہل بھی نہیں تھا۔ دو ماہ گزر گئے جوتیاں چٹخاتے پھر تیسرا مہینہ بھی شروع ہو گیا۔

اور جب وہ مایوس ہونے لگا تھا تو اچانک ہی قسمت مہربان ہو گئی۔ اسے بلیو ایریا میں ایک ٹریول ایجنسی میں بہت اچھی جاب مل گئی۔

اس دن وہ بہت خوش تھا۔ خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ لیے مٹھائی کے ڈبے سمیت وہ شام کو زرتاب کے ہاسٹل میں موجود تھا۔

"یہ باوقار زندگی کی طرف جانے والے راستے کا پہلا پڑاؤ ہے۔ ایسے بہت سے نئے موڑ نئی منزلیں تمہاری منتظر ہوں گی۔ بس ہمت نہ ہارنا۔"

"اگر آپ جیسا کوئی ہمیں ہمت بندھانے والا مل جائے تو۔" اس نے اچانک اپنی زبان دانتوں تلے دبالی۔

"بہت زیادہ بولنے لگے ہو تم۔" وہ غصے سے گھور کر مٹھائی کا ڈبہ کھولنے لگی تھی۔

❋ ❋ ❋

فصیح کا گھر چھوڑ کر جانا قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ گھر میں جس جس نے بھی اس کے اچانک گھر سے جانے کی خبر سنی تھی اس نے اس عمل کو اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنے سے عبارت کیا تھا۔

کچھ عرصے تک لعنت ملامت کرنے کے بعد اب سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

کام کاج کے لیے ایک ادھیڑ عمر ملازم رکھ لیا گیا تھا۔ کسی کو اس کے جانے سے فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر اماں جی بہت گم صم ہو کے رہ گئی تھیں۔

"طیبہ کی امانت تھا وہ ہمارے پاس۔ ایسے کیسے جانے دیا اسے' جہاں اتنا عرصہ رکھا وہاں۔" وہ اکثر خود کلامی کے سے انداز میں کہتی تھیں۔

"اس کے ساتھ جا کے طیبہ سے دو گھڑی کو مل لیتی تھی۔" اماں کو اپنے اکلوتے نواسے کے اس طرح چلے جانے کا بڑا رنج ہوا تھا۔ "جانے کہاں اور کن حالوں میں ہوگا۔"

پھر ایک دن زرتاب نے آ کر بتایا۔

"وہ خیریت سے ہے اماں جی! گزشتہ آٹھ نو ماہ سے پنڈی میں رہ رہا ہے۔ اسے اچھی نوکری بھی مل گئی ہے۔"

اماں جی کے چہرے پر دیے روشن ہو گئے۔

"شکر ہے خدا کا' مگر تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میں ملی ہوں اس سے۔" اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہیں۔ غالباً اس کی شکل سے بات کی گہرائی جانچنا چاہ رہی تھیں۔

پھر ایک گہری سانس لے کر وہ مہر بہ لب ہو گئیں۔

"رضوان ماہ بعد آ رہا ہے اس کے آتے ہی تمہاری شادی ہو جائے گی۔"

"ہوں۔" وہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

وہ سوچ رہی تھی رضوان کو گھر سے فون کرے یا باہر پی سی او سے' رضوان امریکہ میں پلا بڑھا تھا۔ آزادی رائے کا قائل تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے ساری بات سنی تھی۔

''تم فکر نہیں کرو۔ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو گا۔ اور شادی بیاہ زبردستی کے سودے تو نہیں ہوا کرتے۔''

زرتاب نے سکون کا سانس لیتے ہوئے ریسیور رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

''اباجی! بے شک آپ ہمارے بزرگ ہیں آپ کو ہر فیصلے کا حق ہے مگر اس فیصلے میں فریقین کی مرضی بھی شامل ہونی چاہیے۔''

رضوان بہت ٹھوس دلائل' اعتماد اور سکون کے ساتھ اباجی کے ہر سوال اور غصیلے تیوروں کا جواب دے رہا تھا۔ وہ برسوں امریکہ سے آیا تھا۔

اس کے آتے ہی سمن کا موڈ گل و گلزار ہو گیا تھا۔

اباجی اور اماں جی نے یہ سنہری موقع ہاتھ آتے ہی اپنا تین چار سال پرانا بکھیڑا نمٹانے کی تحریک شروع کر دی تھی۔

''ہم نے کبھی کسی معاملے میں فیصلہ کرنے میں اتنی تاخیر نہیں کی نہ ہی کسی کے بہانے سنے ہیں۔ اپنی بہن سے کہو ہماری دی ہوئی آزادی اور محبت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ ہم صرف اس لیے برداشت کر لیتے ہیں کہ بن ماں باپ کی بچی ہے' نادان ہے۔ مگر اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے اور سال دو سال بعد ڈھنگ کا رشتہ نہیں ملے گا۔''

اباجی نے آغاز بڑی گھن گرج کے ساتھ کیا تھا۔

''جو رشتہ آپ کی نظر میں ہے' زرتاب کی ادھر مرضی نہیں ہے۔''

''تو پھر اور کدھر مرضی ہے اس کی؟'' وہ جلال میں آ گئے اور دانت پیس کر گویا ہوئے۔

''ہمارے یہاں آج تک لڑکوں کو اپنی مرضی بتانے کی جرات نہیں ہوئی۔ یہاں کل کی چھوکری اپنی مرضی بتائے گی ہمیں۔''

''اگر وہ یہ حق نہیں دیا گیا تو غلط کیا گیا۔ یہ باعث فخر نہیں' باعث افسوس ہے۔'' رضوان بہت سکون سے گویا ہوا۔

''آپ لوگوں کی ضد نے مجھے اور سمن کو وقت سے پہلے باندھ دیا جس کی وجہ سے وہ تین سال سے انتظار کا عذاب کاٹ رہی ہے۔ شادی کا ٹائم تب تھا جب میں مکمل طور پر سیٹل ہو جاتا۔'' اس کا لہجہ اباجی کے روایتی جذباتی دماغ کو شکست دے گیا تھا۔ وہ غضب ناک ہو کر گرجنے برسنے لگے۔ زرتاب بھی لپیٹ میں آئی' لیکن ہوا وہی جو رضوان نے چاہا۔

اس نے بہت اچھے طریقے سے بہن کا مقدمہ لڑا تھا۔

''جیسا تم نے چاہا ویسا تو ہو گیا۔ مگر تم نے ''وجہ'' سے نہیں ملوایا مجھے۔'' جاتے سے وہ زرتاب سے مخاطب ہوا۔

''پلیز رضوان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ سٹپٹا گئی۔

''اوکے مان لیا مگر ایک بات یاد رکھنا جب بھی ایسی کوئی بات ہو مجھ سے ضرور ڈسکس کرنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے یقین ہے میری بہن جو فیصلہ کرے گی خوب سوچ سمجھ کرے گی۔''

اس نے زرتاب کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی اور پھر ہنستا ہوا خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

''اف میرا بھائی سلامت نہ ہوتا تو اباجی تو جھونک دیتے مجھے اپنی مرضی کے جہنم میں۔''

اس نے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔

❁ ❁ ❁

''طیبہ پھپھو رہا ہو کر آ گئی ہیں۔ فصیح انہیں اپنے ساتھ لے آیا ہے کیا آپ ان سے ملیں گی اماں جی؟''

اماں جی کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلک گیا۔

اس ویک اینڈ پر آئی تو اماں جی کو سنانے کے لیے

اس کے پاس گرما گرم خبر تھی۔ وہ بہت غور سے ان کے چہرے پر خوشی اور دکھ کے گھٹتے بڑھتے سائے دیکھ رہی تھی۔

''اگر آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں تو میرے ساتھ جانے کے بہانے پنڈی چلی چلیں۔ کہہ دیجیے گا میرے والے ہسپتال سے کچھ ٹیسٹ کرانے ہیں۔ فصیح وہیں پنڈی میں رہتا ہے۔ اب تو اس سال ڈیڑھ ہو گیا ہے جاب کرتے ہوئے۔''

اماں جی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ پھر دو گرم آنسو گالوں کے موم پر ٹپکے۔

''کیا کروں گی اس کی اجاڑ اور ویران حالت دیکھ کر۔'' انہوں نے سرد آہ بھری۔

''اب تو کافی بہتر ہو گئی ہیں۔ جب آئیں تو بالکل سوکھ کے کانٹا ہو رہی تھیں۔ ایک ماہ ہو گیا ہے انہیں فصیح کے ساتھ رہتے ہوئے۔ بیٹا' ماں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس نے اسلام آباد میں آئی ٹین میں ایک پورشن کرائے پر لے لیا ہے۔ تھوڑا بہت فرنیچر بھی ڈال لیا ہے۔ سال بعد اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ دو ماں بیٹا ہی تو ہیں بڑی اچھی طرح گزارا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے پھپھو کو فروٹ اور پرہیزی کھانے کھلاتا ہے۔ دودھ باقاعدگی سے رات کو پلاتا ہے۔ ان کے لیے بے شمار کپڑے سلوائے رکھے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں گھر کے کام کاج اور سودا سلف کا حساب کتاب رکھنا اس کے کام آ گیا ہے اس نے بڑے اچھے طریقے سے اپنا گھر سنبھال رکھا ہے۔''

وہ شرارت سے ہنس دی۔

اماں جی مسکرا بھی نہ سکیں۔ وہ ماضی میں کھو گئیں تھیں۔ زرتاب ویک اینڈ گزار کر واپس پنڈی آئی تو پیغام ملا کہ طیبہ پھپھو کا دوبار فون آ چکا تھا۔ پیغام یہ تھا کہ فارغ ہو کر گھر کا چکر لگاؤ وہ ڈیوٹی پوری کرنے کے بعد ہاسٹل جانے کے بجائے مری روڈ سے ٹیکسی لے کر آئی ٹین آ گئی۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر چلی آئی۔ اس کے پاس داخلی دروازے کی ایک ڈپلی کیٹ موجود تھی۔ فصیح تو پانچ بجے آفس آتا تھا۔ وہ یقیناً ''اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ طیبہ پھپھو اپنے کمرے میں تھیں۔

وہ اندر آئی تو وہ واش روم میں تھیں۔ چھوٹا سا کیسٹ پلیئر درمیانی آواز میں بج رہا تھا۔ کوئی بہت پرانی غزل چل رہی تھی۔

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا
جانے کیوں آج تیرے نام پہ رونا آیا

زرتاب کے پاؤں سن ہو گئے۔ اس نے مضطرب نظروں سے واش روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

یوں تو ہر شام امیدوں میں گزر جاتی تھی
آج کچھ بات ہے' جو شام سے رونا آیا

زرتاب کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ خود کو سہارا دینے کے لیے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دماغ میں جھکڑ چلنے لگا تھا۔

کبھی تقدیر سے شکوہ تو زمانے سے گلہ
منزل عشق کے ہر گام پہ رونا آیا

''ارے تم کب آئیں بھئی۔''

کچھ دیر بعد طیبہ پھپھو تولیے سے چہرہ تھپتھپاتی باتھ روم سے باہر آئی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ ہمیشہ بہت خوش ہو جاتی تھیں کہ فصیح کے بعد واحد خونی رشتہ تھا جو رہائی کے بعد ان کو دیکھنے کو ملا تھا۔

''کل اماں جی کے ہاں سے واپس آئی تھی۔ آج ڈیوٹی دینے کے بعد آپ کی طرف چلی آئی۔ بہت زبردست بھوک لگ رہی ہے پھپھو! یہ بتائیے کیا بنایا ہے۔''

''تمہاری پسندیدہ دال چاول اور ہری مرچ کی چٹنی بنائی ہے چلے گی؟''

''چلے گی' دوڑے گی' فٹافٹ دے دیجیے بس۔''

طیبہ پھپھو کو اس کی بے تکلفی اور اپنائیت پر مارے خوشی کے رونا آنے لگا۔ جیل میں رہ کر وہ ان لطیف جذبات کو جیسے بھول ہی گئی تھیں۔

زرتاب وہی گیت دوبارہ سننے لگی۔

''یہ کیسٹ کون لایا تھا۔ آپ یا فصیح۔'' وہ کچن میں بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"بہت بہت پرانی کیسٹ ہے اور کیسٹ پلیئر بھی میں جیل میں سنتی تھی۔"

"کیا وہاں اجازت تھی ایسی تفریحات کی؟" وہ متعجب ہوئی۔

"تھی تو نہیں مگر جب بندہ طویل مدت تک جیل میں رہتا ہے تو وہ گھر ہی لگنے لگتی ہے۔ جیلر اور سپاہی گویا "شریکا" بن جاتے ہیں وہ شریکا جو رشتے کی لاج نبھانے کے موڈ میں ہو تو ہر سہولت دے دیتا ہے۔" وہ تلخ سی ہنسی لیے گویا تھیں۔

"اور جب سے یہ فصیح کے ہاتھ لگی ہے وہ دن رات یہی سنتا ہے۔"

وہ خاموش ہو کر انگلی کے ناخن سے میز کی سطح کھرچنے لگی تھی۔

"پھپھو! ایک بات بتائیں گی۔" وہ اچانک ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"اتنی طویل مشقت زدہ زندگی گزار کے آپ نے کیا پایا...؟"

"پچھتاوے۔" ان کا جواب برجستہ تھا۔

"لیکن انسان جب محبت کر رہا ہوتا ہے یا اس کے حصول کے لیے سرگرم ہوتا ہے اس وقت تو وہ اپنے آپ کو سو فیصد حق پر سمجھتا رہا ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔"

"میں تو اس نتیجے پہ پہنچی ہوں زرتاب کہ رشتہ وہی ہوتا ہے جو معاشرتی حدود و قیود اور قاعدے ضابطوں کے ساتھ استوار ہو۔ بزرگوں سے لڑکے ان کے مخالف چل کر اکثر نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔"

"مگر ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"بے شک ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا والدین کسی ذاتی خواہش ضد یا انا پرستی کے چکر میں اکثر بچوں کی تقدیر کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔" وہ بردباری سے بولیں۔

"ایک بات اور اپنے شوہر کو قتل کرتے وقت ایک لمحے کو آپ کا دل نہیں کانپا؟ آپ کو اس شخص کو مارتے ہوئے کیسا لگا جو آپ کا مجازی خدا تھا۔ آپ کی محبت تھا اور جس کا جرم بہرحال اتنا بڑا نہیں تھا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔"

"پلیز۔" وہ زرد سرسوں جیسی رنگت لیے مرتعش سانسوں سمیت ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"برسوں تک جیل کی تاریک راتوں میں وہ لمحہ، اس لمحے سے وابستہ دکھ کی شدت اور اپنے عمل پر ضمیر کی شدید لعنت پھٹکار میری سوچوں کا مرکز رہی ہے۔ میں راتوں کو سونا بھول چکی ہوں زرتاب! پچھتاوے کی آگ میں مرتے دم تک سلگتے رہنا میرا مقدر ہے۔"

اچانک ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ تیورا کر گریں اور جب تک زرتاب اٹھ کر انہیں سنبھالتی وہ میز کے کونے سے سر ٹکرا کر فرش پر بے سدھ ہو چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سب کچھ اچانک ہو گیا۔

ایک طویل مدت جیل میں گزارنے کے بعد وہ آزاد دنیا میں آئیں تو اس آزادی کو ایک ماہ بھی محسوس نہ کر پائیں کہ ان کا دل گھبرا گیا۔

اور کچھ ایسا گھبرایا کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، فصیح نے ان کی موت کی اطلاع حویلی بھجوائی تھی۔ طیبہ پھوپھو کی یہی وصیت تھی کہ کم از کم آخری وقت میں انہیں باپ اور بھائیوں کا کندھا مل جائے۔

جانے والی چلی گئی تھی تو پھر کہاں کی انا کہاں کی لغزشیں۔ دشمنیاں تو زندہ لوگوں سے کی جاتی ہیں۔

ابا جی پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے بیٹی کا آخری دیدار کرتے ہوئے۔ پہلی بار فصیح کو پورے دل سے گلے لگایا تھا۔

پھر زندگی کا عنوان کچھ اور ہو گیا۔

"تم چاہو تو حویلی واپس آ سکتے ہو اور ہمارے ہاں ایک فرد کی حیثیت سے رہ سکتے ہو۔"

چلتے سے انہوں نے آہستگی سے فصیح کو مخاطب کیا تھا۔

وہ لوگ فصیح کے گھر میں ہی ٹھہرے تھے اور یہ بھی

جانچ چکے تھے کہ ان تین چار سالوں کی کڑی مشقت نے فصیح کو اس قابل کر دیا تھا کہ اب وہ معاشرے میں مقام حاصل کرنے کی دوڑ میں برابر کا شریک بن چکا تھا۔

اس نے بہت کم عرصے میں خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا تھا۔

"شکریہ ابا جی! میری جاب بہت اچھی ہے اور اس میں ترقی کے امکانات بھی واضح ہیں۔ اس لیے میں یہاں بہت مطمئن ہوں۔"

اس نے تابعداری سے جواب دیا تھا۔

ابا جی ہونٹ چبانے لگے۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

ٹھیک ایک ماہ بعد فصیح کو حویلی بلوایا گیا۔

ابا جی نے اپنی جائیداد اپنے چاروں بچوں تین بیٹوں اور ایک بیٹی میں شرعی لحاظ سے تقسیم کر دی۔ زرتاب اور رضوان کے مرحوم باپ کا حصہ ان دونوں کو ملا تھا اور طیبہ پھوپھو کے حصے کی جائیداد ان کے واحد وارث فصیح کے نام کر دی گئی تھی۔

"یہ لاکھوں کی پراپرٹی ہے۔ چاہو تو بیچ لینا اور چاہو تو کرائے پہ اٹھا دینا کسی مصرف میں لے آنا یہ بہرحال تمہارا حصہ ہے۔"

ابا جی کے کاغذات کی فائل فصیح کے سپرد کر دی۔

فصیح گود میں پڑے ان کاغذات کو خالی الذہنی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ایک آنسو چپکے سے دائیں آنکھ سے لڑھکتا ہوا کنپٹی کے بالوں میں گم ہو گیا تھا۔

"یہ حویلی جہاں کی ایک اینچ پر میرا قدم پڑنے پر یہاں کے مکینوں کے دل میں شعلے اٹھنے لگتے تھے" آج وہی مجھے میرے حق سے نواز رہے ہیں؟"

کتنے ہی تذلیل آمیز، نفرت بھرے رویے، اور چہرے اس کی نظروں میں گھومنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

زرتاب کی ٹرانسفر دوبارہ لاہور ہو گئی تھی۔

وہ جانے کی تیاریوں میں تھی، جب ہاسٹل میں اس کے لیے فصیح کا فون آیا۔

"اگر آپ فارغ ہوں تو میں آپ سے ملنے آ جاؤں؟ آپ نے تو گزشتہ چھ ماہ سے میرے گھر میں قدم رکھنا گناہ تصور کر لیا ہے۔"

"جن کے لیے آتی تھی وہ نہیں رہیں تو بہرحال تم آ جاؤ۔" وہ پیکنگ کر کے فصیح کے انتظار میں ہاسٹل کے لان میں پہنچ کر بیٹھ گئی۔

مارچ کی دس تاریخ تھی اور بہار کے سارے ہی رنگ۔

لان میں جابجا بکھرے نظر آتے تھے۔

نرم گرم سی جانفزا ہوا

سبز چمکتے ہوئے ننھے نوخیز پتے

ہری ہری گھاس

تر و تازہ پیڑ

پھولوں سے لدی شاخیں

مہکتی کیاریاں

اور چہچہاتے ہوئے رنگ برنگے پرندے

سب چیخ چیخ کر اسے کہہ رہے تھے

لو بہار آ گئی ہے

دیکھو بہار آ گئی ہے

"السلام علیکم۔" آہٹ کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔

وہ نیوی بلو پینٹ اور لائٹ بلو شرٹ میں ملبوس تھکا تھکا سا اور بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

وہ خاموشی سے اس سے کچھ فاصلے پر بینچ پہ بیٹھ گیا۔

"ہمارے ڈپارٹمنٹ میں کچھ جابز نکلی تھیں دوبئی کے لیے۔ میں نے بھی اپلائی کر دیا۔ اتفاق سے میرا نام لسٹ پر آ گیا ہے۔ میں اگلے ماہ دوبئی جا رہا ہوں۔ چھ سال کا کانٹریکٹ ہے۔" وہ فضاؤں میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ ایک معنی خیز سناٹا ماحول پر طاری ہو گیا۔

"اچھی بات ہے، مجھے یہ بتانے آئے ہو؟" وہ اچانک طیش میں آ گئی تھی۔

"میں یہ کہنے آیا تھا کہ..." فصیح کے انداز میں

شکست خوردگی نمایاں تھی۔

”کانٹریکٹ تم نے اپنی مرضی سے قبول کر کے اپلائی کیا۔ اپنی مرضی سے جا رہے ہو۔ پھر مجھے کیا بتاتے ہو۔ اطلاع کرنی ہے تو اپنے گارجین سے کرو۔ اب تو وہ تمہاری سنتے ہیں، تمہیں اپنے برابر کی پہچان اور مقام دیتے ہیں۔“ وہ نہایت رکھائی سے گویا ہوئی۔

”آپ اتنی ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟“ وہ اس کے اس طرح بھڑکنے پر پریشان ہو گیا۔

”میں ہر ایرے غیرے سے ناراض نہیں ہوا کرتی۔“ وہ اجنبیت سے بولی۔

فصیح کا چہرہ بجھ گیا۔

”چار ساڑھے چار سال تک میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک ایک قدم چلنا سکھاتی رہیں حتیٰ کہ دوڑ کے میدان میں مقابلے میں شامل کر دیا اور اب کہتی ہیں ایرا غیرا! آپ بہت پتھر دل ہیں زرتاب! بہت بے درد ہیں۔ کیا اتنے برسوں تک میرے جذبوں نے کبھی بھی آپ کے دل کو نہیں چھوا؟ میں مخصوص مدت تک ان کو دل میں چھپائے رکھنے پر مجبور تھا مگر کیا آپ تک کبھی ان کی خوشبو نہیں پہنچی؟“

وہ شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”بالکل ہی احمق اور گدھا ہے، یہ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتا کہ اتنے قیمتی برس کیوں بھاڑ میں جھونکتی رہی ہوں میں۔“ وہ دل ہی دل میں دانت پیس رہی تھی۔

”امی نے محبت پانے کے لیے بزرگوں سے بغاوت کا جو غیر مناسب اور غلط طریقہ اختیار کیا۔ اس نے انہیں جیل کی ذلت آمیز سزا دنیا میں رسوائی اور اپنوں کی نفرت و دوری تک پہنچا دیا۔ ساری عمر انہوں نے انگاروں پر بسر کی۔ یہ انجام مجھے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ میں آپ کو اس الاؤ میں نہ دھکیلوں، اسی لیے میں نے پسپائی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے آپ سے دور چلے جانے کا راستہ اختیار کیا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ ابا جی کبھی راضی نہیں ہوں گے اس رشتے پر بلکہ وہی کیا گھر کا کوئی فرد بھی مجھے آپ کے شوہر اور اپنے داماد کے روپ میں دیکھنا گوارا نہیں کرے گا۔ اس لیے میں ان کی مرضی کے خلاف قدم نہیں اٹھاؤں گا نہ آپ کو مجبور یا پابند کروں گا۔ میں آپ کے ذریعے اپنی ماں کی تاریخ نہیں دہرانا چاہتا۔“

وہ پُرسکون انداز میں گویا تھا۔ اس کے لہجے میں کرب اور تکلیف نمایاں تھی مگر وہ اپنے ارادوں پر مضبوطی سے قائم تھا۔

زرتاب نے ایک طویل سانس خارج کی۔

”ٹھیک فیصلہ کیا تم نے، اچھا اب تم جاؤ۔ میں پیکنگ کروں گی۔ ملک سے باہر جانے سے پہلے اطلاع ضرور کرنا۔“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

اور اس سے پہلے کہ فصیح مزید کچھ کہتا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔

وہ پکارنے کی حسرت لیے بیٹھا رہ گیا۔

”کم از کم اتنی دیر تو رکتیں کہ میں جی بھر کر اس چہرے کو دل پہ نقش کر لیتا۔“

✡ ✡ ✡

زرتاب نے اگلی شام پی سی او سے امریکہ رضوان سے بات کی تھی۔

”سوچ لو، اس کا بیک گراؤنڈ۔ کیا تم اس کے ساتھ سروائیو کر لو گی سوسائٹی میں؟“ کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد رضوان نے استفسار کیا تھا۔

”ہر گزری ہوئی چیز پر وقت کی گرد پڑ جاتی ہے رضوان! یہاں ایک ساتھ ایک گھر میں رہتے ہوئے دوسرے کے بارے میں خبر نہیں ہوتی اور پھر وہ چھ سال کے لیے دوبئی میں رہے گا۔ اس کے بعد جب ہم واپس آئیں گے تو بہت کچھ بدل چکا ہو گا۔“

”ہم؟ یعنی شادی کر کے اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟“ اور وہ بے اختیار جھینپ گئی تھی۔

”میرا مطلب ہے.....“

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا تمہارا مطلب، فصیح کے بارے میں تم سے سب معلوم ہو چکا ہے۔ وہ ہمارے خاندان کا ایک حصہ ہے۔ خون کا رشتہ ہے ہمارا اس سے اور سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ وہ چند سالوں میں خود کو تمہارے قابل بنا چکا ہے۔ خود کو اہل ثابت کر چکا ہے اس لیے محض اس کے ماں باپ کے ماضی کی بنیاد پر اسے ٹھکرانا درست نہیں لگتا۔“

”اور وہ ابا جی اور اماں جی!“ وہ جھجک کر پوچھنے لگی۔

”انہیں بہرحال میں قائل کر لوں گا۔ ان کی اجازت لے کر ہی یہ شادی انجام پائے گی۔ میں اگلے ماہ آ رہا ہوں۔ سمن کا ٹکٹ اور ویزا بھی ساتھ لاؤں گا، اپنے پندرہ دن کے قیام میں تمہاری شادی نپٹا کر سمن کو ساتھ لے کے میں امریکہ واپس آ جاؤں گا۔ تم فصیح سے کہو اپنی دوبئی روانگی کو اگلے دو ماہ تک لیٹ کر لے۔ اس دوران تم اپنا پاسپورٹ بھی بنوا لو اور ویزے کے لیے اپلائی کر دو۔“

”آپ کے خیال میں ابا جی آسانی سے راضی ہو جائیں گے؟“

”آسانی سے ہوں یا مشکل سے۔ بہرحال یہ وعدہ رہا کہ وہ شادی اپنے ہاتھ سے کریں گے اور خود تمہیں رخصت کریں گے۔ میں ماضی کی کوئی تلخ روایت دہرانا پسند نہیں کروں گا۔ نہ طیبہ پھوپھو والی اور نہ اپنی اور سمن کی طرح کی۔ مجھے فصیح کا نمبر دو آفس کا۔ میں ذرا اس رشتے کی تحقیقات کرنا چاہتا ہوں۔“

اور اسے رضوان پر پورا بھروسہ تھا۔

✡ ✡ ✡

”السلام علیکم! بڑی مشکل سے فرصت نکال کر آپ کو رخصت کرنے آئے ہیں۔ آج تو آپ کو رخصت کر رہے ہیں اور کچھ ہی دن کی بات ہے جب آپ کو ہمارے ساتھ رخصت ہو کر ہمیشہ کے لیے ہمارے دل اور گھر میں آباد ہو جانا ہے۔“

وہ سامان لے کر ہوسٹل سے روانہ ہونے کو تھی کہ فصیح نے اسے موبائل پر کال کر کے وہیں رکنے کو کہا تھا اور مزید پندرہ منٹ بعد وہ آ چکا تھا۔

”فی الحال تو یہ چھوٹی سی سیکنڈ ہینڈ بائیک ہی سواری کے لیے پیش کر سکتے ہیں۔ ہاں عنقریب جب ہم باہر جا کر پیسے کمائیں گے تو آپ کی خدمت میں آپ کی مرضی کی شاندار سواری پیش کریں گے۔ ویسے تو اس کام کے لیے ہمارے بازو بھی حاضر ہیں۔“

زندگی کے تمام شوخ رنگوں سے بھرپور، جاندار لب و لہجہ، پُرجوش آنکھیں جو جگنوؤں کی طرح دمک رہی تھیں بھلا زرتاب ان کا سامنا کیسے کر سکتی تھی۔

اس نے گھبرا کر پلکیں جھکا لیں اور مصنوعی ناراضی سے رخ موڑ لیا تھا۔

”شریف لڑکیوں کو سرِعام تنگ کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی؟“

”بالکل آتی ہے۔ اسی لیے تو ہم شرما شرمی میں آپ کی پلکوں کے سائے تلے چھپنا چاہتے ہیں۔ آپ کی زلفوں کے سائے میں آنا چاہتے ہیں۔“ وہ شوخ جانے مزید کیا کہے جا رہا تھا۔ اس کی بس یہی سمجھ میں آیا کہ ”فل اسٹاپ“ کی غرض سے بائیک پر سوار ہو جائے۔

”میری ٹرین نکل جائے گی جلدی کرو۔“ اس نے بیگ گود میں رکھ کے سختی سے حکم دیا تھا۔

”مگر میں نے اپنی زندگی کی ٹرین پکڑ لی ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں اب۔“

وہ سرشاری کی ترنگ میں تھا۔ اس کا ایک ایک عضو پکار پکار کے داستان سنا رہا تھا کہ اس نے زندگی سے اپنے حصے کی ساری بہاریں چرا لی ہیں۔

★

پرانی باتیں، پرانی رسمیں پلٹ رہی ہیں
تم اس گھڑی سے ڈرو کہ جب تم بھی سر جھکائے
قطار شہزادگان شہر وفا میں بے بس کھڑے ہو لیکن
وہ شہر الفت کی شاہزادی
وہ خواب یادوں کے نرم پھولوں پہ پاؤں رکھتی
ہتھیلیوں پر گلاب زخموں کی سرخ کلیوں کا ہار لے کر
تمام تر حسن و تمکنت سے
قطار شہزادگان شہر وفا کی جانب بڑھے تو لیکن
تمہارے آگے سے ایسے گزرے
تمہاری آنکھیں سوال کرنا بھی بھول جائیں
تم اس گھڑی سے ڈرو کہ جس دم

شازیہ چوہدری

وہ شہر الفت کی شاہزادی
تمہیں دکھا کر تمہارے ہوتے
فقیر راجہ کو اپنی چاہت کا ہار پہنائے اور
تمہاری یہ خشک آنکھیں
سوال کرنا بھی بھول جائیں

"عمر... عمر... بھئی کہاں ہو۔" رفعت آپا کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔

وہ اپنے بیڈروم کے ملگجے سے ماحول میں بستر پر اوندھا لیٹا کسی رسالے کو آنکھوں سے لگائے عشرت آفریں کی نظم میں گم تھا۔ الفاظ تھے کہ نشتر، سیدھے دل میں پیوست ہو گئے تھے۔

"کمرے میں بند ہو کر کیا کر رہے ہو عمر!" رفعت آپا اندر داخل ہو چکی تھیں اور آتے ہی ادھ کھلے پردے ہٹا کر فضا کا ملگجا پن دور کرنے کی سعی کی گئی۔ وہ نیلی ساڑھی میں ملبوس تھیں۔ عمر کی پینتالیس بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ دس سال پہلے بیوہ ہو کر میکے آگئی تھیں۔ گیارہ سالہ نوین اور سات سالہ فاروق کے ہمراہ۔ اب تو ماشاء اللہ وہ بھی جوان ہو چکے تھے۔

عمر نے آہستگی سے رسالہ سائیڈ پر رکھ دیا۔ آپا اس کے پاس بستر پر آکر بیٹھ گئیں اور نرمی سے اس کے الجھے ہوئے براؤن بال سلجھانے لگیں۔

"اب پچھتانے سے کیا فائدہ عمر!" ان کے لہجے میں دکھ تھا۔ "میں نے کہا تھا ناکہ تمہارا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ تم خوش نہیں رہ سکو گے۔ امی بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے شہزادے جیسے بیٹے کی شادی ایک طلاق یافتہ لڑکی سے ہو مگر تمہاری شدید خواہش اور ضد کی وجہ سے ہم سب کو صبر کا گھونٹ بھرنا پڑا۔ اب دیکھ لو وہی ہوا نا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ شادی کو ابھی فقط ڈیڑھ ماہ ہوا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے منہ موڑے یوں اجڑے اجڑے پھرتے ہو جیسے بیچ میں قرنوں کے فاصلے ہوں۔ اگر یہی تماشا کرنا تھا تو بیاہ کے لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ روہانسی ہو کر سوال کر رہی تھیں۔

عمر اٹھ کر بیٹھ گیا اور خاموشی سے برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگا۔ وہ سفید ڈھیلی ڈھالی ہاف سلیوز شرٹ اور سیاہ جینز میں ملبوس تھا۔ شرٹ کے اوپری دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں بے خوابی اور تھکاوٹ کی سرخی نمایاں تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ چہرے پر بشاشت اور سرشاری کا کوئی نشان ثبت نہیں تھا جو نئے نویلے دولہا ہونے کا پتا دیتا۔

"ایک وہ 'بیگم صاحبہ' ہیں، چوبیس گھنٹے شکل پر مردنی اور ویرانی چھائی رہتی ہے جیسے سارے اگلے پچھلوں کو اکٹھا رونے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ نہ شوہر کی خوشنودی اور ضروریات کا خیال، نہ گھر بار کی فکر۔ کچن کے کام میں تو پھر مارے باندھے ہاتھ بٹا دیتی ہے مگر تمہارے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ مجھ سے کل کہنے لگی کہ خطا ہو گئی کہ عمر آنے والا ہے، ذرا اچھے سے کپڑے پہنے اور زیور پہن کے میک اپ کر کے تیار ہو جاؤ، تمہارا شوہر دیکھ کے خوش ہو گا۔ جواب میں اس نے اس قدر ناراضگی سے مجھے دیکھا جیسے اسے جبری موت کا حکم سنا رہی ہوں۔" آپا کی برہمی انتہا کو چھو رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے اس کے نزدیک یہ ہمارا بات اس کی موت کی حد تک تکلیف دہ ہو۔" عمر نے آپا کی طرف سے منہ موڑ کر وارڈروب کھنگالنے لگا تھا۔ آپا نے جل بلا کر اسے دیکھا تھا۔

"غلطی سے اِدھر نمبر مل گیا۔" عمر کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہونے لگیں۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی منع کیا تھا کہ جب گھر میں میں یا فاروق ہوں تو فون مت اٹھایا کرو۔" نوین کی کن بھاگی آگے نکل گئی۔ عمر بھی پلٹا تو دروازے پر کھڑی ثمین سے نظر مل گئی۔ دل پر اک قیامت سی گزر گئی۔ وہ بڑے ذو معنی انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر میں جانے کیا تھا کہ عمر کے حواس منتشر ہو کر رہ گئے۔ وہ بے ساختہ نگاہ کترا کر ڈائننگ روم میں آ گیا۔

"آپ تک پہنچے احتساب سے" عمر کب تک"

وہ خود سے الجھ الجھ کر تھک گیا تھا۔

"تم کھا رہے ہو یا چگ رہے ہو۔" رفعت آپا نے اسے پلیٹ پر جھکے فرضی لائنیں کھینچتے دیکھ کر ٹوکا۔

"وہ بھی دانہ دنکا، پرندوں کی طرح۔" فاروق کی شرارت بھری نظریں اپنے چھیل چھبیلے خوبرو ماموں پر تک گئیں۔ وہ جواباً مسکرا نہ سکا۔

"ہاں ہڑپ کرنے کے لیے تم موجود ہو بھینس کی طرح۔" نوین نے انوکھے طریقے سے حساب چکایا۔

"بھینس تو تمہاری صنف سے تعلق رکھتی ہے۔ ہمت ہے تو شیر کی طرح کہو۔" فاروق اکڑ کر بولا۔ "شیر اپنا شکار خود ڈھونڈتا ہے۔"

"تمہارے ماموں بھی بہت اچھے "شکاری" ہیں۔" اچانک ہی ثمین نے آہستگی سے کہہ کر ترچھی نظر عمر پر ڈالی تھی۔ امی اور آپا کسی خاندانی قصے میں الجھی ہوئی تھیں، ان تک جملہ نہیں پہنچا۔ تاہم عمر کے احساس کے ہر خلیے نے لفظوں کی دھمک محسوس کی تھی۔ وہ سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔ اچانک ہی کھانے سے جی اچاٹ ہو گیا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا امی!" فاروق نے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے ہی تو پتا ہے۔" وہ سرد و بے مہر انداز میں کہتی ہوئی پانی پینے لگی۔ عمر سے بیٹھنا دشوار ہو گیا۔

"کیوں، کیا آپ کو بھی شکار کر کے لائے تھے۔" نوین نے اپنی طرف سے مذاق کیا تھا مگر عمر کو یوں لگا جیسے کسی نے خنجر کی تیز دھار سے اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو۔ اس کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ تو ان ہی سے پوچھو۔" وہ بے رحمی سے مسکرائی۔ عمر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ اس سے زیادہ اعصابی دباؤ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

تم اس گھڑی سے ڈرو کہ جب تم بھی سر جھکائے
قطار شہزادگان شہر وفا میں بے بس کھڑے ہو لیکن
وہ شہر الفت کی شاہزادی
تمہارے آگے سے ایسے گزرے
تمہاری آنکھیں سوال کرنا بھی بھول جائیں
تم اس گھڑی سے ڈرو کہ جس دم
تمہیں دکھا کر تمہارے ہوتے...

"اف۔" وہ روح پر پڑتے آتشیں گرز کی چوٹ نہیں سہہ پا رہا تھا۔ اس نے آتے ہی بیڈ روم کے دونوں پنکھے چلا دیے تھے۔ اندر اتنا الاؤ تھا کہ سینہ دہک اٹھا تھا۔ دونوں پنکھے فل اسپیڈ سے چل رہے تھے اور اسی رفتار سے کمرے کی مختلف چیزیں اڑتی پڑتی ادھر ادھر حرکت کر رہی تھیں۔ کاغذات، گلدان میں رکھے پلاسٹک کے پھول، دیوار پر لگا کیلنڈر، کھڑکیوں کے نرم نازک حریری پردے۔ وہ تکیے میں منہ چھپائے دیر تک بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ خبر بھی نہ ہوئی کب ثمین نے آکر پنکھوں کی رفتار آہستہ کرنے کے بعد بکھری چیزیں سمیٹیں اور اپنی جگہ پر لیٹی۔

عمر کی آنکھ رات کے دو بجے کھلی تھی۔ اس نے ٹیبل لیمپ جلایا۔ اس سے کچھ فاصلے پر جیتی جاگتی قیامت اس کے پہلو میں خوابیدہ تھی۔ جذبات انگڑائی لے کر بیدار ہوئے مگر اتنی ہی سرعت سے ضمیر نے برف کی بھاری سل رکھ کر انہیں سرد کر ڈالا۔

"تم اپنا حق لینے نہیں، ڈاکہ ڈالنے جا رہے ہو۔ غاصب، دھوکے باز۔" ضمیر کا تھپڑ بڑا کرارا اور زوردار تھا۔ وہ مدہوش ہونے سے پہلے ہی گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور بے بسی سے گردن موڑ کر اس حسن و رعنائی کے مجسمے کو دیکھنے لگا۔

"میں کیونکر تم تک پہنچوں، کیسے پاؤں تمہیں؟ کون سی ادا اپناؤں کہ تمہارے دل میں تھوڑی سی جگہ مل جائے۔" اس نے بے اختیار اس کا سفید مخملیں پھول سا ہاتھ اپنے رخسار سے لگا لیا۔ "کتنی جستجو سے کھوجا تھا تمہیں اور کتنے اہتمام سے گنوایا ہے میں نے"

وہ کتنی ہی دیر ساکت و صامت بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے نقوش کو دیوانگی سے نظر کے حصار میں سموتا رہا۔ پھر اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ یوں لگا جیسے آگے کہر کی دیوار سی تن گئی ہو اور اس غضب کی دھند میں ثمین کا چہرہ اس سے دور ہوتا جا رہا ہے اس کی بینائی کے زاویے سے غائب ہوتا جا رہا ہے۔

بے یقینی کے رنگوں میں الجھی ہوئی
چاندنی درد کی جگمگاتی نہیں
دھند کی جھیل پر تیرتی ہے مگر
راہ پاتی نہیں
وہ نظر جو ستاروں کی ہمراز تھی
دس قدم دور تک ساتھ جاتی نہیں
روشنی بھی کہیں کچھ دکھاتی نہیں
آنکھ کہتی ہے باہر بہت دھند ہے
دل یہ کہتا ہے اندر بھی کم تو نہیں

شاید اس کی نظر کے لمس نے اس کے پپوٹوں میں گدگدی کی تھی۔ ایکدم اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ عمر یوں گھبرایا جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔

"آدھی رات کو اٹھ کر کیا کھوج رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں مقبروں کا سا سناٹا اور وحشت تھی۔

"تمہیں۔" کاش وہ کہہ سکتا۔

"آئی ایم سوری۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔" اس نے پشیمان سے انداز میں کہتے ہوئے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور خود بالکونی کا دروازہ کھول کر کھلے آسمان تلے آ گیا۔

ہر طرف تاریکی و خاموشی کا راج تھا۔ دور کہیں کہیں اکا دکا روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ وہ تشنگی اور یاسیت کی عجب کیفیت میں گرفتار ہونے لگا۔

کاش کوئی اس سے پوری کائنات لے کر لوٹا دے
مجھ ثمین کا دل اس کی توجہ اس کی محبت اس کے جسم کی روح تک

اس کا رواں رواں بیتے ماضی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔

کاش وقت کو واپس لایا جا سکتا۔ اس موڑ پر جہاں دونوں ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔ دونوں کی زندگی جنت نشاں تھی۔ دونوں اپنے اپنے حصے کے سکھ چن رہے تھے۔

اس موڑ سے شروع کریں پھر یہ زندگی
ہر شے جہاں حسین تھی ہم تم تھے اجنبی

"نجانے سارے شعر، سارے نغمے دکھ کے لمحوں میں ہی کیوں یاد آتے ہیں۔"

وہ اپنی حالت پر خود ہی مسکرا دیا۔ ایک تکلیف دہ بے بس مسکراہٹ، شاید اس لیے کہ دکھ ہی واحد شے ہے جو انسان کی ازلی بے حسی و حاکمیت کا قلعہ پاش پاش کر دیتا ہے۔ جو احساس کی دیوار میں دراڑیں ڈال کر آدمی کے اندر کا مہین عکس سامنے لاتا ہے۔ عام حالات میں شاید اسے ابتدائی بول بھی نہ یاد رہے ہوتے مگر اس وقت ہر ہر مصرعہ خود بخود حافظے کی اسکرین پہ نقش ہوتا جا رہا تھا جیسے کسی فلم کی ریل چل رہی ہو۔

لے کر چلے تھے ہم جنہیں جنت کے خواب تھے
پھولوں کے خواب تھے وہ محبت کے خواب تھے
لیکن کہاں ہے ان میں وہ پہلے سی دلکشی
اس موڑ سے شروع کریں پھر یہ زندگی

"لیکن کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ موڑ گم ہو جاتے ہیں۔ مانوس نشانیاں غائب ہونے لگتی ہیں۔ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا وہ آگے کی طرف بڑھے یا پیچھے جائے۔" اس نے نیم دلی سے سوچا۔

شاید کہ وقت ہم سے کوئی چال چل گیا
رشتہ وفا کا اور ہی رنگوں میں ڈھل گیا
اشکوں کی چاندنی سے تو بہتر تھی دھوپ ہی

تھا مگر بھابھی کے تیور اس کی بات کو جھٹلاتے دکھائی دے رہے تھے۔

"ثمین! حیرت ہے، سمجھو کہ ماں باپ مر چکے ہیں تو تم اپنی من مانیاں کرنے کے لیے آزاد ہو۔ ابھی تمہارا بڑا بھائی زندہ ہے اور میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس کے سر پر خاک ڈالو، اس کی عزت سے کھیلو۔ دیکھو! سچ سچ مجھے بتا دو، ورنہ معاملہ تمہارے بھائی تک پہنچ کر بگڑ بھی سکتا ہے۔" انہوں نے دھمکی اور دھونس سے کام لیا۔

وہ انہیں یوں دیکھنے لگی جیسے ان کا دماغ چل گیا ہو۔

"بھابھی پلیز۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" کانپتے ہوئے ہراساں لہجے میں بلا کی بے یقینی تھی۔ ابھی تک تو وہ مطمئن تھی کہ بھابھی کو یونہی غلط فہمی ہوئی ہے مگر ان کا لب و لہجہ، سنجیدہ و سرد انداز اور خشونت بھرے تیور اسے کھولتی ہوئی کڑاہی میں دھکیل گئے تھے۔

"آپ جانتی ہیں برسوں سے میں محسن سے انگیجڈ ہوں۔ عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں، میں انہیں پسند کرتی ہوں پھر باقی کون سی تشنگی رہ جاتی ہے جسے پورا کرنے کے لیے پرائے مردوں سے ربط ضبط بڑھاؤں گی۔ الزام لگانے سے پہلے "وجہ الزام" تو سوچ لیں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"میں کیا جانوں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے یونیورسٹی فیلو کا فون آیا تھا اسی نے کچا چٹھا کھولا ہے۔" وہ سلگ گئیں۔

"فون۔ مگر میرا نمبر تو کسی کے پاس نہیں ہے، سوائے میری دوست صائمہ کے اور وہ بھی ان دنوں لاہور گئی ہوئی ہے۔" وہ فکر مند ہو گئی۔ زیادہ پریشانی کردار پر لگنے والے داغ کی تھی۔ وہ ہر صورت جلد از جلد بھابھی کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتی تھی۔ وہ دوسروں کے تشکیک آمیز انداز برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ صاف ستھرے کردار و خیالات کی مالک تھی اور دوسروں سے بھی اسی بات کی توقع رکھتی تھی۔

اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو ہر معاملے میں صاف گو، ایماندار اور کھرے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اطراف کے ماحول میں بھی یہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

ثمین کی مکمل یقین دہانی بھابھی کو تذبذب میں مبتلا کر گئی تھی۔ اگر وہ مجرم ہوتی تو اس کا لہجہ اتنا رواں اور دھلا دھلایا نہ ہوتا پھر اس کا بچپن اور لڑکپن ان کی آنکھوں کے سامنے رہا تھا۔ چار برس قبل فواد بھائی کے دوست محسن نے اسے کسی تقریب میں دیکھ کر پروپوزل بھجوایا تھا چونکہ رشتہ مناسب تھا، اس لیے سوچ بچار کے بعد منگنی کر دی گئی۔ شادی تعلیم سے فراغت کے بعد طے پائی تھی۔ یوں بھی اگلے سال محسن ہائر اسٹڈیز کے لیے تین سال کے لیے امریکہ چلا گیا تھا۔ وہ آج کل میں واپس آنے والا تھا اور اس کے آتے ہی شادی کا پروگرام تھا۔ ثمین کی اس سے بہت زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوئی تھیں مگر جتنی بھی ہوئی تھیں آدھی ادھوری ہوئیں، ان میں دو طرفہ پسندیدگی کا جذبہ نمایاں تھا۔ وہ عید اور سالگرہ کے موقع پر پابندی سے ہر سال اسے کارڈ بھیجتا تھا۔ کبھی کبھار سال چھ ماہ بعد فون پر بھی سلام دعا ہو جاتی تھی۔ انہیں اپنے جذبوں کے اظہار کے لیے اس سے زیادہ تگ و دو کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی روح کے ساتھی ہیں اور یہ بندھن ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ دونوں طرف اعتبار اور مان کی اونچی فصیلیں تھیں، اس لیے بے ایمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"وہ جو کوئی بھی تھا، جھوٹ بول رہا تھا بھابھی! میں سرے سے اسے جانتی ہی نہیں ہوں۔ آپ ایک بے بنیاد بات پر پریشان نہ ہوں۔" بھابھی سے دو طرفہ تفصیلی گفتگو سن کر اس نے تسلی سے کہا۔ بھابھی الجھ گئی تھیں، تاہم بات ختم کرنے کے لیے چپ ہو گئیں اور ادھر ادھر کے کاموں میں لگ گئیں۔

* * *

محسن کے ساتھ اس کی شادی زندگی کا ایک نہایت خوشگوار تجربہ ثابت ہوئی۔ وہ بے پناہ خیال رکھنے والا، ٹوٹ کر چاہنے والا اور دیوانگی کی حد تک محبت کرنے والا مرد تھا۔

ثمین نے شادی سے پہلے بہت سی محرومیاں دیکھی تھیں۔ کم سنی میں ماں باپ کی وفات پھر تند مزاج بھابھی کا ساتھ جو کلیجے پہ بھاری سل رکھے اتنے برس اسے برداشت کرتی رہی تھیں اور فواد بھائی جن سے فرض پورا کرنے کے علاوہ کوئی بے ساختہ اظہار وصول نہ ہوا تھا۔ ایسے میں محسن کی چاہت نے اسے بے پناہ مسحور کر دیا تھا۔

محرومی کا ہر احساس فنا ہو گیا۔ محسن کی محبت نے اسے عجب غرور و ناز اور تمکنت بخش دی تھی۔ اس کی چال میں خود بخود شان بے نیازی اور بے پروائی آ گئی تھی۔ لہجے کی کھنک میں زندگی کے سارے سر جاگ اٹھے تھے۔ چہرے کی چمک بزبان خود اعلان کرتی تھی کہ اس چاہت کی لازوال حدوں تک رسائی ہو گئی ہے۔

"کوئی اس سے زیادہ زندگی سے اور کیا چاہ سکتا ہے۔" وہ اکثر مسرور ہو کر سوچتی تھی۔

محسن کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس خوبصورت پر آسائش گھر میں وہ ہر لحاظ سے اپنی مرضی کی مالک تھی۔ محسن صبح آفس جاتے اور سہ پہر پونے چار بجے گھر آ جاتے تھے۔ چونکہ وہ صبح دیر تک سونے کی عادی تھی، اس لیے وہ اسے جگانے کی زحمت کیے بغیر ناشتا کر کے آفس چلے جاتے۔ صفائی ستھرائی کے لیے مستقل ملازمہ اور کھانا پکانے کے لیے خانساماں موجود تھا۔ ثمین ساڑھے دس گیارہ بجے اٹھتی، غسل لے کر ناشتا کرتی۔ اسی اثناء میں محسن کا آفس سے فون آ جاتا۔

"صبح بخیر جان من! اٹھ گئیں، ہماری لاڈلی بیگم۔" وہ لطیف انداز میں آغاز کرتے۔

"جی جناب۔" وہ چائے پیتے ہوئے چہکتی۔

"اور کیا ہو رہا ہے۔"

"وہی جو روز ہوتا ہے۔" وہ دلکشی سے ہنستی۔

وہ اپنے نصیبوں پر رشک کرتی تھی۔ کوئی یوں بھی کسی کو چاہتا ہے۔

"اس کے بعد نیلم کے پاس جانے کا ارادہ ہے، وہ جو آپ نے مجھے کچھ دن پہلے شیفون جارجٹ کی کام والی ساڑھی دلائی تھی نا، اس کے بلاؤز کی اسٹیچنگ کرانی ہے۔"

"اور اس کے بعد۔" وہ انتہائی حلاوت سے پوچھ رہے تھے۔

"اس کے بعد شاید تھوڑی بہت شاپنگ کروں گی پھر گھر آ کر تھوڑا آرام کرنے کے بعد تیار ہو کر آپ کا انتظار کروں گی۔"

ایسی ہی کتنی چھوٹی موٹی باتیں پوچھتے اور اپنا خیال رکھنے کی تلقین کرتے فون بند کر دیتے۔ اس کے ذمے کوئی کام نہیں تھا۔ اس نے کبھی روایتی بیویوں کی طرح ان کے کھانے پینے یا دیگر چھوٹی موٹی ضروریات کا خیال نہیں رکھا تھا۔ نہ کبھی اپنے ہاتھ سے کپڑے استری کر کے تھمائے، نہ میچنگ جوتوں جرابوں کے لیے تردد کیا اور نہ ان کی پسند کا مینو بنانے کی زحمت کی مگر اس کے باوجود محسن نے کبھی اس سے ان باتوں کا حساب نہیں لیا تھا، نہ گلہ کیا تھا۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو ہمیشہ اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ ان کی ذات سے کسی کو تکلیف یا نقصان نہ پہنچے۔ وہ روایتی حاکم مزاج مردانگی کا رعب رکھنے والے شوہروں سے قطعی مختلف تھے۔ اس کی ذات اور احساسات کا یوں خیال رکھتے جیسے وہ ایک آبگینہ ہو۔ ہر لمحہ اسے خوش کرنے، خوش رکھنے اور ہنستے مسکراتے دیکھنے کے لیے کوشاں رہتے۔ کتنے بھی تھکے ہوئے ہوتے اگر وہ دلنشیں انداز دلربائی لیے کہیں گھومنے پھرنے کی فرمائش کرتی تو جھٹ جاندار لب و لہجے میں جواب دیتے۔

"کیوں نہیں، میں ابھی دس منٹ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔"

ثمین کو لانگ ڈرائیو، فطری مناظر کی سیر اور رات کو باہر کھانا کھانا بہت پسند تھا۔ محسن حتی الوسع اس کی خواہشات کا احترام کرتے بلکہ اس کی ہر خواہش اور

پسند کو پورا کرنا جیسے انہوں نے اپنا فرض بنا لیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو چاہے جانے کی بجائے چاہنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی کوئی غرض کوئی ذاتی خوشی نہیں۔ دوسروں کی مرضی کو اپنی مرضی بنا لینا اور دوسرے کی پسند میں ڈھل جانا اور ہر وقت اپنے عزیز رشتوں کے حضور خوشی کے نذرانے پیش کرتے وہ عجیب قلندرانہ فطرت کے مالک تھے۔ بے پناہ حساس' بے حد' بے حساب پیار کرنے والے۔

❁ ❁ ❁

"یہ کیا آج آپ ایک بجے ہی آ گئے۔"

وہ لاؤنج کی قد آدم کھڑکی کے براؤن ٹنٹڈ گلاس سے باہر دم بہ دم برستی پھوار اور اودے سرمئی بادلوں کی آنکھ مچولی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ انہیں خلاف توقع سامنے پا کر حیرت و مسرت سے گنگ رہ گئی۔

وہ سرمئی ٹوپیس میں سیاہ گھنے بالوں میں ننھی چمکتی بوندوں کے ساتھ بارش کے اس سہانے موسم میں بہت تروتازہ دکھائی دے رہے تھے۔

"میں ہاف ڈے لیو لے کر آیا ہوں۔" ان کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی مہربان نرماہٹ تھی۔

"مگر اس چھٹی کی ضرورت کیوں پیش آئی۔" وہ استعجابیہ گویا تھی۔

"میں جانتا ہوں' تمہیں یہ موسم بہت پسند ہے اور ایسے میں گھر میں ٹکنا تمہارے لیے دشوار ہو جاتا ہے' اس لیے جونہی بارش کی بوندیں زمین پر گریں' میں چھٹی لے کر آ گیا۔"

وہ اس کے قریب آ کر اس کے ریشمی گداز گلابی ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبانے لگے۔ لہجے میں بڑی بے ساختہ سی وارفتگی تھی۔

"لیکن موسم انجوائے کرنے کے لیے تو آپ دفتر سے واپس آ کر بھی مجھے گھمانے لے جا سکتے تھے۔"

"کیا پتا چار بجے واپس آتا تو موسم اپنی جون بدل چکا ہوتا۔ گرمیوں کا سیزن تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں بھلا کیوں رسک لیتا۔" انہوں نے پیار سے اس کی تھوڑی چھوئی۔ شین کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ان کے اس درجہ التفات پر۔

"آپ مجھ سے اتنا پیار کیوں کرتے ہیں۔" وہ عجیب سے الجھے ہوئے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"تو اور کس سے کروں۔" وہ سادگی سے ہنس دیے۔

"ایک تم ہی تو ہو جو اتنی بڑی دنیا میں میری اپنی ہو اور میرا ہے ہی کون۔ اس پوری دنیا میں صرف ایک ہستی ہے جو میری ذات کا حصہ ہے' مجھ سے قریب ہے۔ میں سارا پیار اس پر نہیں لٹاؤں گا تو کس کے لیے جمع کر کے رکھوں گا۔ میرا جو کچھ ہے' تمہارا ہے اور جو تمہارا ہے' وہ سراسر میرا ہے۔ پیار چھپانے یا دبانے کے لیے تو نہیں ہوتا۔ اگر میں تم سے پیار کرتا ہوں تو اس کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔" وہ جھک کر گیلے جوتوں کے تسمے کھولنے لگے۔

"اچھا جلدی سے تیار ہو جاؤ' راول ڈیم چلتے ہیں۔"

"اتنی برستی بارش میں۔" اس نے آنکھیں پھیلائیں۔

"وہاں بیٹھیں گے کہاں۔"

"بھئی گاڑی کو کنارے کے پاس روک کر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے نظارہ لوٹیں گے پھر ریسٹورنٹ میں بیٹھ جائیں گے اور گلاس وال سے موسم کی حشر سامانیاں ملاحظہ کریں گے۔ کیسا۔" وہ بالوں میں برش کر رہے تھے۔

"زبردست۔" وہ جوشیلے انداز میں اٹھی تھی۔

"سنو' بہت خوبصورت سا سوٹ پہننا جو موسم کی طرح آفت دکھائی دے۔" انہوں نے تاکید کی تھی۔

"اچھا جناب۔" اور جب وہ ہلکے گلابی اور آف وائٹ کمبی نیشن کے سلور ڈاٹس کے پرنٹ کے دیدہ زیب جارجٹ کے سوٹ میں ہمراہ گلابی نگینوں کے نیکلس میں نیچرل میک اپ کیے سادگی و پرکاری کا مجسمہ بنی سامنے آئی تو وہ والہانہ اس کی سمت بڑھے تھے۔

"ارے حسن کی شہزادی آ گئی۔" بلا کی پرشوق

نگاہ تھی کہ وہ بری طرح گھبرا گئی۔

"حسن و دلکشی کا ہر استعارہ تمہارے بن ادھورا ہے لیکن اتنی پیاری ہو تم۔" وہ اس کے قریب آ گئے تو شین کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

"اچھا چلیے نا' ابھی مجھے میچنگ چوڑیاں بھی لینی ہیں۔" وہ ان کے پرحرارت وجود کی آنچ دیتی قربتوں سے فرار کے راستے ڈھونڈنے کو ان کا دھیان بٹانے لگی۔

"میرے پاس کوئی بھی پنک کلر کا چوڑیوں کا سیٹ نہیں ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"ابھی بازار سے گزرتے ہوئے لے لیتے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے۔" ان کے لہجے سے شیرینی ٹپک رہی تھی۔

"وہ تو تب لیں گے نا جب چلیں گے۔" وہ ناز سے گویا ہوئی۔ لہجے میں کچھ شکایت بھی تھی۔

"چلیے حضور! ابھی لیجیے۔" وہ اسے ہمراہ لیے باہر آ گئے تھے۔

❁ ❁ ❁

"یار! وہ میرے دوست کی آٹھ سالہ بچی آ رہی ہے یہاں۔ زیبا نام ہے۔ وہ اپنی مسز کے علاج کے لیے ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے لندن جا رہا ہے۔ بچی کو ہمارے یہاں چھوڑنا چاہتا ہے۔" محسن اپنے اور اس کے لیے کافی بنا کر لائے تھے' اس کا مگ پکڑا کر وہ ریموٹ سے چینل بدلنے لگے تھے۔

"ان کی مسز کو کیا عارضہ ہے۔" وہ میگزین رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بریسٹ کینسر تشخیص کیا گیا ہے۔ ابھی ابتدائی اسٹیج ہے اور ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ کیئر کی گئی تو کچھ عرصہ بعد ختم ہو سکتا ہے۔ عدنان کو یہاں دکھا کر تسلی نہیں ہوئی' سو تفصیلی علاج معالجے کے لیے لندن لے جا رہا ہے۔"

وہ کافی ختم کرنے کے بعد اس کے قریب صوفے پر اس کے زانو پہ سر ٹکا کے لیٹ گئے تھے۔

"کون سی مووی دیکھ رہی ہو؟"

"ابھی خاندان والا ویڈیو شاپ سے لے کر آیا ہے۔"

"کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔" وہ بھی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ہاں میاں بیوی کے درمیان بدگمانی اور شک کے گرد گھومتی ہے۔ شوہر چاہتا ہے بیوی سراپا اسی کے لیے ہو' صرف اس کی طرف متوجہ رہے جبکہ بیوی کا ایک بچپن کا ہمسایہ دوست ہے جو شادی کے بعد بھی بے تکلفی سے ملنے آتا ہے۔ یہ چیز شوہر کو بیوی کی طرف سے مشکوک کر دیتی ہے اور وہ اسے میکے واپس بھیج دیتا ہے۔"

"اچھا۔" وہ دلچسپی سے سن رہے تھے۔ "اچھا' ایک بات ہے۔" پھر وہ اسکرین سے نظریں ہٹا کے اس کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔

"ویسے شین! یہ بات تو سو فیصد سچ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی کوئی تیسرا وجود نہیں ہونا چاہیے۔"

"لیکن بیوی صرف بیوی ہی نہیں ہوتی' کسی کی بہن' بیٹی یا سہیلی بھی ہوتی ہے۔ ان رشتوں کا بھی اس پر اتنا ہی حق ہوتا ہے۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ شادی کے بعد وہ خاوند کے علاوہ ہر رشتے سے کنارہ کش ہو جائے یا ان تعلقات کو نبھانے کے تقاضوں سے منہ موڑ لے۔"

فلم سے قطع نظر اس نے اپنا ذاتی خیال پیش کیا تھا۔

"ماں باپ' بہن بھائی یا سہیلیوں سے ملاقات پر کس نے پابندی لگائی ہے۔ بس اس کے دل میں' خیالوں میں' سوچوں میں صرف اس کا شوہر ہونا چاہیے' کسی دوسرے کا خیال جگہ نہ پائے' کوئی اور ان جذبوں کا دعویدار نہ بنے جو صرف اپنے خاوند کی امانت ہوا کرتے ہیں۔"

"بہت جذباتی اور انتہا پسند ہیں بھئی۔" اس نے ہنس کر فقرہ کسا۔

"شاید بیوی کے معاملے میں ہر مرد انتہا پسند بن جاتا

ہے۔" انہوں نے فخر سے اعتراف کیا تھا۔

"لوگ اولاد صالح مانگتے ہیں یاسمین! میں کہتا ہوں اولاد سے بھی پہلے بیوی صالح ہونی چاہیے کیونکہ اولاد بھی تو اسی ماں کی آغوش میں پرورش پاتی ہے۔ نیک اور پارسا بیوی زمین کو ہو کے جنت بنا رہی ہے اور اپنے لیے آسمان پر جنت میں جگہ پانے کا بندوبست کر رہی ہے۔ مجھے اپنی بیوی کی ہر خامی قبول ہے۔ بھلے وہ پھوہڑ ہو، غصیلی اور تنگ مزاج ہو، سب قبول ہے بس اس کے کردار میں عیب نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی وفاداری اور ایمانداری میں رتی برابر شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ بھلے اس میں سو دنیاوی عیب ہوں مگر عیب یعنی بدکرداری، بے وفائی اور بے حیائی نہیں ہونی چاہیے۔" محسن نے سنجیدگی و شائستگی کے ساتھ اپنا نقطہ نظر واضح کیا تھا۔

وہ دم بخود سنتی رہ گئی۔ کبھی کبھار ہی وہ ایسے بلیغ و مفصل انداز بیان کے جوہر دکھاتے تھے۔

"تو کیا آپ کو یہ خوبیاں میری ذات میں نظر آتی ہیں۔" وہ کچھ ناز و تفاخر سے استفسار کرنے لگی۔

انہوں نے محبت سے اسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

"ایمانداری، وفاداری، پارسائی، حیاداری۔ کیا میں اس کسوٹی پر پوری اترتی ہوں۔"

"اگر مجھے اس بارے میں سوئی برابر بھی شبہ ہوتا تو اپنی اور تمہاری جان ایک کر دیتا۔" انہوں نے ہولے سے اس کے گال پر چپت رسید کی۔

"یہی خوبیاں تو تمہاری خوبصورتی اور دلکشی کا باعث ہیں۔ انہی کی وجہ سے مجھے تم دنیا کی تمام عورتوں سے زیادہ حسین اور خوبصورت دکھائی دیتی ہو۔ یاد رکھو حسن بذات خود کچھ بھی نہیں ہوتا۔ حسن وجود کا نام نہیں ہے۔ نیکی کی چمک اور دل کا خالص اور نرم ہونا انسان کو حسین بناتا ہے۔ حسن وہ روشنی ہے جو قلب سے پھوٹ کر چہرے پر جھلکتی ہے۔ حسن وہ نرمی و ملاحت ہے جو سچے اور کھرے دل کے راستے چہرے کے نقوش میں مکمل ڈھل جاتی ہے۔ تم مجھے اس لیے خوبصورت نظر آتی ہو کیونکہ تمہارا اندر خوبصورت اور خالص ہے۔ تمہارا دل اور سوچ پاکیزہ ہے۔ تم سر تا پیر سے محبت و خلوص کا مجسمہ ہو۔"

وہ ان باتوں پر صرف ان کو دیکھ کر رہ گئی۔

❋ ❋ ❋

زیبا بڑی پیاری، ذہین اور باتونی لڑکی تھی۔ باتوں کا تو اسے جیسے خبط تھا۔ ہر وقت بولتی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ کبھی محسن یا ثمین کے کہنے پر فون اٹینڈ کرتی تو بھی مخاطب کے ساتھ گپ شپ میں بزی ہو جاتی تھی۔

"اسے تو جیسے بولنے کا مراق ہے محسن۔" ثمین نے کچھ دن گزرنے کے بعد ہنستے ہوئے کہا تھا۔ وہ اکثر ثمین سے اپنے بچپن، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے قصے سنانے پر اصرار کرتی۔ ثمین بھی محسن کے جانے کے بعد اکیلی رہ جاتی تھی۔ سو زیبا کے آجانے سے اس کا وقت آسانی سے کٹنے لگا۔

اسے آئے ایک ماہ ہو چلا تھا۔ اس روز ثمین کو اپنی ایک دوست کے ہاں جانا تھا، زیبا کا موڈ نہیں بنا۔

"آنٹی! میں آپ کی دوست کے ہاں جا کر بور ہو جاؤں گی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلو یوں کرتے ہیں میں آپ کو ایک اچھی سی کارٹون مووی خانساماں سے منگوا دیتی ہوں، آپ وہ انجوائے کریں، میں دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔"

"اوکے آنٹی!"

ثمین خانساماں اور ملازمہ کو بچی کا خیال رکھنے کی خاص تاکید کرنے کے بعد چلی گئی۔ زیبا مووی میں منہمک تھی جب سائیڈ پہ پڑا فون بجا۔

"ہیلو۔"

"اوہ ہائے ڈیئر! کیا حال ہے۔" کسی نوجوان لڑکے کی دوستانہ آواز ایئر پیس پہ ابھری تھی۔

"بالکل ٹھیک ہوں، آپ کون ہیں انکل! محسن انکل تو گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے حیرانی ظاہر کی۔

"محسن انکل کون ہیں بھئی۔"

"وہی جن کے ہاں آپ نے فون کیا ہے۔" وہ بچہ جان کر وضاحت کر رہی تھی۔

"اوہ یس۔ تو گویا محسن انکل گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے سوچ کر کہا۔

"آنٹی تو یقیناً ہوں گی نا۔"

"کون، ثمین آنٹی! ارے نہیں بھئی وہ اپنی دوست سائرہ کے ہاں گئی ہیں۔ دو گھنٹے بعد لوٹیں گی۔" بچی اپنے مخصوص بے پروا انداز میں گویا تھی۔

"آپ کی آنٹی خاصی بوڑھی اور بدصورت ہوں گی۔" وہ بھی یقیناً تاڑ گیا تھا کہ بچی باتونی اور پیٹ کی ہلکی ہے۔ اسی لیے وہ چالاکی اور ہوشیاری سے بظاہر دوستانہ و بے نیاز انداز اپنا کر معلومات حاصل کرنے لگا تھا۔

"ارے واہ۔" حسب توقع بچی برا مان گئی اور وہ عمر بتا دیا جس سے وہ "آنٹی" کی عمر کے بارے میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ "میری آنٹی تو اتنی ینگ ہیں اور خوبصورت بھی بہت ہیں۔"

"ہونہہ۔ سانولی رنگت اور کالی آنکھیں بھی بھلا خوبصورتی کی نشانی ہوا کرتی ہیں۔" وہ منہ بچھا کر مذاق اڑانے لگا۔ یہ تیر بھی اس نے ہوا میں چلایا تھا اور یہ بھی حسب سابق عین نشانے پر لگا۔

"جی نہیں۔ آنٹی تو اتنی گوری ہیں اور ان کی براؤن آنکھیں تو بہت ہی اچھی دکھتی ہیں۔ آپ بھی بس۔" وہ ٹھنک کر بولی۔

عمر نے دل ہی دل میں یاہو کا نعرہ لگایا تھا۔ باتوں باتوں میں اس آفت کی پرکالہ نے خاصی کام کی معلومات فراہم کر دی تھیں جن کی روشنی میں وہ باآسانی اس گھر میں نقب لگوا سکتا تھا۔

"آپ کے انکل تو آنٹی سے بہت پیار کرتے ہوں گے۔"

اس نے عام سے انداز میں ایک بہت خاص بات پوچھی تھی۔

"ہاں بہت۔ بہت زیادہ۔ آنٹی کہتی ہیں جتنے آسمان پر ستارے ہیں ان سے بھی زیادہ وہ آنٹی سے پیار کرتے ہیں۔" وہ اپنی معصومیت کے تقاضے نبھا رہی تھی۔

"مزا ہی آگیا عمر بھائی!" وہ خود کو شاباشی دے رہا تھا کہ رانگ نمبر کے کیسا زبردست شکار ہاتھ لگا تھا۔ اس نے احتیاط سے نمبر ذہن میں دہرا کر سائیڈ پر رکھی فون بک میں لکھ لیا۔

"انکل کب آتے ہیں بیٹے؟"

"شام چار بجے۔"

"گھر میں اور کون کون رہتا ہے۔"

"بھئی میں، انکل اور آنٹی۔" وہ حسب سابق جھلائی۔

"اور ملازمہ اور خانساماں۔" پھر وہ کرید کرید کر "آنٹی" کے متعلق مزید معلومات لینے لگا۔ شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے، شادی سے پہلے "آنٹی" کہاں رہتی تھیں، کیا کرتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔

"مگر آپ ہیں کون؟"

وہ اپنی باتونی فطرت کے مطابق بتاتو سب کچھ رہی تھی مگر ساتھ ساتھ الجھ بھی رہی تھی۔

"میں آپ کی ثمین آنٹی کا کلاس فیلو ہوں جناب۔" عمر اکثر شرارت میں یہی نام بتاتا تھا۔ مکمل معلومات لینے کے بعد اس نے فون رکھ دیا تھا۔

اب وہ بڑی ترنگ سے نئے "پروجیکٹ" کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

❋ ❋ ❋

وہ دونوں چھوٹی موٹی شاپنگ کے لیے قریبی بازار گئے تھے۔ یونہی جیولری شاپ کے پاس سے گزرتے ہوئے شوکیس میں رکھے زیورات میں سے اسے ایک بہت نازک اور نفیس ڈیزائن کا لاکٹ پسند آیا۔ وہ دل کی شکل کا تھا جس کے ارد گرد بڑے خوبصورت سفید اور میرون نگ لگے ہوئے تھے۔

"یہ کس قدر خوبصورت ہے۔ گولڈ کی چین میں کتنا زبردست لگے گا۔" اس نے بے ساختہ ستائش کی تھی۔

"اچھا لگ رہا ہے تو لے لو۔" وہ اس کی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے شاپ کے اندر داخل ہو گئے۔

وہ کوئی الجھن دل دے بیٹھا تھا۔ عمر لڑکے والوں کی طرف سے منگنی لانے والے گروہ میں شامل تھا۔ عقل فون وہ سموں کے گھروں میں اسلام بپا کرنے کے علاوہ عمر نے بھی سنجیدگی سے اپنی پسند یا شادی کے لیے نہیں سوچا تھا بلکہ اس سلسلے میں اس نے کبھی دھیان دینے کی بھی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس بت کافر کی ایک جھلک نے اس کے ارادوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

"دلبر اس لڑکی کا پتا بتاؤ، مجھے اس سے شادی کرنی ہے۔"

دولہا کا پھوپھا زاد بھائی جو اس کا یار غار تھا اور جس کی دعوت پر وہ آیا تھا اس کا فوری مطالبہ بلکہ ارادہ جان کر ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

"اب کوک کی جگہ کچھ اور تو نہیں پی لیا تو۔" دلبر اپنے دوست کی لاابالی، جذباتی اور غیر سنجیدہ طرز زندگی کا گواہ تھا۔ اس سے اس درجہ قطعیت کی توقع کہاں رکھ سکتا تھا۔

عمر کی انتہا پسند فطرت نے ہمیشہ اسے من چاہا کسی بھی قیمت پر حاصل کرنے کی ترغیب دلائی تھی اور پھر یہ تو اس کی وہ خوشی تھی جس کے بغیر وہ جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب دلبر نے معلومات کرنے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد یہ بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے اور شادی کو ڈیڑھ برس گزر چکا ہے، تب بھی اسے حاصل کرنے کی چنگاری سرد نہیں ہوئی۔

"جس چیز پر عمر احمد ایک بار پسندیدگی کی نگاہ ڈالے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ عمر احمد کی نہ بنے۔ اس کی ملکیت میں نہ آئے۔ میں تو پسند کیا ہوا گلی کا پتھر بھی نہ چھوڑوں تو ایک جیتی جاگتی قیامت کو اپنی دسترس میں لیے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں۔"

اس کی سنہری چمکدار آنکھوں میں ہٹیلے پن کی لالی تیرنے لگی۔

"یہ غلط بات ہے عمر۔" دلبر نے سنجیدگی سے سمجھایا۔

"وہ آنٹی رئیس کی ملنے والی ہیں۔ میں اپنی بھابھی کی ماں کے تعلق داروں کے ساتھ زیادتی کیوں کر کر سکتا ہوں۔"

"میں نے تمہیں صرف فون نمبر لانے کے لیے کہا ہے۔" وہ بگڑ کر دوست پر الٹ پڑا۔ "باقی میں جانوں اور میرا کام۔"

"کیا کرو گے تم فون نمبر کا۔" دلبر نے گہری نظروں سے در حقیقت پریشان ہو کر اسے ٹٹولا تھا۔

"یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔" اس کا لہجہ مبہم تھا۔ دلبر سخت مشکل میں گرفتار تھا۔

* * *

وہ سست قدموں سے بیڈروم میں داخل ہوئی تو انہیں فون پر محو گفتگو پایا۔

جب تک اس نے اندر آ کر ان کے پریس کیے ہوئے کپڑے وارڈروب میں ہینگ کیے وہ بات ختم کر کے پلٹ چکے تھے اور پلٹنا اور پلٹ کر ایک گہری کاٹ دار زہریلی نگاہ ڈالنا ہی غضب ہو گیا۔

"جو شخص تمہارے گالوں، بالوں اور آنکھوں کا رنگ تک جانتا ہے، تمہاری یونیورسٹی، کلاس اور بھائی بھابھی کی خبریں رکھتا ہے، ہمارے ازدواجی رشتے کی گہرائی اور حساسیت سے واقف ہے۔ وہ تمہارا اتنا کیسے ہو سکتا ہے ثمین بیگم! یاد رکھو، جس لمحے میرے دل میں تمہاری بے وفائی اور دروغ گوئی کا نقش پوری طرح پرنٹ ہو گیا، اس لمحے سے تم پر زندگی حرام کر دوں گا۔"

ان کی سرخ آنکھوں اور گمبھیر دھیمے لہجے سے بلا کی وحشت ٹپک رہی تھی۔

وہ خوف سے پیلی پڑ گئی۔ ان کے قریب آ کر ان کا بازو تھام لیا۔

"محسن! میرا یقین کریں۔ میں سراپا بے گناہ ہوں۔" اس نے لجاجت سے کہا۔ "اسے کہیں اگر سچا ہے تو کوئی ثبوت لائے۔ محسن! اتنا بے حد و حساب سکھ اور پیار پانے کے بعد کون بد قسمت اپنی جنت میں دوزخ کی آگ دہکاتا ہے۔ مجھے کس چیز کی کمی تھی جو

بیٹی عمر والی مجھے کھوٹے راستوں کی طرف گامزن کرتی۔ میں پور پور آپ کے دیے ہوئے سکھ میں بھیگی ہوئی ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"عورت کی پارسائی اور وفاداری سو رنگ بدلتی ہے۔ وہ محبوب کے لیے بھی اتنی ہی سپاس گزاری ظاہر کرتی ہے جتنی شوہر کے لیے۔ محبت کسی سے ہوتی ہے نباہ کسی سے اور وہ دونوں جگہ اپنی وفاداری کے جھنڈے گاڑ کے مرد کو بے وقوف بناتی ہے۔"

انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا تھا۔ لہجہ بلا کا تلخ تھا۔ ثمین کے دل پر جیسے کسی نے نیزے کی انی چبھوئی تھی۔ وہ تو اس کی طرف سے رتی برابر التفات یا پہل کرنے پر جواباً پیار کے پھولوں سے نہال کر دیتے تھے۔ اس کی ذرا سی دلبرانہ مسکراہٹ ان کے دل میں چراغاں کر دیتی تھی اور اب۔

اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور بے چارگی سے انہیں دیکھنے لگی۔

گزشتہ ایک ہفتے سے وہ کس قدر ان کے آگے پیچھے پھر رہی تھی۔ ان کی پسند کے کھانے بناتی تو وہ سرے سے ٹیبل پر ہی نہ آتے۔

اپنے ہاتھ سے کپڑے پریس کر کے ہینگ کرتی تو صبح وہ کوئی دوسرا جوڑا نکال کر پریس کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ان کے لیے چائے، کافی، پانی ہر بات کا دھیان رکھتی مگر وہ فرمائش کر کے نہ دیتے۔ ایسا موم سا پانی آدمی اتنا پتھر اور آگ کیسے بن گیا تھا۔

وہ ان کی بے حسی اور کٹھور پن پر تکیے میں سر دیے رو دیتی اور وہ دیکھ کر نظر انداز کر دیتے۔ اس کے ایک آنسو پر تڑپ کر مرہم بن جانے والے نے اب بذات خود ہاتھ میں نشتر لے لیا تھا۔

کبھی وہ جان بوجھ کر کھانے کی ٹیبل پر نہ آتی۔ وہ خانساماں یا ملازمہ سے پوچھتے تک نہیں تھے۔ اس کے بغیر نوالہ نہ توڑنے والا اس کے وجود کی اہمیت کی مکمل نفی کیے اب اپنی دھن میں رہنے لگا تھا۔

دشت تنہائی، نا کردہ گناہوں کا طوق اور محسن کے رویوں نے اسے پاگل کر ڈالا تھا۔

اور آج جب لیڈی ڈاکٹر نے اسے یہ خوش خبری سنائی تھی تو چند لمحوں بعد وہ اس عمل کے حصار کی ... کہ سوچا تھا جب ان کو ان کی زندگی کی اولین خواہش پوری ہونے کی نوید سناؤں گی تو وہ مسرت سے نہال ہو کر اسے اپنی بانہوں میں پھول کی طرح سجا لیں گے۔ مگر اب جیسے تمام الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

اس کا جی چاہا کوئی بھاری چیز لے کر اپنے سر پر دے مارے۔

"ارے آپ کو اپنے اندر ہونے والی تبدیلی کا احساس بھی نہیں ہوا۔ بچہ تین ماہ سے زائد کا ہو گیا ہے۔ کیسی بے خبر ماں ہیں آپ بھی۔" لیڈی ڈاکٹر نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے خوش رہنے اور خوب کھانے پینے کی ڈھیروں ہدایات دی تھیں۔

"اگر کوئی اور لمحہ ہوتا تو یہاں حالت میں اسی طرح بے پایاں مددگار رہی ہوتی۔" وہ گھر سے نکل گئے تھے اور ثمین بستر پر ہچکیاں لیتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

جانے کیا بات تھی کچھ عرصے سے بلاوجہ رونا آتا تھا۔ عجب بے قراری اور بے چینی دنوں میں بندھ گئی۔

* * *

پہلے "مطلوب و محبوب" نمبر ڈائل کر کے رانگ نمبر کی کہانی کی اگلی قسط سن لوں۔"

چار دن تک سوچتے رہنے کے بعد آج عمر نے دلبر سے حاصل کردہ فون نمبر پر بات کرنے کا ارادہ باندھا تھا۔ نمبر تو اسے اسی وقت حفظ ہو گیا تھا۔

"دیکھیں ذرا "رانگ نمبر" کا "چیلنج" کمال ہو۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ ڈائری کے اوراق پلٹتے ہوئے اس نے مطلوبہ نمبر دیکھا پھر بری طرح چونکا۔ یہ بھی وہی نمبر تھا جو اس کے حافظے میں نقش ہو گیا تھا۔ وہ اپنی عقل پر ماتم کرتا رہ گیا۔

"میں اس درجہ بے وقوف ہوں۔ چار دن سے میرے پاس یہ نمبر ہے اور میں نے یہ نہیں جانا کہ یہ

میرا عنادل چھپا نہ ہو۔ اسے اپنی خوش قسمتی کہوں یا
تقدیر کی اندھا دھوری۔
وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا آنکھیں پھاڑ پھاڑ
کر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔
"میں تمہیل ہی تمہیل میں ابھارتے صاف کرتا رہا
ہوں۔" اسے کبھی سی خوشی ہوئی۔ گویا زیادہ "محنت"
نہیں کرنی پڑے گی۔ اس کے خاوند کو تو میں پہلے ہی
اس سے اچھا خاصا برگشتہ کر چکا ہوں۔ لوہا گرم ہے'
چوٹ لگانے کی دیر ہے اور بس۔ پھر محبوب قدموں میں
ہوگی۔"
یا ہو۔ "وہ کمرے میں ناچ رہا تھا۔
"جس پروجیکٹ کو میں اتنا مشکل سمجھ رہا تھا'
انجانے میں خود ہی اس کا پچھتر فیصد کام مکمل کر چکا
ہوں۔ واہ کیا بات ہے میری۔"
جس شخص کو شروع سے صرف اپنی ذات تک
سوچنے اور اپنے لیے جینے کی تربیت و فطرت ملی ہو' اس
کے اندر روشن ضمیری ڈھونڈنے کا کیا سوال۔
اب وہ بڑے دل سے "رانگ نمبر" ملا رہا تھا۔

❀ ❀ ❀

"جی میں حماد بول رہا ہوں۔"
"دیکھو مسٹر! میں آخری دفعہ تم سے مخاطب ہوں۔
میں کل سے سی ایل آئی لگوا رہا ہوں۔ اگر تم جھوٹے
ہوئے تو ٹیلی فون کا محکمہ خود ہی تمہارے لیے موجبہ سزا
تجویز کرے گا اور اگر تم سچے ہو تو مجھے ثبوت فراہم
کرو۔"
وہ خود پر قابو پا کر سرد انداز میں مخاطب تھے۔
"دیکھیے صاحب! ڈر تو اس کو ہو جو جھوٹا ہو' میں
حماد ہوں' ثمین کا کلاس فیلو ہوں اور ماضی میں میری اور
ثمین کی بہت یادگار وابستگی رہی ہے۔ وہ انکار کریں تو
کریں' میں چونکہ کسی مصلحت یا مجبوری کا پابند نہیں
ہوں' اس لیے میں اپنے تعلقات سے مکرنے پر تیار
نہیں ہوں۔ اگر ثبوت چاہتے ہیں تو بذریعہ ڈاک آپ
کو ثبوت بھی مل جائے گا۔"
اس کا لہجہ اتنا مہذب و متین' سنجیدہ اور بردبار تھا
کوئی اس کی پر یقین باتوں کو جھٹلانے کا تصور بھی نہ
کر سکے۔ وہ ڈھے گئے۔
ثمین تم نے بری طرح ڈس لیا ہے میرے بااعتبار
اور شفاف دل کو۔ ان کا لہو شریانوں میں ابلنے لگا۔ ہر چیز
میں اعتدال لازم ہے۔ پائیدار محبت بھی توازن مانگتی
ہے۔ تب ہی اس کا لطیف اور طمانیت بخش روحانی
لمس محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ جنونی اور اندھی بن
جائے تو بہت جلد شکوک کی گرد میں اٹ جاتی ہے'
بدگمانی کے بادلوں میں دب جاتی ہے۔ اس بے اعتباری
کا دھواں اس کو کثیف' بوجھل بلکہ بوجھ بنا دیتا ہے
اعصاب کے لیے۔ جہاں بے پناہ محبت ہو' وہاں
محبوب کی ذات سے وابستہ حساسیت محبت کرنے والے
کو شکی اور وہمی کر دیتی ہے۔ اسے عقل اور فہم و
فراست سے کام لینے کی بجائے جذباتی اور نادان بنا دیتی
ہے۔ یہی معاملہ محسن کے ساتھ تھا۔
ان کا بس چلتا تو وہ ثمین کو چھو کر گزرنے والی ہواؤں
سے بھی حسد کرتے۔ جب کچھ دن بعد ڈاک سے
ثمین کے لکھے ہوئے محبت نامے' جو کبھی ماضی میں کسی
حماد کے نام لکھے گئے تھے' انہیں آفس کے پتے پر
وصول ہوئے تو شعور و آگہی کو لمحہ بھر کے لیے آواز
دیے بغیر ہی انہوں نے اپنی دانست میں انہیں درست
مان لیا۔
ثمین التجائیں کرتی رہ گئی کہ یہ میں نے نہیں لکھے'
میرے ہاتھ کی تحریر نہیں ہے۔ بھلے آپ مجھ سے
لکھوا کر دیکھ لیں مگر انہوں نے یہ عذر تسلیم نہیں کیا۔
"انگلش ہینڈ رائٹنگ کو بدلنا کون سا مشکل کام ہوتا
ہے۔ اردو میں لکھے ہوتے جب بھی کوئی بات بن
جاتی۔"
وہ زہریلے انداز میں پھنکارے تھے۔ وہ پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگی۔
"میں اپنی جان دے دوں گی محسن! آپ کی بے
اعتنائی اور بے اعتباری کا عذاب سہنا میرے لیے

ہے کے برابر ہے۔
اور جو مجھے زندہ تابوت میں دفن کر دیا ہے۔"
راہٹ لہجے سے لے کر ان کی آنکھوں میں اتر آئی
تھی۔
"ایک ایک سانس لینا زہر بن گیا میرے لیے
میرے اندر آتش فشاں ابل رہا ہے۔ فی الحال فوری
طور پر میری نظروں سے دور ہو جاؤ' ورنہ میں کچھ کر
بیٹھوں گا۔"
ان کے سر پر جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ ثمین دہل کر
عیاں بھری کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

❀ ❀ ❀

وہ خاص طور پر دلبر کے ہاں مہندی اور شادی کی فوٹو
کھنچنے گیا تھا جس میں خود اس کی اپنی تصویریں بھی
تھیں اور مہندی پر سبز نیٹ کے شلوار قمیص میں ملبوس
ثمین کی بھی مختلف لڑکیوں اور دلہن کے ساتھ گروپ
میں فوٹو آئی تھی۔
"یار! میں نے اس البم میں سے دو فوٹو لیے ہیں جن
میں میں بھی موجود ہوں۔"
جب تک دلبر چائے لے کر آیا' وہ اپنا کام مکمل
کر چکا تھا۔
گھر جا کر اس نے اپنی اور ثمین کی الگ الگ
تصویروں کو بڑی مہارت سے یکجا کر کے کمپیوٹر پرنٹ
نکالنے کے بعد دیگر مراحل سے گزار کر ایک شاندار
تصویر بنائی جس میں ثمین بے تحاشا ہنستے ہوئے پاس
بیٹھے عمر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت
تھی اور انداز میں بے تکلفی۔
"اور اس تصویر کو پوسٹ کرنے کے بعد تم "اس"
کی ملکیت سے آزاد ہو جاؤ گی۔ پھر میں تمہیں اپنا
بنالوں گا' ہمیشہ کے لیے۔" وہ مسحور کن سوچوں کی
وادی میں قدم رکھ رہا تھا۔
"دیکھو نا' غلط ٹانکے کو ادھیڑنا ہی بہتر ہوتا
ہے۔ تمہارا اور محسن کا کیا جوڑ۔ تم تو میرے لیے بنی
ہو۔ میری بے معنی زندگی کو رنگ و روشنی اور
خوشبوؤں کے لطیف معانی عطا کرنے کے لیے بھیجی گئی
ہو۔ میں تم تک ضرور پہنچوں گا ثمین۔ کیونکہ تم میری
تقدیر ہو۔ میں اتنا زور آور اور بارسوخ ضرور ہوں کہ
بس اپنے ہاتھوں اپنی تقدیر کا نسخہ سجاؤں اور اپنی مرضی
کے کردار منتخب کروں۔"
وہ بہت سرشار اور مخمور و محو ہو کر اس کی تصویر کو
انگلیوں سے چھو رہا تھا۔
چہرے پر ایک فاتحانہ چمک تھی۔ وہ بالا ہی بالا اس
کے میکے کا ایڈریس بھی معلوم کر چکا تھا۔

❀ ❀ ❀

"آنٹی۔ آپ نماز پڑھتے ہوئے اتنا روتی کیوں
ہیں۔" زیبا نے نہایت معصومیت سے دریافت کیا
تھا۔ ثمین کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے
اور بند آنکھوں سے بہتے آنسو ٹپ ٹپ پھیلے ہوئے
ہاتھوں پہ گر رہے تھے۔
"اب تو رونا بھی بے کار ہی ٹھہرا۔ دل کا بوجھ رو کے
بھی ہلکا نہیں ہو پاتا۔ رو رو کے بھی تھک چکی ہوں
بیٹے۔" دونوں ہاتھوں سے دونوں گال پونچھنے کے بعد
اس نے جائے نماز تہ کیا تھا۔ لہجہ بھیگا ہوا اور نم آلود
تھا۔
"مگر بتاتی تو چلیے۔ کیوں روتی ہیں۔" وہ جھنجلاہٹ
بھرے انداز میں پوچھ رہی تھی۔
وہ کیا کہتی رونا تو جیسے کھانے پینے اور سونے جاگنے
کی طرح روز مرہ کا معمول بن گیا تھا۔
بعض اوقات وہ پوری پوری رات روتی
رہتی۔ نمازیں وہ پڑھتی تو تھی مگر اکثر بے قاعدگی
ہو جاتی تھی مگر اب تو جیسے اس نے مصلے کو جائے پناہ
بنا لیا تھا۔ ہر نماز کے بعد شوہر کے دل سے بے اعتباری
کے نقوش مٹ جانے کی دعا کرتی۔ اس کی بے اعتنائی'
سرد مہری اور بے حسی کو دوبارہ مہربانی و محبت میں ڈھل
جانے کی تمنا کرتی۔
زیبا نا سمجھ تھی' بچی تھی اور بہت کم سن تھی۔ اسے
کیا معلوم کہ اس کی باتونی فطرت' سادگی اور بچپنا

حصوبت کیا رنگ لا چکی ہے۔ کتنا فساد برپا کر چکی ہے۔ عمر نے بڑی خوبصورتی سے بچی کو ٹرپ کر کے اس کی زد گوٹی اور پچھلے کا فائدہ اٹھایا تھا۔ زیبا اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر باتوں باتوں میں عمر کو سارے کلیوز دیتی گئی اور عمر نے ان کلیوز کو بڑی مہارت اور خوش اسلوبی سے استعمال کیا تھا۔ خصوصاً "جب سے اتفاقاً" وہی ثمین اس کی محبوب نظر بھی بن گئی تھی اب وہ اپنی صلاحیتوں کو مزید "پالش" کر کے اپنے مقصد کی طرف رواں دواں تھا۔

"تم جو کوئی بھی ہو ناقابل معافی ہو۔ قابل تعزیر ہو۔ جو ناقابل معافی نقصان پہنچا ہیں وہ قابل معافی نہیں ہوا کرتے۔ تمہارے لیے تو یہ محض جوک ہوگا' ایک کھیل' ایک ایکٹوٹی' ایک انجوائے منٹ مگر تمہارے کھیل نے میری زندگی کو آبلہ پائی کا صحرا بنا دیا ہے۔"

ثمین شدت سے اس "نامعلوم" مجرم کی نقاب کشائی کی منتظر تھی جس نے اس کی زندگی کو ہوا کے جھکڑ کی زد میں دیا ہوا ایک حقیر تنکا بنا دیا تھا۔

"بی بی جی۔ صاحب آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔"

شام کے اترتے سائے جب پھیلنے لگے تو ملازمہ نے اطلاع دی تھی۔

"خود بلا رہے ہیں۔" اس کا خوش فہم دل دھڑکا کہ شاید کوئی اچھی خبر ہو۔ لرزتے قدموں اور دھڑ دھڑاتے دل سمیت وہ بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی۔

محسن شرٹ اتارے صرف پینٹ اور بنیان میں ملبوس بیڈ کی پائنتی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی طرف ان کی پشت تھی۔

"آپ نے بلایا ہے۔"

"ہاں۔" وہ پلٹے تو غیر متوقع طور پر ان کا چہرہ بہت پرسکون تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہوں۔

"ثمین بیگم" وہ جانچتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لہجہ ٹھہرا ہوا اور بے تاثر تھا۔ آنکھوں کی سرخی اور کلفت تو یوں بھی اب مستقل ہو گئی تھی۔

"جی!!" طرز تخاطب کے سبب وہ کچھ ہراساں نظر آئی۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ مرد یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اور ان جذبوں کا دعویدار بنے جو صرف لڑکی کے خاوند کی امانت ہوتے ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ مجھے ہر دنیاوی خامی قبول ہے مگر دینی عیب برداشت نہیں کر سکتا۔ بدکرداری' بے حیائی' بے ایمانی اور بے وفائی نہیں دیکھ سکتا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ حسن نیکی کی چمک اور خالص و مہربان دل کی زمینوں کا عکس ہے۔ ایمانداری' وفاداری اور پارسائی حسن کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ انہی چیزوں سے مل کر حسن تخلیق و تکمیل پاتا ہے۔ اور ثمین بیگم۔ آج۔ آج میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم ایک نہایت بدصورت اور بے روح وجود ہو۔ تمہاری ذات کا تعفن اور سرانڈ میری محبت اور بے ساختگیوں کی قاتل بن گئی ہے۔ سارے جذبے سب احساسات جیسے خود بخود گرم جھونکے کی طرح فضا میں آبی بخارات بنا کر اڑ گئے ہیں۔ آج میں حیران ہوں کہ اپنے دل میں کہاں تمہاری جگہ تلاش کروں۔ میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں اپنے اندر مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ تم کہیں بھی موجود محسوس نہیں ہو رہیں گویا کہ میں تمہیں جانتا ہی نہیں ہوں۔ اور جسے انسان جانتا نہ ہو اسے دل میں یا گھر میں جگہ دینے سے کیا حاصل۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے خود پر حرام کر رہا ہوں۔ تمہارے بعد کیا ہوگا یہ مجھے علم نہیں ہے مگر اتنا جانتا ہوں کہ اب اگر مزید ایک رات بھی تم میرے نام کے ساتھ بندھی رہیں تو میرے ہاتھوں تمہارا خون ہو جائے گا۔"

لہجہ بہت دھیما' نتیجے پر پہنچا ہوا اور قطعی وحتمی تھا۔ بظاہر سپاٹ انداز میں انکی برفیلی' بے رحم اور سفاک کیفیت تھی کہ ثمین کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ جیسے صدمے کی شدت سے بھونچکی رہ گئی تھی۔

"محسن۔!" اس کے مرتعش لب دھیرے سے وا ہوئے۔ جھٹکا اتنا شدید اور تیورا دینے والا تھا کہ ذہن میں نگاہوں میں گھوم کر رہ گئے تھے۔ جواب میں انہوں نے وہ تصویر سامنے پھینکی تھی۔ اس نے بدحواسی کے عالم میں تصویر اٹھائی اور پھر اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ چکراتے ہوئے سر کے ساتھ اس نے بڑی مشکل سے اپنے بکھرے اعصاب کو مجتمع کیا تھا۔

"محسن۔ یہ جھوٹ ہے۔ یہ فراڈ ہے۔ کوئی سازش ہے میرے خلاف۔ یقین کریں میں اس شخص کو نہیں جانتی۔ مجھ سے قسم لے لیں۔ محسن میں ایسی نہیں ہوں۔"

وہ گھبرائی ہوئی کیفیت میں ان تک آئی اور آبدیدہ ہو کر ان کے گھٹنے چھوتے ہوئے التجائیہ صفائی پیش کی تھی۔

شاک اس قدر شدید تھا کہ اس کی دھمک سے ثمین کا وجود جھنجھنا رہا تھا۔ وہ چھلنی چھلنی ہو گئی تھی۔ رو رو کر آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو چلے تھے۔

"ثمین کوئی گیدڑ سنگھی سنگھاؤ مجھے۔ کوئی ایسی نشہ آور چیز کھلاؤ کہ میں خود کو الو کا پٹھا سمجھ کے سب کچھ فراموش کر دوں۔ کچھ ایسا کرو کہ میرے دل کی اسکرین پر تمہاری ٹکڑوں میں بٹی تار تار تصویر دوبارہ جڑ کر جلوہ افروز ہو جائے۔ مجھے کچھ سنگھا دو کہ میں ہوش میں نہ رہوں۔ میں اس آگہی کے عذاب سے نجات چاہتا ہوں۔ نجات چاہتا ہوں۔"

ذہنی ہیجان و خلجان کی انتہا یہ تھی کہ وہ اپنے سر کے بال نوچ رہے تھے۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا اور لہجہ جل رہا تھا' بجھ رہا تھا' سلگ رہا تھا اور پھر دہک رہا تھا۔ ان پر عجب کرب ناک سی دیوانگی طاری تھی۔

ثمین کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ پوری جان سے ہل کر رہ گئی تھی۔

"تم نے مجھ سے صرف بے ایمانی ہی نہیں کی بلکہ میرے عمر بھر کے جذبوں کی جمع پونجی بھی لوٹ لی ہے' تمہاری بے وفائی اور غداری نے میرا دل قلاش کر دیا ہے۔ کوئی جذبہ نہیں رہا اس میں۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میں ختم ہو گیا ہوں' میرے احساسات گلیشیئر بن گئے ہیں' میرا سینہ بھی بن گیا ہے۔ میں زندگی میں ہی مر گیا ہوں' بنا چھوئے موت کے روبرو ہو گیا ہوں۔"

ان کی آواز حد درجہ بکھری ہوئی' مچلتی ہوئی سی تھی۔ وہ گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا انداز شکستگی' دلگرفتہ' دلگیر لہجہ' ثمین جیسے کانچ پر لوٹنے لگی۔ وہ زار و قطار روتے ہوئے تڑپ کر ان کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

"ایک بار مجھے پہچانئے محسن۔ میں آپ کی ثمین ہوں۔ وہی ثمین جسے آپ ساری دنیا سے حسین مانتے تھے۔ جس کے شوق کی خاطر محسن کے باوجود باہر جانے پر تیار ہو جاتے تھے' جس کی پسند کے موسم کی خاطر دفتر چھوڑ چھوڑ کر آیا کرتے تھے' جس کے لیے بجٹ کا دھیان کیے بغیر منہ سے نکلی ہر چیز دلایا کرتے تھے' جس کی ایک مسکراہٹ کے لیے اپنا آپ قربان کر دینے کو بے قرار رہتے تھے۔"

وہ ہچکیاں لیتے ہوئے' سسکیاں بھرتے ہوئے رو دینے کے انداز میں انہیں یاد دلا رہی تھی' بلکتے ہوئے اپنی وفا اور امانت کا یقین دلا رہی تھی۔ مگر شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔

دیوانگی کی حد تک چاہنے والے بڑے جنونی' انتہا پسند اور جذباتی ہوتے ہیں اپنے صاف شفاف چمکتے دمکتے محبوب کی فوٹوگراف پر شک کی ذرا سی گرد بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ سمجھوتے کرنا اور صبر یا جبر سے کام لینا ان کی سرشت نہیں بن پاتی۔ آر یا پار بس کر گزرتے ہیں' سو انہوں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا۔

"اگر یہ ثبوت جھوٹے ہیں تو کیا تمہاری بھابھی بھی دروغ گو ہیں؟ ان سے تصدیق کرانے کے بعد ہی میں نے کاغذات تیار کرائے تھے۔" ان کے دل سے شعلے اٹھ رہے تھے۔

وہ رونا دھونا بھول کر ہکا بکا ان کی صورت دیکھنے لگی انداز استعجابیہ اور منتظرانہ تھا۔

"میں کل تمہارے میکے گیا تھا اور تمہاری بھابھی سے پوچھا تھا کہ کیا ماضی میں تمہارا اپنے کلاس فیلو حماد

سے کوئی رابطہ رہا ہے؟" وہ چونکیں۔ پوچھنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا کچھ نہیں بس یونہی آج کل بھی اس کا فون آیا ہے۔ آپ بتائیں کیا پہلے بھی آتا تھا؟ پہلے تو صاف مکر گئیں پھر جب میں نے انہیں ان کے بچوں کی قسم دی تو مجبور ہو کر بتایا کہ ایک دفعہ کسی دوست کا فون آیا تھا مگر انہوں نے اسے بے بنیاد اور فراڈ سمجھ کر توجہ نہیں کی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھیں کہ اس وجہ سے ثمین کے ساتھ برا سلوک نہ کیجئے گا۔ ان کو میں کیا بتاتا کہ میں خود اپنے ساتھ کتنا برا سلوک کرنے جا رہا ہوں۔" محسن کا لہجہ دھیما اور بوجھل تھا۔ ثمین کا سارا اعصابی نظام جیسے تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ وہ گویا آگ پہ، سر پہ آسمان کھلے ننگے سر ننگے پاؤں اکڑی ہوئی تھی۔

"خدا کی قسم محسن میں تصویر میں موجود اس شخص کو نہیں جانتی اور نہ میں نے ایسی کوئی تصویر اس کے ساتھ کھنچوائی تھی۔"

اس کے دل کی حرکت پاگل ہو رہی تھی، سانس یوں تیز تیز چل رہی تھی گویا پھیپھڑوں کی ساری ہوا ایک ساتھ کشید کر لے گی۔ محسن نے جیب سے قلم نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا پیپر اٹھایا اور پھر جیسے دیکھے کونوں پہ گزرتے ہوئے اس پر دستخط کر دیے۔

"یہ لیں۔ اب آپ یہاں سے، جو چاہے سمیٹ کر ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی کے یا دوسرے ہونے والے شوہر کے ہاں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ ڈرائیور آپ کو آپ کے سامان سمیت گھر پہنچا دے گا۔ میں کینیڈا جا رہا ہوں اور سات بجے کی میری فلائٹ ہے۔ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔"

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے تھے۔ اس نے پتھرائے ہوئے انداز میں ایک نظر طلاق نامے کو دیکھا پھر چکرا کر جو گری تو سائیڈ پہ رکھا گلاس ٹیبل کا نوکدار سرا سیدھا پیٹ میں گھس گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ملازمہ جھجکتے ہوئے بیڈ روم کے دروازے پر آئی تو اسے خون میں لت پت قالین پہ اوندھے پڑا دیکھ کر ایک چیخ مارتے ہوئے اس کی سمت بڑھی تھی۔

* * *

بچہ تو تقریباً چار ماہ کا ہو چکا تھا سو موقع پر ہی ضائع ہو گیا تھا۔ پیٹ کا زخم تو ایک طرف ساتھ میں اس کا نروس بریک ڈاؤن بھی ہو گیا تھا۔ ملازمہ نے صاحب کو خبر نہ ہو پا کر بیگم صاحب کے میکے فون کر دیا تھا۔ گھر سے بھائی بھابھی آئے تو اس کے خون آلود ہاتھ میں طلاق نامہ دیکھ کر ان کے سروں پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ کومے میں چلی گئی تھی۔ ایسے میں بھائی جان کو پریشان حالی میں ایک نکتہ سجھائی دیا تھا۔

"عفت۔ شرعاً حاملہ بیوی کو طلاق نہیں ہوتی۔ محسن نے جس وقت ثمین کو طلاق دی اس وقت وہ حاملہ تھی غالباً محسن اس بات سے بے خبر تھا۔ کیا خیال ہے اس سے رابطہ کر کے دیکھوں۔ دس دن ہو چکے ہیں اس واقعے کو۔ پتا چلا ہے کہ کینیڈا سے واپس آ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا غصہ اتر گیا ہو۔ اور وہ اسے دوبارہ اپنانے پر راضی ہو جائے۔"

بھائی جان نے آخری امید کے طور پر یہ بات کی تھی۔

"ہاں۔ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" عفت بھابھی نے گومگو کے عالم میں جواب دیا تھا۔ مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

محسن نے بڑے سکون سے آفس چیئر کی بیک سے پشت ٹکاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"طلاق کا مطلب ہے الگ ہو جانا، رشتہ توڑ دینا اور جدائی کا یہ فیصلہ دل کرتا ہے قلم نہیں۔ طلاق قلم سے نہیں دل سے دی جاتی ہے اور میرا دل اس کو طلاق دے چکا ہے ہمیشہ کے لیے اس سے رشتہ توڑ چکا ہے۔ ہاں اگر یہ شرعی عذر ہے تو میں از سر نو کاغذی کارروائی کر کے شرعی و قانونی تقاضے پورے کیے دیتا ہوں۔ میں کل ہی اپنے وکیل سے بات کر کے نیا طلاق نامہ تیار کروا دیتا ہوں۔"

اور بھائی جان اپنے لاڈلے، خلیق و شفیق اور با مروت بہنوئی کا یہ اصل، کٹھور اور اجنبی انداز دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔

بہن کے ماتھے پر کلنک کا یہ ٹیکہ لگنا تھا سو دوبارہ لگ گیا۔ چند دنوں میں باقاعدہ طلاق نامہ مل گیا۔

وہ تو خیر ہسپتال پڑی تھی اسے کیا خبر ہوتی اور یوں بھی ہوش میں ہوتی تو بھائی جان وہ سراپا تار کرو طلاق نامہ اسے نہ دکھلاتے خوامخواہ زخموں سے کھرنڈ کھرچنے والی بات ہوتی۔

پندرہ دن کومے میں رہنے کے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو اس کا سب کچھ ختم ہو چکا تھا گھر والا بچہ اور محفوظ و مکمل زندگی۔ ہر چیز تقدیر اس سے چھین کر لے گئی تھی۔ خالی جھولی چھوڑ گئی تھی۔ عدت کے دن اس نے پاگلوں کی طرح خود سے لڑتے، باتیں کرتے، خود سے الجھتے ہوئے بولائے ہوئے انداز میں کاٹے تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا احساس زیاں کی شدت اس کے اندر ایک نئی منتقمانہ رو کو جنم دے رہی تھی۔ پھر اس کے خالی خالی دل و دماغ میں ایک بروکریس (کمر خمی) ہوئی۔ اس کے اندر دوبارہ سے ایک خواہش جاگی، جامد، صحرا سی زندگی کا ایک مقصد ابھرا۔ اور وہ مقصد و منتہا تھا انتقام۔ اپنی بربادی کا انتقام۔

"اے سفاک درندے، اے بے رحم بھیڑیے، میرے بچے کا قاتل، میری وفا اور آبرو کو داغدار کرنے والے اسفل انسان۔ میرا رواں رواں تجھے بد دعا دیتا ہے۔ تو نے اپنے کھیل میں مجھے سراپا لوٹ لیا ہے۔ اب تو ہر ہر سانس اسی امید پہ آتی ہے کہ کبھی تو تم میرے روبرو ہو گے۔ کبھی تو تمہارے پردہ نشیں وجود کو بے نقاب کروں گی۔ اور جس گھڑی تم میرے مقابل آ گئے قیامت آ جائے گی۔"

ثمین کے اندر ہر وقت بھانبڑ جلتے رہتے تھے۔ سانسوں میں جیسے زہر گھلتا تھا۔ "میرے جسم اور دماغ کے ایک ایک خلیے میں تمہارے عطا کردہ عذاب کے کانٹے اگ آئے ہیں وحشی انسان! بلکہ انسان نہیں حیوان یا شاید حیوانیت سے بھی کچھ ہاتھ آگے۔ میری عصمت و عفت کی شفاف چادر میلی کرنے والے غاصب! میں تمہاری جان لے لوں گی۔" وہ جیسے ہر لمحہ انتقام کے تیزاب میں نہاتی تھی۔ اس "مسٹر مہاتما" کے لیے نفرت کے چشمے اس کے دل میں رواں رہتے تھے۔

اپنی بے ردائی، بے سائبانی اور بے وقعتی کا دکھ اس کے بدن کے ریشے ریشے میں آگ لگا رہا تھا۔

جب وہ خطوط اور تصویر دیکھتی اس کی تکلیف بار بار مزید نمک پاشی ہو جاتی تھی۔ اس نے بڑا سنبھال کر رکھا تھا انہیں۔ تصویر میں موجود چہرہ اس کے لیے اجنبی تھا لیکن اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ اس اجنبی چہرے کو ضرور ڈھونڈ نکالے گی۔

"تم پاتال میں بھی چلے جاؤ تو میں تمہیں نہیں بخشوں گی مسٹر مہاتما۔" وہ غیض و غضب کے عالم میں سوچتی تھی۔

عدت پوری ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا جب غیر متوقع طور پر اس کے لیے ایک نہ صرف معقول بلکہ بہترین رشتہ آ گیا۔ لڑکا پڑھا لکھا، اسمارٹ اور نوجوان تھا۔ ثمین سے وہ سال ہی بڑا ہو گا۔ ایک بیوہ بہن ساتھ رہتی تھی اور ماں تھی۔ باپ ملک سے باہر ہوتا تھا اس کا مطلب جاب پر تھا۔ بھائی جان ثمین کے احتجاج کو خاطر میں لائے بغیر رضامند ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

عمر نے اس رشتے کے لیے بڑی مشکل سے ماں اور بہن کو راضی کیا تھا۔ راضی کیا بلکہ ایک طرح سے وہ اس کی ضد سے مجبور ہو گئی تھیں۔ پہلے پہل تو خاصی اکھڑی اکھڑی تھیں۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک طلاق یافتہ عورت میری بہو بنے، میں ایسا ہونے سے پہلے مرنا پسند کروں گی۔"

"بیوی مجھے چاہیے مجھے وہ قبول ہے۔ اچھی معقول لڑکی ہے۔ صورت سیرت ہر چیز بے مثال ہے۔" وہ

ابرو والے سال کے غصے کو نظر انداز کر گیا تھا۔

"اگر موصوف اتنی ہی "بے مثال" تھیں تو طلاق تک نوبت کیوں آئی۔" "آپ ایسی بھی ہو کر دیکھیں۔"

"بس بگھو دیجیے اس کو۔ اس قصے کو آپ رہنے دیں اور کل رشتہ مانگنے کے لیے جانے کی تیاری کریں۔" وہ پرسکون اور بے فکر دکھائی دے رہا تھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے لڑکے۔" نسیمہ الٹ پڑیں۔

"میں یا تمہاری بہن ہرگز وہاں نہیں جائیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اپنے دوست کی والدہ اور بہنوں کو رشتے کے لیے بھیج دوں گا۔" وہ کندھے اچکا کر فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"لڑکی والوں کو قطعی اعتراض نہیں ہو گا وہ تو یوں بھی دھوم دھڑکے اور رسمی [illegible] سے کام لینے کی بجائے سادگی سے نکاح کر کے رخصت کرنے کو ترجیح دیں گے۔"

وہ بہت پرسکون اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بات کر رہا تھا۔

اور جیسے نسیمہ اور رفعت پسپا ہو گئیں اگر بیٹا جیتے جی دلہن بیاہ کے لے آتا تو وہ آس پڑوس اور ملنے جلنے والوں کو کیا منہ دکھاتیں۔ کتنی باتیں بنتیں۔ عمر کو تو خاندان کی عزت و وقار کی پروا نہیں تھی مگر وہ اپنا تماشا نہیں لگوانا چاہتی تھیں سو بادل نخواستہ قدم میاں کے ہاں چلی گئیں۔

قدم اور عفت نے دو تین دن کی سوچ بچار کے بعد ہاں میں جواب دے دیا اور کسی طرح ثمین کو بھی سمجھا بجھا کر ہامی بھرنے پر آمادہ کر ہی لیا۔

☆ ☆ ☆

اس وقت وہ عمر احمد نامی شخص کی دلہن بنی اس کی سجی سجائی خواب گاہ میں بیٹھی تقدیر کے اس طرح پلٹا کھانے پر غور کر رہی تھی۔ دوسری شادی کا تصور بھی اس کے دل و دماغ کو چھو کر نہیں گزرا تھا مگر ایک سوا پہلے آئے ہوئے اس رشتے کو گھر والوں نے نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے جھٹ پٹ چند ہفتوں میں اسے بیاہ کر نئے گھر بھیج دیا تھا۔

ثمین نے بھاری آف وائٹ اور میرون کمبی نیشن کے لہنگے کو سنبھالتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پرس میں موجود خطوط اور تصویر کی موجودگی کا یقین کیا اور خالی خالی نگاہوں سے آنے والے کی راہ دیکھنے لگی۔

وہ یہ ٹھان کر آئی تھی کہ وہ زندگی کے نئے شریک سفر کو سابقہ زندگی کا پرت پرت کھول کر دکھا دے گی، ایک ایک باب حرف حرف پڑھا دے گی۔ وہ پہلے ہی ناکردہ گناہوں کی بہت سخت سزا بھگت چکی تھی۔ وہ آئندہ زندگی کا آغاز سچ سے شروع کرنا چاہتی تھی بھلے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ سو وہ دل میں تمام واقعات ترتیب دے چکی تھی اور ذہنی طور پر تیار تھی۔ قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ سرد پڑتی ہتھیلیوں میں پرس تھامے نگاہ جھکا کر بیٹھ گئی۔

گو کہ نئی زندگی کی شروعات کے لیے دل میں کوئی امنگ ترنگ یا جذبات نہیں جاگے تھے مگر بہرحال وہ ازدواجی تقاضوں سے واقف و آشنا تھی۔ ایک سنسنی سی بے ساختہ اس کے رگ و پے میں اترتی چلی گئی تھی۔

وہ پارلر سے تیار نہیں ہوئی تھی بھائی جان نے بہت قریبی دوستوں کو گھر پر مدعو کر کے سادگی و خاموشی سے اسے رخصت کر دیا تھا۔ شادی کا جوڑا عمر نے اپنی پسند سے بجھوایا تھا۔ بھائی بھابھی کی طرف سے ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ تو خوشی اور بے فکری کے احساسات سے منسلک ہوتا ہے۔ یہاں تو یہ تھا کہ نئی نئی طلاق یافتہ بہن کے اجڑنے کا دکھ کم کرنے کے لیے عجلت میں دوسری شادی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گھر میں ہی پڑوس کی ایک بیوٹیشن کا کورس کرنے والی لڑکی نے بھابھی کے بلاوے پر اس کا میک اپ کیا تھا اور اگر نہ بھی ہوتا تو اس کا سوگوار حسن اتنا خیرہ کن تھا کہ کوئی فرق نہ پڑتا۔

گھونگھٹ تو نہیں تھا جو درمیان میں حائل ہوتا۔ سو کمرے میں قدم رکھتے ہی عمر کو بھاری لہنگے اور زیورات میں اس کے وجود کی تمام تر حشر سامانیاں اور تجلیاں دور سے نظر آ گئی تھیں۔ ایسی برق گری تھی کہ دل بے قرار کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

"السلام علیکم۔" بہت شریر اور بے تاب سا لہجہ ثمین کی سماعتوں میں گونجا تھا۔ ساتھ ہی وہ بیڈ کے کنارے پر براہ راست اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

ثمین تیزی سے دھڑکتے دل اور الجھے ذہن کے ساتھ مہر بہ لب نگاہ جھکائے بیٹھی رہی۔

"دیکھیے ملکہ عالیہ۔ مجھ غریب پر ترس کھائیے، شوریدہ سر عشق حسن کی یہ تابانیاں، یہ گلابوں کا سا گداز، یہ قاتلانہ چمک دمک دیکھ کر تاب نہیں لا پائے گا۔ خدارا ہمیں سنبھالیے کہ ہم بے خودی میں حد سے گزر جانے کی گستاخی کرنے لگے ہیں۔" وہ فریفتگی سے بولا۔ عمر کے جذبات میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کا دل بری طرح ہمک رہا تھا کہ وہ بہت شدتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے قریب آ کر اسے خود میں سمیٹ لے اور اس کے وجود کی آسودگی دینے والی نرمی، سکون عطا کرنے والی خوشبو اور اس کے قرب کی حیات پرور حرارتوں کو اپنے اندر اتار لے۔

"آپ خاموش کیوں ہیں صاحب۔ یہ ادا تو ہمیں بے موت مار ڈالے گی۔" لہجہ لطیف سی شرارت سے شرابور تھا۔ اس کے انگ انگ سے سرور چھلک رہا تھا۔ پھر اس نے جھک کر اس کا گلابی اجلا گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے جذبوں کی آنچ سے سلگتے سرخ لبوں کی تمام تر گرماہٹ اور جوشیلا پن اس کے ہاتھ کی پشت میں اتار دیا۔

ثمین نے بری طرح گھبرا کر ہاتھ کھینچا تھا۔ عمر کی بے ساختہ ہنسی بڑی شرارتی اور معنی خیز تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ثمین کو اس کا لب و لہجہ اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔

"اچھا صاحب۔ تو گویا تڑپانے ترسانے کے خطرناک ارادے ہیں۔"

وہ دلچسپی و شوق کے عالم میں اس کے گل لالہ سے وجود کا ایک ایک نقش نرم گرم نظروں سے جانچ رہا تھا۔

"چلیے ایک ذرا نظر عنایت ہی کر دیجیے ہماری طرف۔" جذبات میں ڈوبی آواز میں کہتے ہوئے اس نے اس کی خوبصورت ملائم ٹھوڑی چھو کر چہرہ اونچا کیا۔ ثمین نے قدرے جھجک کر نگاہ اٹھائی۔ اور پھر جیسے دور پہاڑوں پر بہت زور کی بجلی کڑکی۔ کہیں شارٹ سرکٹ ہوا اور وائرنگ جل جانے سے آناً فاناً سارا گھر جل کر خاکستر ہو گیا۔

تساہل سے اٹھائی گئی نگاہیں عمر کے چہرے پر یوں چپک کر رہ گئی تھیں جیسے اب کبھی نہیں ہٹیں گی۔ احساسات اتنے شدید تھے کہ زبان لفظوں کی ادائیگی سے لاچار ہو گئی تھی۔ پھر ثمین کے وجود نے ایک جھرجھری سی لی اور اگلے لمحے وہ پاگلوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑی تھی۔

"تم۔ ! تو یہ تم ہو۔ قاتل، خونی، بھیڑیے، درندے، شیطان۔ میری بربادی کے ذمہ دار۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ بری طرح اسے نوچ رہی تھی جیسے سارا خون اس کے سر میں جمع ہو گیا تھا۔ سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھیں۔ اس کو گھر، گھر والے اور بچے کی ذات سے محروم کر دینے والا سفاک مجرم بالآخر اس کے سامنے تھا۔ ثمین کی رگوں میں جیسے آگ بجنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی وحشت اور لہو کی سرخی تھی۔

"ثمین۔ ثمین۔ یہ کیا کر رہی ہو تم۔" عمر اس اچانک افتاد پر پہلے پل تو ہونق بنا [illegible] اس کی صورت دیکھتا رہ گیا تھا پھر سنبھل کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے جھنجوڑنے لگا۔

"میں وہی کر رہی ہوں جو تم جیسے رذیل فطرت اور ننگ انسانیت ٹائپ آدمی سے کرنا چاہیے۔" وہ حلق کے بل اتنی زور سے دھاڑی کہ آواز پھٹ سی گئی۔

"آہستہ۔ گھر میں مہمان بیٹھے ہیں۔" عمر متوحش ہو کر اس کی دیوانوں جیسی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ ضمیر میں چبھا کانٹا اور دل کا چور اسے کچھ کچھ سمجھا تو رہا تھا لیکن وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو اور

ثمین اس کی اصلیت سے واقف ہو گرنہ وہ ثمین کی
اور خود اپنی نظروں میں گر جائے گا گو کہ وہ مطمئن بھی
تھا کہ اس نے اپنی حقیقی شخصیت کا کوئی ثبوت
نہیں چھوڑا۔ فون پر اس نے اپنا نام حماد بتایا تھا اور
اسی نام سے اس نے ثمین کی طرف سے ملی محبت
نامے لکھے تھے۔ مگر وہ تصویر بھجوا ہی گیا تھا۔ یہ خبر
نہیں تھی کہ تصویر بھجوا کر وہ ثمین کے لیے "ان
دیکھا" کیسے رہ سکتا تھا۔

ثمین نے خطوط اور تصویر اس کی طرف اچھال
دیے تھے۔

"دیکھو۔ غور کرو فریبی آدمی۔ یہ تمہارے ہی
کارنامے ہیں نا۔"

اس کے لہجے سے بلا کی نفرت و کراہت برس رہی
تھی۔ وہ جیسے سوکھی لکڑی کی طرح دھڑا دھڑ جل رہی
تھی۔

"ایک بہت خوبصورت جنت نشاں گھر تھا میرا جس
کا ذرہ ذرہ پیار کی مٹی سے گندھا ہوا تھا۔ میرا جیون
ساتھی مجھ پر جان نچھاور کرتا تھا اور میں اسے بتائے بغیر
اس کے بے پناہ چاہنے کی ادا سے عشق کرتی تھی۔
ایک ایسا گھر جہاں ہر وقت خوشیاں رقص کرتی تھیں
تم نے اسے ویرانیوں اور نحوستوں کا کھنڈر بنا دیا۔
ہمارے پیار کی نشانی میرا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی
دنیا سے اٹھ گیا۔ میرا جی چاہتا ہے میں سو گولیاں
تمہارے ناپاک ارادوں سے لبریز دماغ میں اتار
دوں۔"

وہ تمتماتے ہوئے لہجے میں پھنکاری۔ دیوانگی و
وحشت نے اسے آتش فشاں بنا دیا تھا۔

عمر سے سر اوپر نہ اٹھایا گیا۔

احساس جرم نے اس کی زبان گنگ کر دی۔ اس کی
تمام تر توانائیاں مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔

"ثمین مجھے اندازہ ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ
اچھا نہیں کیا۔" وہ کھنکھار کر بمشکل آہستگی سے
گویا ہوا اور ایک ہاتھ سے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔

"اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے یہ تو اب میں تمہیں
بتاؤں گی۔" وہ زہریلے انداز میں پھنکاری۔

"میں تمہیں الف تا ے سب کچھ بتا رہا ہوں۔
ثمین پلیز اسے سن کر میری سنگین غلطی معاف کر دو۔"

"غلطی نہیں۔ گناہ۔ گناہ کہو اسے۔" وہ چیخی۔

"ہاں۔" وہ ہارے ہوئے انداز میں سر جھکائے
ہاتھ مسلنے لگا۔

"لیکن یقین کرو یہ گناہ شروع میں صرف ایک
تھرل ایک ایڈونچر اور ایکٹویٹی سے زیادہ اور کچھ نہیں
تھا۔"

وہ دھیرے دھیرے اپنا آپ کھولنے لگا کہ شاید
اعتراف جرم کے بعد اس کی سچائی کے انعام میں وہ
اسے بخش دے، اس کو معاف کر دے۔

"دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنا تھرل ہے
تمہارے لیے؟ یہ محض ایک جوک، ایک کھیل تماشا
ہے کیا ضمیر کی روشنی کبھی تمہارے دل کو چھو کر نہیں
گزری؟" وہ کانٹوں بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"تمہیں میری زندگی میں شامل کر کے تقدیر نے بڑا
بھیانک مذاق کیا ہے میرے ساتھ۔ میں تمہیں ماروں
گی نہیں مگر زندگی تمہارے لیے اتنی کٹھن اور بدہیئت
کر دوں گی کہ تم خود موت کو آواز دو گے۔"

اس کا لہجہ بلا کا سخت تھا۔

جرم کی شدت اور احساس گناہ نے عمر کے حواس
سلب کر لیے تھے۔

"تم جانتے ہو اس تھرل اور انجوائے منٹ کے چکر
میں تم اب تک کتنے بے گناہ اور معصوم لوگوں کی
بددعائیں سمیٹ چکے ہو؟ کتنے گھر برباد کیے ہوں گے
تمہاری ان بظاہر "بے ضرر" اور درحقیقت انتہائی
سنگین تفریحی فون کالز نے!" وہ بپھر کر بولی۔

"کسی پر بے بنیاد الزام تراشی بلکہ بہتان تراشی
تمہارے لیے ایڈونچر ہے؟ بیٹی کو ماں سے، بھائی کو
بہن سے، باپ کو بیٹی سے، شوہر کو بیوی سے بدظن کرنا
تمہارے لیے کھیل ہے انجوائے منٹ ہے۔"

اس کی سانس پھولنے لگی۔ پھر کچھ دیر کے توقف
کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"تم ساری عمر میری بددعا کے حصار میں رہو گے عمر
احمد۔"

اب اس کے لہجے میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا
بلکہ ایک مکمل بے گانگی کا تاثر تھا۔

تم اس گھڑی سے ڈرو کہ جب تم بھی سر جھکائے
قطار شہزادگان شہر وفا میں بے بس کھڑے ہو لیکن
وہ شہر الفت کی شاہزادی
وہ خواب یادوں کے نرم پھولوں پہ پاؤں رکھتی
تمام تر حسن و تمکنت سے قطار شہزادگان شہر وفا کی
جانب بڑھے تو لیکن
تمہارے آگے سے ایسے گزرے
تمہاری آنکھیں سوال کرنا بھی بھول جائیں
تم اس گھڑی سے ڈرو کہ جس دم....

عمر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح شکستہ قدموں
سے بہت آہستگی سے بالکنی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔
اوپر ستاروں بھرا آسمان چمک رہا تھا۔ اور نیچے اس
کے بخت کا ستارہ غروب ہو رہا تھا اور بدبختی کا اندھیرا
دل کی دنیا پہ غالب ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ میں نے کیا کیا۔
یہ میں نے کیا کر دیا۔" وہ ریلنگ پہ سر ٹکا کے بے
اختیار رو پڑا تھا۔

✡ ✡ ✡

شادی کو دو تین ماہ گزر گئے۔ روٹین حسب معمول
رہی تھی۔ ثمین کے وہی سرد سپاٹ اور بے گانہ انداز
تھے۔ امی اور رفعت آپا مسلسل بڑبڑاتی اور جلتی بھنتی
رہتیں۔

"نہ کپڑے لتے اور میک اپ زیور کا ہوش ہوتا ہے
نہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے کا خیال۔ ایک گونگا
بت گھر میں لے آئے ہیں گویا۔"

نسیمہ بیٹی سے جلے دل کے پھپھولے
پھوڑتیں۔

"وہ تو لگتا ہے "پہلے" والے کے گھر اور دل سے ہی
نہیں نکلی ابھی تک۔ جانے عمر کی عقل کیسے خبط کی
ہوگی۔ اور خود اسے بھی تو دیکھو اتنا واویلا مچا کے بیاہ کے
لایا تھا اور اب یوں گم صم کہ سب بھلا بیٹھا ہے
جیسے آنے والی نے جادو منتر کے زور سے مٹی کا مادھو
بنا دیا ہو۔" رفعت آپا بھی سے سر جھٹک کر بولیں۔

"کیا خبر ایسا ہی ہو۔ اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔
مجھے تو عجیب پراسراری بھٹکی ہوئی روح لگتی ہے۔ جس
کے آتے ہی ہمارے گھر میں نحوست اور سناٹا چھا گیا
ہے۔" نسیمہ نے بیٹی کے خیال کی تائید کی۔

"میرا ہنستا بولتا کھلکھلاتا بچہ منہ سی کے بیٹھ گیا
ہے۔ کبھی اس کی آنکھیں اور چہرہ دیکھا ہے! اتنی اداسی
اور بے چینی بھری ہے ان میں۔" وہ اپنے بیٹے کے
لیے ازحد فکر مند تھیں۔

"جاب سے واپس آ کے سارا سارا دن اسٹڈی
روم میں بند رہتا ہے۔ پردے گرا کے اندھیرا کر کے
جانے کیا کھوجتا رہتا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں پڑی رہتی
ہے نہ میاں کے آنے کا ہوش نہ جانے کا پتہ۔ میں تو
سوچ رہی ہوں لڑکی کے بھائی بھابھی سے معاملہ صاف
کر لیا جائے کہ بھئی ہمارا کیا قصور ہے جو اپنی پاگل اور
نیم دیوانی بہن کو ہمارے سر تھوپ دیا ہے۔" نسیمہ
ناراضگی سے گویا تھیں۔

"نہیں امی۔ عمر کا آپ کو پتا ہے نا۔ پھر پنگا فساد
کھڑا کر دے گا۔"

رفعت آپا اپنے خود سر، سرکش اور سر پھرے بھائی
کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں۔

اتنے میں عمر آ گیا۔ سیاہ شلوار قمیص میں جالی والی
ٹوپی سر پہ رکھے چپ چپ سا مضطرب وملول چہرہ دیکھ
کر نسیمہ کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔

"میرا بچہ کیسے گھل کر رہ گیا ہے۔" وہ دکھ سے
بولیں۔ "بیٹے کیا اس لیے اتنی لڑ جھگڑ کے شادی کی
تھی؟ کیا مل گیا تمہیں اس کالی تقدیر والی سے شادی
کر کے!"

"امی پلیز۔" وہ حسب سابق ثمین کے خلاف
ایک لفظ سننے پر تیار نہیں تھا۔ "میں نے اپنی خوشی سے
شادی کی ہے اور میں بہت خوش ہوں۔ آپ کو فکر مند

ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں نہ فکر مند ہوں۔" وہ بھڑک گئیں۔ "تم سے خوش ہونا کہتے ہیں؟ اپنی حالت دیکھو۔ کیسی مجذوبوں جیسی ہو گئی ہے۔"

"خدارا مجھے اتنے اونچے اور عالی ظرف لوگوں کے ساتھ نہ ملائیں میں اپنی نظروں میں شرمسار ہو جاتا ہوں۔" اسے دلی تکلیف ہوئی۔ اس کا لہجہ تھکا تھکا اور الجھا ہوا تھا۔

نفیسہ کا دل تڑپ کر رہ گیا۔ پسند کی دلہن لانے کے بعد تو بیٹوں کے چہرے پر نکھار آتا ہے بہار رت کے سرخ و سفید پھول کھل جاتے ہیں۔ یہ کیسی خزاں لپٹی ہے جس نے میرے بچے کو مرجھا کے رکھ دیا ہے۔

"اس وقت کہاں جا رہے ہو باہر اتنی بارش ہو رہی ہے۔"

"مسجد جا رہا ہوں۔ چھتری ہے میرے پاس۔" وہ آج کل باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا۔ دل کے درد نے خدا کے در پہ ماتھا ٹیک کے اپنے گناہوں کی معافی چاہنے کا رستہ دکھایا تھا۔ دوستوں سے میل ملاپ کمپیوٹر پہ چیٹنگ بھانجے بھانجی کے ساتھ نت نئے تفریحی و سیاحتی پروگرام سب کچھ چھٹ گیا تھا۔ وہ دن بدن خاموش ہوتا جا رہا تھا۔ ٹیلی فون کو تو اس نے دوسرے دن ہی کمرے سے نکال کر نیچے لاؤنج میں رکھ دیا تھا۔ یوں جیسے وہ انتہائی مکروہ اور قابل نفرت چیز ہو۔

☆ ☆ ☆

رات آتی تھی تو اس پہ قیامتیں توڑتی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر بستر کے انتہائی سرے پر نیم دراز آسمانی کاٹن کی نائٹی میں ملبوس کتاب پڑھتی ثمین کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور دل مسوس کر رہ گیا۔

اس کا تابندہ حسن کیسے اس کے جذبات کے سمندر میں جوار بھاٹا ابھارتا تھا۔ وہ کیسے ترس کر رہ گیا تھا اس کے لیے۔ خوبصورت مومی ہاتھ اسے بلاتے اور وہ نظر چرا جاتا۔ سفید و گلابی دبیز مخملیں سراپا اسے دعوت نظارہ دیتا اور وہ مچلتے دل پہ بھاری سل رکھ کے جوشیلے لہریں مارتے جذبوں کو کچل دیتا۔

براؤن کشادہ چمکدار آنکھوں کی مڑی ہوئی ریشمی پلکوں کی جھالر پہ لب رکھنے کی تمنا سینے میں ٹکریں مارتی اور وہ خود کو سزا دیتے ہوئے ان تمناؤں کو سینے میں ہی دم توڑنے پر مجبور کر دیتا۔

آنکھیں کہتیں ان ساحرانہ نقوش کو دل میں جذب کر لیں اور وہ آنکھوں کو سختی سے بند کر لیتا۔

وہ اس کی دل موہ لینے والی کشش سے بچ کر آخر کہاں جاتا!

اس کی کمرے میں موجودگی کا احساس اس کے وجود کی تابندہ خوشبو اس کی رگوں میں زندگی دوڑا دیتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کس طرح مشکیں کس کے سنبھالتا تھا اس عذاب سے وہی آشنا تھا۔

کبھی تو صبح تیرے کنج لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سر کاکل سے مشکبار چلے

بالآخر وہ آہ بھر کے سینہ مسلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور پھر حسب معمول بالکنی میں پناہ لی۔ ملامت اور ندامت کی گھٹاؤں میں اس کا وجود بھیگ جاتا تھا۔ میں کیا کروں۔ اس نے گھومتا ہوا سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

"میرے خدا مجھے قرار دے
میرے خدا مجھے راستہ دے
مجھے سکون کے انمول اور سرشار لمحات سے آشنا کر کہ ایک مدت سے میں ان کے لیے ترس گیا ہوں۔
یہ میں نے کیا کر دیا۔" وہ بار بار خود پہ لعنت ملامت کے کوڑے برساتا تھا۔

پھر اچانک جیسے خیال کا کوئی ستارہ جاگا۔ ہاں یہی کرنا چاہیے۔

گویا یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی الٹی چھری سے اپنے آپ کو ذبح کروا لے مگر بہرحال وہ خود کو یہ سزا بھگتنے کے لیے تیار کر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

ٹھیک تین دن بعد اس نے ثمین سے بات کی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ وہ بالکنی میں بیٹھی ہوئی تھی جب عمر اس کے پاس آیا۔ ثمین سیاہ شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔

عمر نے ایک چور نگاہ اس پر ڈالی۔ دور افق کی سیاہی میں ڈوبتے آتشیں گولے کی مانند دکھائی دیتے سورج کی سرخی لال اور اودی کرنوں کا عکس اس کے گلابی چہرے پہ بکھرا ہوا تھا۔

"بڑا مشکل مرحلہ ہے عمر۔" عمر نے بھٹکتے مچلتے دل کو سختی سے سرزنش کر کے سابقہ فیصلے پر قائم رہنے کی تلقین کی تھی۔

"ثمین میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔" ثمین نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ نظروں کی خنکی اور اجنبیت نے عمر کے دل میں شگاف ڈال دیے۔

"میں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس کے لیے خود کو کڑی سزا دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں خود کو آپ کی ذات سے محروم کر دوں۔ آپ کو اس تکلیف دہ زندگی سے آزاد کر دوں۔ شاید میری زندگی سے نکل کر آپ کے دکھوں کا کچھ مداوا ہو جائے۔ میں اپنا گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے آپ کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ روزانہ اپنے مجرم کی شکل دیکھ کر دل پہ اترنے والی اذیت سے محفوظ رہ سکیں۔"

ثمین کے سر پر جیسے اچانک کوئی پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ پڑا۔ وہ پہلے تو خالی خالی نگاہوں سے پلکیں جھپک جھپک کے اسے دیکھتی رہی پھر جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اس کے اندر طوفان برپا کر دیا وہ آندھی کی طرح اس کی طرف آئی اور اس کا گریبان پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑتے ہوئے چلائی تھی۔

"طلاق...!! طلاق دو گے تم مجھے۔" وہ غیظ و غضب سے کانپ رہی تھی۔

"بڑا سہانا کھیل ہے ناں طلاق، کبھی دلواتے ہو اور کبھی دیتے ہو... میں پوچھتی ہوں تم ہوتے کون ہو میری تقدیر پہ بار بار سیاہی پھیرنے والے۔" وہ جنونی

ہو رہی تھی۔

بالآخر صدیوں کی برف پگھلی تھی' قرنوں کا سکوت ٹوٹا تھا۔

"طلاق وہ منحوس اور مکروہ گالی ہے جسے عورت جان کے دشمن بن جانے والے شوہر کے منہ سے بھی نہیں سننا چاہتی' جسے اپنی مرضی سے بھی مانگنے تو مل جانے پر بے ساختہ روتی ہے۔ اگر اسے برداشت کرنا عورت کے لیے اتنا آسان ہوتا تو وہ جنگلی وحشی مرد کی گالیاں' مارپیٹ اور بے رحمانہ تشدد کیوں سہتی۔ روز مر مر کر کیوں جیتی' طلاق لے کر سکھ چین کی زندگی کیوں نہ بسر کرتی۔"

وہ اس کا گریبان چھوڑ کر اندر کمرے میں آگئی اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ عمر بھی آہستہ قدموں سے اس کے پیچھے چلا آیا۔ اب وہ خاموشی سے لب کاٹ رہی تھی۔ عمر نے دیکھا اس کے گالوں پر اشک بہہ رہے تھے۔ پھر وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی "تم میری ازدواجی خوشیوں کے اور میرے بچے کے قاتل ہو۔ میں خود میں تمہیں معاف کرنے کا ظرف نہیں پا رہی لیکن اس کے باوجود میں تم سے طلاق نہیں چاہتی۔"

"تو پھر۔۔۔ پھر ثمین۔" وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتا ہوا اس کے زانو پہ ہاتھ رکھ کے بے چینی سے بولا۔

"بولو۔ پھر میں کیا کروں کہ تمہارے دل سے نفرت مٹا سکوں' یہ کس طرح ممکن ہو کہ میں تمہارے اتنے وسیع دل میں تھوڑی سی جگہ پا سکوں۔" وہ مضطربانہ گویا ہوا۔ پھر اسے کچھ سوجھ گیا۔

"میں نے ہی تمہارا گھر برباد کیا تھا نا میں ہی اب محسن کے دل سے تمام بدگمانی دور کروں گا۔ بس مجھے تھوڑا سا وقت دو۔ محسن کا دل صاف کر کے شاید میں کچھ خوشی حاصل کر سکوں میں گناہ گار ہوں تم دونوں کا۔" اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

اس کے تمام اعترافات سننے کے بعد محسن ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ثمین نے کتنا رو رو کر اپنی بے گناہی کا یقین دلایا تھا مگر اس وقت تو محسن کی آنکھوں پر شک کی پٹی بندھ گئی تھی۔ آج جب عمر نے انہیں "سچ" بتایا تھا تو وہ خود اپنے آپ سے بھی نظر نہیں ملا پا رہے تھے۔ تو ثمین سے کیا ملاتے۔ عمر اگر قصوروار تھا تو اس سے زیادہ وہ قصوروار تھے کہ بلا سوچے سمجھے ایک غلط فیصلہ کر کے اس پر قائم بھی رہے۔ اس غلطی کی سزا تو ان کو بھی مل ہی گئی تھی۔ تنہائی کی صورت میں۔ ثمین سے جدائی کی صورت میں۔۔۔ عمر نے تھکے تھکے مضمحل قدم واپسی کے لیے بڑھائے۔ پھر رک کر اس نے محسن کو دیکھا اور گویا ہوا۔

"میں ثمین کو بہت ساری محبت دوں گا۔ اور وہ غلطی پھر دوبارہ نہیں دہراؤں گا جو آپ نے کی۔ ابھی وہ میری دسترس میں ہو کر بھی میری دسترس میں نہیں لیکن میں انتظار کروں گا اس وقت کا جب اللہ تعالیٰ میرے گناہ معاف کر کے مجھے ثمین کی محبت اور اعتبار دے گا۔ وہ لمحے میرے اپنے ہوں گے صرف میرے۔

میں خدا سے دعا کروں گا کہ وہ مجھے اتنا جذب' اتنی شدتیں اتنا خالص پن عطا کرے کہ میں اپنے ضمیر میں چبھا ایک ایک کانٹا پلکوں سے چن کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے بعد ثمین سے نگاہیں ملا سکوں۔ میں اس دن کا انتظار کروں گا جب ہمارے سفر میں ہمارے دل کی خوشی شامل ہو گی۔" عمر نے کہہ کر قدم باہر رکھ دیے تھے۔

☼ ☼

شازیہ چوہدری

ان کی شادی کی چوتھی سالگرہ رمضان المبارک میں آئی تھی۔ سو انہوں نے کل شام افطار ڈنر پر احباب کو مدعو کر کے گویا سالگرہ کی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔

الارم کی بہت تیز اور چبھتی ہوئی آواز نے انہیں زیادہ دیر تک خواب خرگوش کے مزے لوٹنے کا موقع نہیں دیا۔

آنکھیں ملتے، جمائیاں لیتے، نائٹ گاؤن کی ڈوریاں کستے واصف علی سحری کے لیے اٹھ ہی گئے۔

بیڈ کے دوسرے سرے پر نگاہ دوڑائی۔

بستر خالی تھا۔ بسمہ یقیناً واش روم جاتے ہوئے الارم ان کے کان کے پاس رکھ گئی تھی۔

وہ بالوں میں انگلیاں چلاتے یونہی کھڑکی کا بھاری میرون ویلوٹ کا پردہ سرکا کر باہر جھانکنے لگے۔

باہر ابھی تاریکی کا راج تھا مگر یہاں سے جتنے گھر نظر آ رہے تھے ان سب کی لائٹیں آن تھیں۔

مسجد کے اسپیکر سے نعتیں سنائی دے رہی تھیں۔

دو تین مسجدوں کے اسپیکرز سے ——— نعتیہ کلام پڑھے جانے کی آوازیں آپس میں مدغم ہو رہی تھیں۔ فضا میں عجیب سا شور تھا۔ ایک ایسا شور جو شاید کانوں تک تو کم پہنچ رہا تھا۔ مگر احساس کی دنیا میں بڑی شدت سے رواں دواں تھا۔

اونگھتے لڑکے لڑکیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اٹھاتی ماؤں، بہنوں اور بھابھیوں کی آوازیں۔

گھر کے مردوں کی سحری کے لیے لوازمات طلب کرتی آوازیں۔

ننھے بچوں کی گرم بستروں میں ماں کے لمس کی عدم موجودگی کے سبب مچلنے والی چیخ و پکار۔

کچن میں برتنوں کی کھٹر پٹر اور ان سے نبرد آزما خواتین کی دوڑ بھاگ۔

جن پر روزہ واجب تھا، وہ لڑکے بالے اور بچیاں نہیں چھوڑ رہے تھے اور جو ابھی بچپنے میں تھے، وہ اصرار کرتے بیٹھے تھے کہ ہم روزہ ضرور رکھیں گے۔

مائیں بڑی مشکل سے انہیں "چڑی روزہ" رکھنے پر آمادہ کر پائی تھیں۔ (اس طرح کم عمر بچوں کو بہلا کر دن میں تین چار مرتبہ سحری اور "افطاری" کرا دی جاتی تھی۔)

مرغوں کی بانگیں اس شور میں مزید رس گھول رہی تھیں۔ بلیاں اور کتے بھی گاہے گاہے اپنی آواز سے اپنی بیداری کا احساس دلا رہے تھے۔

سیاہ براؤن پھولوں والے خوبصورت نائٹ گاؤن میں ملبوس واصف علی کے پر وقار اور وجیہہ چہرے پر بڑی بھرپور مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ اسی دم واش روم کا دروازہ کھلا۔

دن کے اجالوں سے زیادہ روشن اور پھول کی پنکھڑی سے زیادہ کھلا کھلا تر و تازہ سراپا برآمد ہوا۔ واصف کی نظروں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"اٹھ گئے آپ؟" ان کی پرجوش نظروں کی تمازت سے وہ پگھل سی گئی۔

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔"

وہ عین اس کے سامنے بہت قریب آ کھڑے ہوئے۔

"اب تو جی چاہ رہا ہے پھر سے کسی خواب میں کھو جائیں۔" ان کا لہجہ بلا کا گمبھیر تھا۔

وہ جھینپ سی گئی۔

واصف کا بھرپور شرارتی قہقہہ اس کے تعاقب میں لپکا تھا۔

"عورت روٹیاں پکاتے ہوئے اتنی آرٹسٹک اور خوبصورت کیوں لگتی ہے۔" وہ غسل سے فارغ ہو کر کچن میں آ گئے تھے اور اب کچن ہی کے ایک کونے میں سیٹ کی گئی دو کرسیوں والی گول میز سے ٹیک لگائے اس کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"کیونکہ آپ مردوں کو خبط ہوتا ہے کہ آزاد تتلی کو گھر میں لا کے ساری عمر اس سے روٹیاں پکوانے اور ناز برداریاں اٹھوانے کا کام لیتے رہیں۔ مردانہ انا کو تسکین جو پہنچتی ہے۔"

بسمہ نے ترچھی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے فقرہ چست کیا تھا۔ واصف سر کھجانے لگے۔
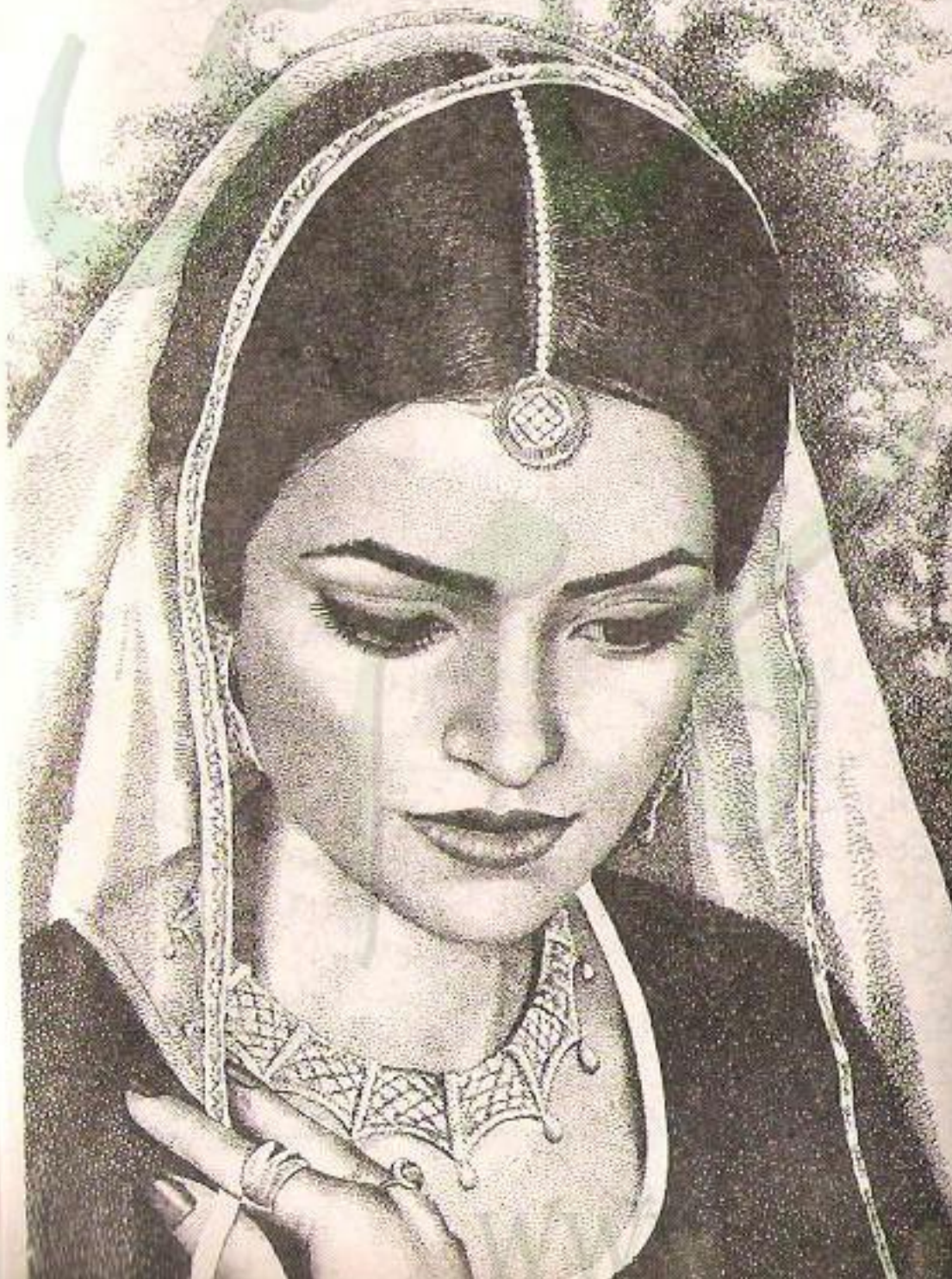
"دہی لیں گے آج؟" وہ چابک دستی سے چیزیں میز پر سیٹ کرنے لگی تھی۔

"نہیں یار! کل بھی طبیعت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ ہاں چائے کے کم از کم دو مگ ضرور ہونے چاہئیں۔" وہ سالن کی پلیٹ اپنی طرف سرکانے لگے۔

"آج میں نماز و تلاوت کے بعد نہیں سوؤں گی۔ لیکچر تیار کرنا ہے۔" وہ مقامی کالج میں پڑھاتی تھی۔

"میں تو ضرور سوؤں گا۔" انہوں نے کہا۔

اسی چھیڑ چھاڑ میں سحری کھائی گئی۔

نماز پڑھنے کے بعد واصف سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ وہ نو بجے تک آفس جاتے تھے۔ بسمہ کو ساڑھے سات بجے نکلنا ہوتا تھا' اس لیے وہ جلدی اٹھ جاتی تھی۔

لیکچر تیار کرنے کے لیے وہ ٹیرس پر آگئی اور لائٹ جلا دی۔ کام ختم کرکے اٹھی تو بلب کی زرد روشنی پھیکی پڑ چکی تھی اور ماحول پر روشن صبح طلوع ہو رہی تھی۔

"شادی کے چار "بے ثمر" سال گزر گئے اور اب پانچویں سال کا پہلا دن شروع ہو چکا ہے' مگر میری گود اور میرا آنگن ہنوز خالی ہے۔"

وہ ریلنگ کے پاس کھڑی ہو کر آزردگی میں گھر کر سوچنے لگی۔

"واصف بچوں کے کس قدر دیوانے ہیں۔ کیا میں نہیں جانتی مگر وہ مجھے بہلانے کو اس حقیقت سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ ہوٹل' پارک یا گزرگاہ پر کسی ننھے منے بچے کو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے جو پیاس جھلکتی ہے۔ بھلا میں اس سے بے خبر کیسے رہ سکتی ہوں۔

"ارے دیکھو بسمہ! کتنا پیارا خرگوش کے بچے کی طرح نرم اور خوبصورت سا بچہ ہے۔ ابھی چلنا سیکھ رہا ہے۔ تب ہی لڑکھڑا کر قدم اٹھا رہا ہے۔ اُفوہ... اس کے ماں باپ کو دیکھو' پارک میں آکر خود تو لڑنے میں گم ہو چکے ہیں اور بچہ چلتا ہوا کہاں جا پہنچا ہے۔ ٹھہرو' میں اسے ان تک پہنچا آؤں' کہیں کسی بردہ فروش کے ہاتھ نہ لگ جائے۔" وہ بے چین ہو جاتے اور پھر بچے کو اٹھا کر پیار کرنے کے بعد اسے اس کے والدین کے پاس چھوڑ آتے۔

بسمہ لب بستہ بیٹھی دیکھتی رہ جاتی تھی۔

"بسمہ! وہ دیکھو' ابھی ابھی ہوٹل میں جس کپل نے پچھلی ٹیبل سنبھالی ہے' ان کے ساتھ دو سال کا بڑا ہی حسین بے بی ہے۔ دیکھو' اس کی ناک اور آنکھیں کتنی پیاری ہیں اور حرکتیں ایسی دل موہ لینے والی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ جھپٹ کر سینے میں چھپا لوں۔"

وہ نثار ہو جانے والی نظروں سے یک ٹک بچے کو دیکھتے ہوئے گویا نگاہوں میں جذب کرنے لگتے تھے۔

"بس کریں' نظر نہ لگائیں اور یوں ندیدوں کی طرح مت گھوریں۔ دیکھیے' اس کی ماں کتنے جارحانہ انداز میں آپ کو دیکھ رہی ہے۔" وہ بظاہر ان سے خفگی جتاتی' مگر اندر ہی اندر اللہ سے شکوے شکایات کے دفتر کھل جاتے۔

"اللہ میاں جی! دے دے نا ہمیں بھی ایک کھلونا۔ ہماری کیاری میں بھی کوئی امید کی ننھی کلی کھلا دے۔"

وہ محسوس کر رہی تھی۔ جوں جوں شادی کی سالگراہیں آگے بڑھتی جا رہی تھیں' واصف اپنے سوشل سرکل اور دیگر ملنے ملانے والوں سے کٹتے جا رہے تھے۔ کبھی خاندان میں کوئی فنکشن ہوتا تو بھی آنے بہانے ٹالنے کی کوشش کرتے۔

"چھوڑو بسمہ! وہاں لوگوں میں بور ہونے سے تو بہتر ہے' ہم دونوں مل کر کہیں باہر گھوم آئیں۔"

وہ عین ٹائم پر کوئی نیا پروگرام بنا لیتے۔

"کہاں گھومیں گے۔ وہی ہوٹل' وہی پارک۔ شہر کے ہر راستے کی خاک تو چھان لی ہے ان چار سالوں میں۔ سچ پوچھیں تو میں تو اب اکتا سی گئی ہوں۔ اس سے تو بہتر ہے کسی اپنے کے پاس بیٹھ کر دو گھڑی دکھ سکھ کہہ لیا جائے۔ لوگوں میں اٹھیں بیٹھیں گے تو قنوطیت اور مایوسی کے دورے خود بخود دور ہو جائیں گے۔ دوسروں سے ملنا جلنا اور آتے جاتے رہنا مزاج میں خوش گوار تبدیلیاں لاتا ہے۔"

"چھوڑو' میرا اب کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔" وہ عجیب تلخ سے موڈ میں نظر آتے۔

"وہی مخصوص سوال' وہی ہمدردیاں' ترس۔" وہ ...اتے۔ بسمہ کو چپ لگ جاتی۔

"بھئی! نہیں ہوئی اولاد تو ہم کیا کریں۔ جب اللہ کا حکم "ہو گا" ہو جائے گی۔ رکاوٹ ہماری طرف سے نہیں "اللہ کی طرف سے ہے۔ ہم دونوں بالکل فٹ ہیں' پھر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہماری ذاتیات پر ہم سے زیادہ ہمدرد بن کے درپردہ ہماری محرومیوں سے کھلواڑ کرے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے خوش ہیں' بس یہ زمانہ۔"

"واصف۔" وہ رسان سے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "کسی کمی یا محرومی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم ...ت کا یا لوگوں کا سامنا کرنا چھوڑ دیں۔ بہت سے ...ئلہ لوگ اس دنیا میں بستے ہیں جو اپنی محرومیوں کے باوجود بہت خوش باش اور خوش اخلاقی سے دوسروں سے ملتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی کمی یا محرومی کا احساس دلائے تو اس سے کترانے کے بجائے اس پر پوری ...اعتماد اور سکون سے بات کرتے ہیں اور حقیقت پر مبنی جواب دیتے ہیں۔ ہمارے رویے ہی دوسروں کو ہمدردی اور ترس کا مظاہرہ کرنے کا موقع دیتے ہیں اور اگر موقع فراہم نہ کیا جائے تو کوئی کیسے اپنی زبان کے ...دکھا سکتا ہے۔ کیسے انگلی اٹھا سکتا ہے۔"

وہ کچھ سمجھتے' کچھ نہ سمجھتے اور کچھ سمجھ کر بھی نہ سمجھتے۔ یوں یہ بحث جوں کی توں لٹکی رہ جاتی تھی۔

✲ ✲ ✲

"اب آپ ہمیں یوں ستایا کریں گی۔" فون پر ... شکوہ کناں تھے۔

"ہمسائی ماسی نے بتایا ہے کہ جب وہ دوپہر کو گھر آئی تو بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑی ہوئی تھیں' تو اچھا ہوا جو اسے تمہاری ڈاکٹر کا گھر پتا تھا۔ وہ ...سے ڈاکٹر سائرہ کو بلا لائی۔ یہ بتاؤ' کیسی طبیعت ہے؟"

انہیں یہ رپورٹ ابھی ابھی فون پر ماسی سے موصول ہوئی تھی' جب ہی تو فوراً اس سے بات کی تھی۔

"یہ برکتے بھی بس یونہی ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں' یونہی کمزوری سے چکر آگیا تھا۔"

"سحری پر "ٹونگ" کے گزارا کرو گی تو چکر تو آئیں گے ہی۔" وہ خفا ہوئے۔

"اُفوہ... بھئی! جتنی بھوک ہوگی' اتنا ہی کھاؤں گی نا۔ بہرحال سائرہ نے شام کو کلینک پر آکے مکمل چیک اپ کرانے کو کہا ہے۔ ایک دو ٹیسٹ کا بھی کہا ہے' آپ ذرا جلدی آجائیے گا۔"

"اگر زیادہ سیریس بات ہے تو میں ابھی آجاتا ہوں۔ ابھی چلے چلتے ہیں۔" وہ گھبرا اٹھے۔

وہ اس کی معمولی سی تکلیف پر بھی بے چین ہو جایا کرتے تھے۔

"نہیں بھئی! آپ فی الحال اپنا آفس دیکھیں۔ شام کو آئیں گے تو چلے چلیں گے اور تسلی رکھیں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

شام کو آتے ہی انہوں نے اسے تیار ہونے کا حکم دیا تھا۔

ڈاکٹر سائرہ کی رہائش گاہ تو پچھلی گلی میں تھی' لیکن کلینک سید پور روڈ پر واقع تھا جو کہ خاصا رش والا علاقہ تھا۔ پون گھنٹے میں وہ ڈاکٹر سائرہ کے کلینک پہنچی۔ تفصیلی چیک اپ کے بعد جو رپورٹ سامنے آئی' اس نے ان دونوں کو پاگل سا کر ڈالا۔ پہلا ردِعمل شدید بے یقینی اور تحیر تھا۔

"کیا... میں ماں بننے والی ہوں۔ یعنی کہ...." وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"جی ہاں۔ بھائی صاحب! اچھی سی مٹھائی کھلائیے' اللہ نے پانچویں سال آپ کی سنی ہے۔"

سائرہ نے بے تکلفی سے واصف کو مخاطب کیا۔ محلے دار ہونے کے ناتے دونوں گھرانوں کی آپس میں اچھی سلام دعا تھی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" وہ بڑی دقتوں سے سکتے کی

کیفیت سے باہر نکل پائے تھے۔ ان کا لہجہ' ان کی آنکھیں' ان کا چہرہ ہر ہر چیز سے دیوانوں جیسی مسرت و سرشاری ٹپک رہی تھی۔

وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔

بسمہ کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھر گئے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو' بچے کے لیے آپ اس قدر بے قرار ہوں گے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آپ نے کبھی ظاہر ہی نہیں کیا۔"

"ظاہر کر کے تمہارا دل دکھا سکتا تھا میں؟۔" وہ وارفتگی سے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے بولے۔

"تو واصف علی صاحب کے ہاں بھی ننھا مہمان آئے گا۔ ہمارا بھی کوئی نام لیوا' کوئی وارث پیدا ہوگا۔ وہ ہماری شناخت' ہماری پہچان بن کر آئے گا۔" وہ بوجھل لہجے میں کہتے گئے۔

"بسمہ۔۔۔ بسمہ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا' میں اپنی خوشی کا اظہار کیسے کروں' کیسے ساری دنیا کو بتاؤں کہ میں آج بہت خوش ہوں۔" وہ بے قرار ہوئے۔

بسمہ بے ساختہ ہنستی چلی گئی تھی۔

"اچھا بات سنو' اب تم باقی کے روزے نہ رکھو۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔

"کیوں' کیوں؟۔" وہ سخت اچنبھے کے عالم میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہاری طبیعت جو ٹھیک نہیں ہے۔ روزہ رکھنے سے کمزوری ہوگی جو تمہاری اور بچے دونوں کی صحت پر اثر انداز ہوگی۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں روزہ رکھنے کے لیے فی الحال بالکل فٹ ہوں اور مجھے کمزوری بھی محسوس نہیں ہوگی۔ ابھی تو ابتدائی مراحل ہیں۔ یوں بھی صرف چھ روزے ہی تو رہ گئے ہیں۔" وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔

"میں نے سوچ لیا ہے اس بار عید پر ایک یادگار عید ملن پارٹی ہوگی گھر پر' اس خوشی اور امید کی کرن کے نام جسے ابھی دیکھا نہیں ہے۔"

وہ ان کے پاگل پن پر حیران ہو ہو کر ہنستی رہی۔

"تمہیں اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے' بہت زیادہ۔ سن رہی ہو ناں۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی اونچی کرتے ہوئے تاکیداً کہا تھا۔ وہ جواب میں صرف ہنس دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ تمہارے میاں کیا انوکھے باپ بننے چلے ہیں۔ ارے انہیں کہو کچھ ہوش کی دوا کریں۔ کیوں حواس گم کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ کچھ نہیں ہوا تمہیں۔ یہ سب ہوتا ہے اس پیریڈ میں۔ پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔"

ڈاکٹر سائرہ نے اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ بے چینی سے ٹہلتے پریشان حال واصف کو دیکھ کر اسے غصے کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آنے لگی تھی۔

"بھائی صاحب تو باؤلے ہی ہو گئے ہیں سچ مچ۔"

"ارے' ارے۔ اب تم میرے میاں کی شان میں گستاخی کر رہی ہو۔" بسمہ نے شوخی و خفگی کا مشترکہ مظاہرہ کیا۔ جیسے ہی سائرہ باہر نکلی' واصف لپک کر اس کے سامنے آ گئے۔

"ڈاکٹر صاحبہ! بسمہ ٹھیک تو ہے نا۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔"

"نہیں۔" سائرہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ "گڑبڑ تو نہیں ہے۔"

"گڑبڑ صرف آپ کے دماغ میں ہے' اس کا علاج کروایئے گا۔" کہہ کر وہ رکی نہیں بلکہ فوراً آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ جیسے ہی باہر نکلی۔ واصف جوس کا گلاس ہاتھ میں لیے بے قراری سے اندر داخل ہوئے۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" ان کی بے تابیوں پر وہ کھل کر مسکرا دی۔

"لیکن آپ کی خیریت واقعی مشکوک نظر آ رہی ہے۔ ڈاکٹر سائرہ خاصی ناراض ہو کر گئی ہے یہاں سے۔"

"ارے گائنا کولوجسٹ کو دل سے اٹھنے والی ان گہری مسرتوں سے کیا سروکار۔ وہ تو دن میں کئی بار نوزائیدہ بچے کو ہاتھوں میں لینے کا تجربہ کرتی ہوگی۔ ان سے کیا پوچھتی ہو' ہم سے پوچھو۔ دن میں بے شمار دفعہ ننھے وجود کو بانہوں میں لے کے سینے سے لگانے کا تصور کرتے ہیں۔" وہ دم بخود بیٹھی ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

ان کی آنکھوں کی خواب پرور چمک' ان کے چہرے کے ایک ایک عضو سے جھلکتا اشتیاق اور انتظار' ان کے لہجے سے ٹپکتی دیوانگی۔

"مجھے تو یہ خوف لاحق ہونے لگا ہے کہ آپ صاحب بہادر کے آتے ہی مجھے بھول جائیں گے۔ سارے حصے کی محبتیں بھی اس کی نذر کر دیں گے۔ مجھے ابھی سے آنے والے سے حسد محسوس ہونے لگا ہے۔" اس کا لہجہ شوخ ہو گیا۔

"ارے نہیں۔" "تم تو پھر تم ہو' تمہاری جگہ بھلا کون لے سکتا ہے۔" ان کے انداز میں وارفتگی تھی۔

"بات سنیں۔" وہ کسی سوچ میں گم ہو کر ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ایک ماہ رہ گیا ہے اس کے آنے میں۔ اگر اس دوران کچھ ایسا ہو گیا کہ خدانخواستہ ہم دونوں کی جان پر بن گئی اور ڈاکٹرز نے کسی ایک کو بچانے کے لیے کہا تو آپ کسے بچوائیں گے۔"

"نان سینس۔ کس قدر احمقانہ باتیں کر رہی ہو۔" وہ جھلا کر کھڑے ہو گئے۔ "بچہ تم سے بڑھ کر تو نہیں ہے۔ تم ہو تو سب کچھ ہے۔"

"اچھا ناراض تو نہ ہوں۔ یونہی پوچھ لیا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ان کا بازو تھام کر روک لیا تھا۔ اور اس کے لمس سے وہ ہمیشہ کی طرح پگھل کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

اس کی ڈلیوری ڈیٹ سے ایک ہفتہ پہلے ہی انہوں نے آفس سے چھٹی لے لی تھی۔

"کیا پتا کس وقت جانا پڑ جائے۔ مجھے ہر لمحہ تمہارے پاس رہنا چاہیے۔ کوئی بڑی بوڑھی تو ہے نہیں جسے مستقل تمہارے پاس چھوڑا جا سکے۔"

وہ ان دنوں بہت فکرمند رہتے تھے۔ وہ ان کی بے اختیاریاں اور بے چینیاں دیکھ دیکھ کر خود پر ناز کرتی تھی۔

وہ یادگار لمحہ بھی آ ہی گیا۔

صبح دس بجے اسے ایڈمٹ کیا گیا تھا اور رات نو بجے خوشخبری سننے کو ملی۔ انہوں نے یہ سارا وقت کاریڈور میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے گزارا تھا۔ ایک لمحے کو بھی ویٹنگ روم کی کرسی سے پشت نہیں ٹکائی تھی۔ بار بار اللہ سے دعاگو ہوتے۔

"بس تو میری بسمہ کو زندگی دے دے' مجھے تجھ سے اور کچھ نہیں چاہیے۔" جوں جوں دیر ہو رہی تھی' ان کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ نرس کی کھلکھلاتی آواز انہیں ہوش و حواس کی دنیا میں واپس لے آئی تھی۔

"مبارک ہو' اللہ نے آپ کو بیٹا دیا ہے۔ آپ کی مسز بھی خیریت سے ہیں۔ ہم انہیں وارڈ میں شفٹ کر رہے ہیں' آدھے گھنٹے بعد آپ ان سے مل سکتے ہیں۔"

"اچھا۔" مسرت سے ان کا چہرہ گل و گلزار ہو گیا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔" ان کا جی چاہ رہا تھا' اس عطیہ خداوندی پر تاعمر سر سجدے سے نہ اٹھائیں۔ شکر گزاری کے آنسو ان کے گال بھگوتے چلے گئے تھے۔

اور جب انہوں نے اس ننھے وجود کو دیکھا تو بے اختیار سے ہو گئے۔

"یہ... یہ تو بہت پیارا ہے بسمہ! بالکل چاند کا ٹکڑا ہے۔"

وہ بچے کو بے اختیار گود میں بھر کے بسمہ کے بیڈ کے پاس لے آئے۔

"ہاں' ماشاء اللہ۔" وہ سرشاری کے عالم میں تکیے پر سر رکھے چمکتی آنکھوں سے باپ بیٹے کی پہلی پہلی ملاقات کا منظر دیکھ رہی تھی۔

"میرا بیٹا، میری جان۔" وہ بار بار اس کے روئی کے گالوں جیسے گال چوم رہے تھے۔

"اور اس کی اماں جان کو بھول رہے ہیں واصف صاحب۔" اس نے شرارت سے اپنی طرف انگلی اٹھا کے کہا تھا۔

"اس کو کیسے بھول سکتا ہوں۔" وہ آہستگی و بے خودی کے عالم میں اس پر جھک گئے۔ "مگر یہ بھی تو اسی کا حصہ ہے ناں۔"

☼ ☼ ☼

"اچھا سنو، تم بچے کو ہرگز مت نہلانا۔ میں آفس سے واپس آکر خود نہلاؤں گا، کہیں تم گرا نہ دو۔" انہوں نے اچانک یاد آجانے پر فون کرکے تاکید کی تھی۔

"اُفوہ، حد کرتے ہیں آپ بھی۔ بچے کو مائیں ہی نہلاتی ہیں غالباً۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"نہیں۔" ان کا لہجہ قطعی تھا۔ "تم سے نہیں سنبھلے گا۔ اتنا چھوٹا سا تو ہے۔ ہاتھ سے پھسل جانے کا خطرہ ہے۔ بس تم ابھی مت نہلانا۔ کم از کم میں پاس ضرور بیٹھوں گا اگر تم سے چوک ہوجائے تو۔"

"مائی گاڈ۔ ایسا عاشق زار اور دیوانہ باپ نہ دیکھا نہ سنا۔" وہ جھنجلاہٹ کی انتہا پر ہنس پڑی تھی مگر وہ سنجیدہ تھے۔

"بی بی! آجائیں۔ آپ کی مالش کرکے مجھے دوسری جگہ بھی جانا ہے۔"

دائی اماں نے آواز لگائی تو وہ جلدی سے انہیں خدا حافظ کرکے تیل کی بوتل اٹھا کر لاؤنج میں آگئی تھی، جہاں دائی اماں کارپٹ پر بیٹھی اس کی منتظر تھی۔ وہ کسی پاس کے گاؤں سے آئی تھی۔

"سوری اماں! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ اصل میں عاطف کے پاپا کا فون آگیا تھا۔" اس نے شائستگی سے کارپٹ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں، خیر سے منے سے بہت پیار کرتے ہیں آپ کے میاں۔ اللہ نے پانچ سال بعد یہ نعمت عطا کی ہے۔ بس جی! مردوں کا دل پہلے بیوی کے لیے اور بعد میں اولاد کے لیے ہی تڑپتا ہے۔ اولاد چیز ہی ایسی ہے۔"

پھر وہ یونہی باتوں باتوں میں اپنے گاؤں کا کوئی قصہ سنانے لگیں۔

"ایک عورت کے چھ سال بعد بچہ ہوا تھا۔ بڑا لاڈلا اور سرچڑھا تھا۔ چار سال کا تھا۔ ایک دن ماں کو بہت ہی ستا رہا تھا۔ شرارتیں کرنے سے باز ہی نہ آ رہا تھا۔ ماں نے تنگ آکر اسے مرغیوں والے جالی کے بڑے سے خالی ڈربے میں بند کردیا۔ ارادہ تھا کہ کچن کے کاموں سے فارغ ہوکر نکالوں گی۔ خود وہ باورچی خانے کے لیے بنائی ہوئی جگہ پر چلی گئی۔ بچہ نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ پہلے تو ماں کو آوازیں دیتا رہا کہ مجھے باہر نکالو پھر اچانک شور مچانے لگا کہ ڈربے میں سانپ ہے۔ ماں نادان، سمجھی کہ یونہی ستا رہا ہے، جھوٹ موٹ۔ اس نے توجہ نہ دی ان پکاروں پر، ہانڈی کا مسالا بھون کے سبزی ڈال کے اٹھی تاکہ بچے کو باہر نکالے، کیا دیکھتی ہے کہ بچہ نہایت خاموشی سے ایک طرف سکڑا پڑا ہے اور ڈربے میں سچ مچ سانپ ہے۔ اس کی جان ہی نکل گئی۔ شور مچایا، لوگ آئے انہوں نے دروازہ کھولا تو سانپ باہر آگیا۔ نشانہ لے کر اسے کرویا پھر بچے کو دیکھا تو وہ مرچکا تھا۔ ماں تو وہیں کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ باپ کو پتا چلا، بدحواس ہوکر کھیتوں میں بیل کھلے چھوڑ کر گھر آیا۔ بیٹے کی لاش دیکھ کر ایسا بے قابو ہوا کہ ہاتھ میں پکڑی کلہاڑی سے سیدھا بیوی کے سر پر وار کیا۔ بیوی وہیں کٹ کے گر پڑی۔ ساتھ والے گاؤں سے بیوی کے بھائی کو خبر ہوئی تو وہ پستول لے کر آگیا اور اپنے بہنوئی کو قتل کردیا۔ گاؤں والے ہکا بکا رہ گئے۔ تین لاشیں انسانوں کی اور چوتھی سانپ کی۔ استغفراللہ۔"

دائی اماں نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

"کیسا ہولناک واقعہ سنایا ہے اماں آپ نے!" اس نے بے اختیار جھرجھری سی لی۔ "مجھے تو سچ مچ ڈر لگا ہے۔ ایسا غیر انسانی سلوک کون کرسکتا ہے۔ اول ماں نے ظلم کیا کہ بچے کو ڈربے میں گھسا دیا۔ دوسرا خاوند بلا کا وحشی و جنگلی نکلا جس نے بیوی کے ٹکڑے کرڈالے۔ بھلا ماں جان بوجھ کر اپنے بچے کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہے۔" شام تک اس کے ذہن میں اس واقعے کا اثر رہا۔

واصف آئے تو ان سے بھی ڈسکس کیا تھا۔

"یہ جہالت بھی ہے اور حماقت بھی۔" انہوں نے تبصرہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بچے کو بخار ہو رہا ہے اور تیز فلو بھی۔ یہ سب تمہاری لاپروائی کا نتیجہ ہے۔" وہ عاطف کے ماتھے پر ہاتھ رکھے بڑے سخت انداز میں اس سے کہہ رہے تھے۔

"کمال کرتے ہیں آپ! میں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب چھوٹی موٹی موسمی بیماریاں تو ہر بشر پر اثرانداز ہوجاتی ہیں۔ اس میں فکر کی کون سی بات ہے۔"

اسے ان کی حد سے زیادہ تشویش پسند نہیں آئی تھی۔

"فکر کی بات کیوں نہیں ہے۔ بچے کی حالت دیکھو ذرا۔" ان کا لہجہ تیز ہوگیا۔

"اگر تم احتیاط کرتیں تو ایسا نہ ہوتا۔ بچے کو ٹھنڈ سے بچانا تمہارا کام تھا۔"

"اپنی طرف سے تو میں نے بہتیری احتیاط کی تھی۔ اب جو تکلیف بچے کی قسمت میں لکھی ہے، وہ تو بہرحال اٹھانی ہی ہے اسے۔"

وہ ان کی ناراضی پر کوفت محسوس کرنے لگی۔

"تو اس کا مطلب ہے بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے۔" وہ پلٹ کر غصے سے اسے گھورنے لگے۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ ان کے غصے سے خائف ہوگئی۔

وہ مزید بات کیے بنا تیوریاں چڑھائے کمرے سے نکل گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیوں بھئی منے کی اماں! کیا حال چال ہیں تمہارے اور تمہارے مجنوں میاں کے۔ اب تو خوب چہکاریں ہوں گی گھر میں۔"

ڈاکٹر سائرہ نے کافی دنوں بعد اس کی طرف چکر لگایا تھا۔

"بس ٹھیک ہی ہیں سب۔" بسمہ اس کی توقع کے خلاف خاصی الجھی ہوئی اور مرجھائی سی دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ لہجہ اتنا خالی خالی اور بیزار کیوں ہے؟۔" سائرہ کھٹکی۔

"کیا ماں بن کر خوش نہیں ہو؟۔"

"کیوں نہیں ہوں، بہت خوش ہوں یہ منا سا کھلونا پاکر مگر یار! اس کے ابا جی نے میری جان عذاب میں ڈالی ہوئی ہے۔ پتا نہیں واصف کو کیا ہوگیا ہے۔ مجھ پر توجہ کی ایک نظر بھی نہیں ڈالتے۔ ان کا سب کچھ اب عاطف ہی ہے۔ آتے ہی اس سے چپک جائیں گے۔ گھنٹوں اس سے کھیل کے جی نہیں بھرتا۔"

"اوہو، اپنے ہی بیٹے سے جیلس ہوگئیں۔" سائرہ نے قہقہے میں بات اڑا دی۔

"یہ بات نہیں ہے، لیکن سائرہ! ہر چیز اپنی جگہ پر اپنے مدار میں ہی رہے تو ٹھیک ہے۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ "ٹھیک ہے ساری دنیا کے باپ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ماں سے بڑھ کر کوئی شخص حتیٰ کہ سگا باپ بھی بچے کی وہ دیکھ بھال اور نگہداشت نہیں کرسکتا جو کہ ماں کرتی ہے۔ اگر بچے کو کوئی تکلیف ہے تو اس کا ادراک اور احساس سب سے پہلے ماں کو ہی ہوتا ہے۔ واصف حد درجے جذباتی ہوتے جارہے ہیں۔ ذرا سا بچے کو کچھ ہوجائے یا رو پڑے تو وہ تھانیداروں کی طرح مجھ سے تفتیش کرنے اور فردِ جرم عائد کرنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مجھے ان کا یہ رویہ بہت انسلٹنگ لگتا ہے۔"

"لگتا ہے واصف بھائی، عاطف کے معاملے میں بہت ٹچی ہیں۔ بہرحال، تم انہیں باتوں باتوں میں احساس دلاؤ کہ ان کا یہ رویّہ آگے چل کر بچے میں بہت

سے نفسیاتی مسائل پیدا کردے گا۔ بچہ رشتوں کی صحیح پہچان اور ان کے ساتھ مناسب سلوک کرنے کی تربیت حاصل نہیں کرے گا تو اس کے آئندہ زندگی کے رویے اور ان کا جذباتی اظہار غیر متوازن ہو جائے گا۔"

"میں کیونکر انہیں سمجھا سکتی ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ اب وہ میرا جواز یا جواب سننے کی بھی زحمت نہیں کرتے۔ بتیرا سمجھاؤں گی کہ بچہ گرے گا نہیں تو وہ اٹھنا اور سنبھل کر چلنا کیسے سیکھے گا۔ تو کہتے ہیں کہ چوٹ آئے ہی کیوں اور اگر لگی ہے تو یقیناً یہ ماں کی لاپروائی اور غفلت کا نتیجہ ہے۔ بقول ان کے تقدیر سے کچھ نہیں ہوتا احتیاط اہم چیز ہے۔"

وہ سر پکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج ان کی شادی کی ساتویں سالگرہ تھی۔ وہ بڑی ترنگ میں تیار ہو رہی تھی۔ سوا دو سال کا شوخ و شریر اور انتہائی چلبلا مزاج رکھنے والا عاطف ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھا ڈریسنگ پر رکھی میک اپ کی چیزیں ادھر ادھر کرنے اور ان کا جائزہ لینے میں مگن تھا۔

بسمہ نے چہرے پر فاؤنڈیشن لیکوئیڈ کو احتیاط سے لگا کر مساج کرتے ہوئے مطمئن نگاہوں سے عاطف کی طرف دیکھا۔

وہ سیاہ پھولدار شرٹ اور بلیک پینٹ میں بلا کا جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ ماں کی جوتیوں والی دراز کھول کر اونچی نیچی ہیل والی سینڈلیں اور چپلیں پہن پہن کے دیکھ رہا تھا۔ اب میک اپ کی شامت آگئی تھی۔

بسمہ نے ممتا سے چُور جذبات لیے جھک کر اس کے بالوں کو بکھیرا اور پھر گنگناتے ہوئے اپنی نیلی ستاروں بھری جارجٹ کی حسین ساڑھی کی فال درست کرنے لگی۔ اس کا گورا رنگ و روپ نیلی جھلملاتی ساڑھی میں چمک رہا تھا۔

بڑی مدت بعد وہ نہایت ترنگ کے عالم میں تیار ہو رہی تھی۔ از خود سجنے سنورنے کو جی چاہ رہا تھا۔

"افوہ عاطف! یہ تم ڈائننگ ٹیبل پر کیسے چڑھ گئے۔ گر جاؤ گے۔ کتنی بار کہا ہے کرسی یا میز پر نہ چڑھا کرو۔ تمہارے ڈیڈی نے دیکھ لیا تو پھر میری شامت بلائیں گے۔"

وہ اسے ڈائننگ ٹیبل سے نیچے اتار کر گویا خود سے ہمکلام تھی۔

"آہا! یہ میں کس پری وش، مہ جبیں کے گھر آگیا۔" واصف آفس سے آئے تو اسے دیکھتے ہی کھل اٹھے تھے۔

"اب آپ کو اس پری وش سے کیا مطلب۔ آپ کا دل تو صاحب عالم شہزادہ عالم' بادشاہ سلامت' عاطف صاحب پر فدا ہو گیا ہے۔ اب ہمیں پوچھنے کی فرصت کہاں۔"

اس نے اک ادائے ناز سے ترچھی نگاہ ان پر ڈالی تھی۔ وہ ہنس دیے۔

"تم پھول ہو وہ کلی ہے' پھول کی تو اپنی اہمیت ہوتی ہے اسے کلیوں سے حسد کرنا زیب نہیں دیتا۔" انہوں نے اس کے شانوں پر بازو رکھے۔

"باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" وہ سر جھٹک کر مسکرا دی۔

"اور کھانے بنانا آپ سے۔ یہ بتایئے آج کیا کیا کچھ بنایا ہے۔ اور یہ کہ پیک کر لیا ہے یا ابھی کرنا ہے۔"

"سب کچھ تیار ہے۔ آپ سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھیے اور کولر بھی۔ عاطف کے کپڑوں اور کھانے پینے کی چیزوں کا بیگ تیار ہے۔ ایک ایک جوڑا میں نے اپنا اور آپ کا رکھ لیا ہے۔ اب تیاری پکڑیے۔ ٹائم بہت کم ہے۔"

بسمہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی باہر آگئی۔

شادی کی ساتویں سالگرہ منانے کے لیے انہوں نے سوات جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ واصف ہر بار ایک انوکھے طریقے سے یہ یادگار دن سیلیبریٹ کرتے تھے۔

سفر شروع ہوا' واصف کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔

بسمہ ان کے ہمراہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اپنے اڑتے بال سنبھال رہی تھی۔ عاطف اس کے گھٹنوں سے ٹیک لگائے گاڑی کے فرش پر کھڑا تھا اور ڈیش بورڈ پہ ہاتھ رکھ کے ٹھوڑی ٹکائے ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

"اسے پکڑ کے رکھو بسمہ' کہیں باہر نہ نکل جائے۔" واصف کی ہدایات جاری تھیں۔

"باہر کہاں نکلے گا۔ دروازہ بند ہے۔"

"ٹھیک طرح سے بند کر کے لاک لگاؤ' اور شیشہ اتنا نیچے نہ کرو یہ بازو باہر نکال لے گا۔"

"میں دیکھ رہی ہوں اسے۔" اس کو ان کی تنبیہہ پر کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔

ڈھلائی راستے پر واصف نے اچانک گاڑی روک دی۔

"آؤ یہاں اتر کر کچھ تصویریں کھینچتے ہیں۔" وہ لوگ گاڑی سے باہر آگئے۔

عاطف کھلے راستے پر بھاگنا دوڑنا چاہتا تھا اسی لیے ماں سے ہاتھ چھڑا رہا تھا۔ بسمہ نے آہستگی سے چھوڑ دیا۔

"اچھا بھئی تیز نہیں بھاگنا۔ ممی ڈیڈی کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔" اس نے ساتھ ہی ہدایت بھی کی تھی۔

"کیا کرتی ہو۔ ہاتھ پکڑ کے رکھو' کہیں ٹھوکر کھا کے گر نہ جائے۔" واصف نے فوراً اعتراض کیا۔

"نہیں گرتا' بچہ ہے۔ بھاگ دوڑ کے خوش ہوتا ہے۔" بسمہ نے سفارش کی۔ عاطف ہاتھ چھڑاتے ہی گویا ڈگی چال چلتا اچھلنے کودنے اور بھاگنے لگا تھا۔

بھاگتے بھاگتے سڑک کے کنارے پڑے بڑے سے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا' ایک چیخ بلند ہوئی اور پھر بچہ ساکت ہو گیا۔

"عاطف کیا ہوا۔۔۔؟" واصف اور بسمہ کے دل کی دھڑکنیں منجمد ہو گئیں دونوں ایک ساتھ لپکے تھے۔

"عاطف' عاطف ہوش کرو۔" واصف نے اسے اٹھا کر گالوں پر ہاتھ تھپتھپائے' اسے جھنجھوڑا۔ اور پھر بے قراری اور تشویش کے عالم میں نبض ٹٹولنے لگے۔

"ہائے میرا بیٹا۔ میری جان۔۔۔" وہ پھولی سانسوں سے ان کے قریب آئی اور تیزی سے بے ہوش عاطف پر جھکی۔

دوسرے ہی لمحے واصف نے اسے بے دردی سے پرے دھکیلا اور کس کر ایک طمانچہ منہ پر دے مارا۔

"یہ سب تمہاری غفلت اور ضد کی بنا پر ہوا ہے۔ کہا بھی تھا بچے کو اکیلا نہ چھوڑو اگر میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں زندہ گاڑ دوں گا۔۔۔ سمجھیں۔۔۔!" وہ جنون کے عالم میں غرائے تھے۔

بسمہ سنسناتے ہوئے گال پر ہاتھ رکھے بھونچکا سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ ان کی آنکھیں لہو اگل رہی تھیں۔ بچے کی حالت دیکھ کر وہ آپے میں نہیں رہے تھے۔

"واصف! ام۔۔۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔" وہ روتے ہوئے دوبارہ بچے کے قریب آئی۔ عاطف ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔

"جان کر ایسا کیا ہے تم نے۔۔۔" وہ شدّت جذبات سے بے قابو ہو کر دھاڑے۔

"صرف اور صرف تمہاری وجہ سے میرا بچہ ان حالوں کو پہنچا ہے۔ ہٹو پرے' اب یہ دکھاوے کے لاڈ نہ جتاؤ۔" انہوں نے بری طرح اسے جھڑک کر ہٹا دیا اور بچے کو گاڑی میں لٹا دیا۔

پہلے قریبی کلینک لے گئے انہوں نے معذرت کر کے کسی بڑے اسپتال لے جانے کو کہا۔

ان ہی قدموں سے واپس اسلام آباد آئے۔ الشفاء میں ایڈمٹ کرایا۔

"سر کی چوٹ ہے اور کچھ ایسے زاویے سے لگی ہے کہ بچہ کومے میں چلا گیا ہے۔ آپ دعا کریں۔ اگلے چھتیس گھنٹوں میں بچے کا ہوش میں آجانا بہت ضروری ہے ورنہ۔۔۔۔"

"ہائے میرے اللہ۔۔۔" بسمہ چکرا کر وہیں بے ہوش ہو گئی۔

ہوش میں آئی تو وہی انتظار کی بے درد گھڑیاں اس کی منتظر تھیں۔ واصف دو راتوں سے مسلسل سراپا

انتظار اور سراپا دعا بنے کھڑے تھے۔

بسمہ کی طرف تو بھول کے بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتے بھی تو ایسے جیسے خون ہی پی جائیں گے۔

اس کے اپنے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ واصف تو گویا اسے پکا مجرم قرار دے چکے تھے۔

تین دن گزر گئے۔

بچے کو ہوش میں نہیں آنا تھا سو نہ آیا۔

"آئی ایم ساری....." چوتھے دن شام کو ڈاکٹروں نے سر جھکا کر مشیتِ ایزدی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔

ننھا عاطف اپنی زندگی کی باقی بہاریں دیکھے بغیر اس دنیا سے چلا گیا۔

"نہیں..... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا....." واصف کی جنونی چیخ و پکار نے ہسپتال کے در و دیوار لرزا دیے تھے۔ پھر وہ جنون کے عالم میں بسمہ کے پاس آئے اور اس کا گلا دبوچ لیا۔

"ڈائن، چڑیل، تم نے کھا لیا میرا بچہ۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ اس کا گلا دبانے لگے۔

"ارے ارے یہ کیا کرتے ہیں آپ.....؟" سائرہ اور اس کا میاں ندیم احمد فوراً آگے بڑھے تھے۔ بسمہ کے میکے والے بھی وہیں موجود تھے۔ سب نے مل ملا کر ادھ موئی بسمہ کو ان کے وحشیانہ چنگل سے آزاد کرایا تھا۔

"ایک تو اس بے چاری پر پہلے ہی قیامت ٹوٹ پڑی ہے اوپر سے آپ اسی کی جان کے درپے ہو گئے ہیں۔" سائرہ کے میاں انہیں سمجھا رہے تھے۔

"میں اسے جان سے مار دوں گا۔ اس نے جان بوجھ کر میرے بچے کو موت کے منہ میں پہنچایا۔ یہ اس سے جلتی تھی۔" وہ صدمے کی شدت سے پاگل ہو رہے تھے۔

"میں اسے طلاق....." سرخ بے خواب آنکھوں میں آنسوؤں کی شدت لیے وہ ایک دم انتہائی اقدام پر اتر آئے۔

"پلیز واصف بھائی! خدا کے لیے خود کو سنبھالیے۔" ندیم احمد نے دوسرے ہی لمحے اس کے پھڑپھڑاتے لبوں پر ہاتھ رکھ کر مزید کچھ بولنے سے روک دیا تھا۔ ورنہ وہ تینوں طلاقیں ابھی دے دیتے۔

بچے کی موت کے صدمے سے بے حال بسمہ تیورا کر فرش پر آ گری تھی۔

☼ ☼ ☼

صدمہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، آہستہ آہستہ اس کے زخم مندمل ہو ہی جاتے ہیں۔

"بیٹی خود کو سنبھالو۔ کیا گھل گھل کر اپنی جان دے دو گی؟"

"اس جان کو بچا کے کیا کروں گی میں۔ بچہ مر گیا۔ شوہر نے طلاق دے کے گھر سے نکال دیا۔ کیا رہا ہے میرے پاس....." وہ بے حد اجڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"خدا نہ کرے۔ طلاق کیوں ہونے لگی۔ تمہارے باپ نے ایک جید عالم سے رجوع کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے ایک طلاق کے بعد اگر خاوند رجوع کر لے تو طلاق نہیں ہوتی۔"

وہ جواب میں کافی دیر تک خاموش بیٹھی ماں کی صورت دیکھتی رہی۔

"کاغذوں پر طلاقوں کا کتنا حساب رکھا جاتا ہے۔" پھر وہ عجیب استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔ "وہ جو دلوں کو طلاق دی جاتی ہے اس کا حساب کتاب کون رکھے گا۔ ایک یا دو سے کیا فرق پڑتا ہے۔ طلاق کا مطلب ہے علیحدگی، ہمیشہ کی دوری اور ان کا دل مجھے خود سے علیحدہ کر چکا ہے۔ رشتوں کی کاغذی کارروائی سے ثبوت پکے ہو جاتے ہیں مگر رشتے تو بس دل کے ہی ہوتے ہیں جو جان سے پیارے ہوں وہ دل میں رکھے جاتے ہیں اور جو دشمن تصور کر لیے جائیں انہیں در سے جھڑک دیا جاتا ہے۔"

ماں کو بیٹی کی پاگلوں جیسی حالت پر خوف آنے لگا۔

"ایسی باتیں نہ کرو بیٹی! جو ہونا تھا ہو گیا۔ شاید اس معصوم کی موت یونہی لکھی تھی۔ تیری میری احتیاط یا پروا کیا کام آئے گی' جب وقت پورا ہو جائے۔ تمہارا اس میں کوئی دوش نہیں ہے۔ بس واصف میاں بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے اس لیے جذباتی ہو گئے۔ مجھے یقین ہے' کچھ عرصے میں انہیں خود ہی احساس ہو جائے گا۔"

"صدمہ صرف انہیں ہے؟ کیونکہ ان کا بیٹا فوت ہوا ہے۔ میرا کچھ نہیں لگتا کیا؟ میں نے اسے تکلیفوں کے پہاڑ سر کرکے پیدا نہیں کیا تھا؟ پالا پوسا نہیں تھا؟ اس کے لیے راتوں کی میٹھی نیندیں قربان نہیں کی تھیں۔ اس کی بیماری پہ اس کے ساتھ ساتھ میرا دل نہیں تڑپتا تھا؟ اس کی موت کا مجھے کوئی دکھ نہیں ہے؟ سب یہی کہتے ہیں ان سے بچے کی موت کا صدمہ برداشت نہیں ہو سکا۔ ارے تو کیا میرا پتھر کا کلیجہ ہے۔ میں ماں ہوں۔ میرا جگر بھی تو چھلنی ہوا ہے۔ ان کے گھاؤ سب کو نظر آتے ہیں' میرا چھید چھید وجود کسی کو نظر کیوں نہیں آتا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"نہیں امی! اب میں کمپرومائز نہیں کروں گی۔ میرا بچہ مجھ سے جدا ہو گیا اور میری ہی دنیا اندھیر کر دی گئی ہے۔ ماں' بچے کی موت کی ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہے۔ کون سی ماں جان بوجھ کر اپنے لخت جگر کو مار سکتی ہے؟؟"

"خدا کے لیے بسمہ! یوں مت روؤ' تمہارا بی پی پہلے بھی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا۔ اتنی ڈرپس لگی ہیں۔ یوں حال خراب کرو گی تو پھر بیمار پڑ جاؤ گی۔"

مگر وہ کیا کرتی۔ صدمات نے اسے دیوانہ کر ڈالا تھا۔

❁ ❁ ❁

"ساڑھے تین ماہ' ٹھیک ساڑھے تین ماہ ہو گئے ہیں تمہیں مجھ سے بچھڑے ہوئے۔" انہوں نے بے خیالی کے عالم میں عاطف کی روشن کھلکھلاتی ہوئی تصویر پر انگلیاں پھیریں۔

"اگر ابھی تم زندہ ہوتے تو تم ڈھائی سال اور کچھ ہفتوں کے ہو چکے ہوتے۔ پہلے سے کہیں زیادہ شرارتی' ذہین اور صحت مند......" انہوں نے حسرت سے آہ بھری۔

گھر پہ چھائے ہولناک سناٹے روزانہ آفس سے واپسی پر ان کا استقبال کرتے تھے۔

رمضان شروع ہو چکا تھا مگر گھر پہ موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ خاتون خانہ کی عدم موجودگی میں سحری و افطاری کس درجہ پھیکی محسوس ہوتی ہے وہ جان چکے تھے۔

وہ روزانہ باہر کسی ریسٹورنٹ پہ افطار ڈنر کرتے تھے۔ کبھی موڈ ہوتا تو پکوڑے' کھجوریں اور سموسے لے کر گھر آکر تنہا افطار کرتے تھے۔ ان کا جی اتنا بے چین اور وحشت زدہ تھا کہ ساری ساری رات جاگنے کے باوجود ان کو پرسکون نیند کی طلب محسوس نہیں ہوتی تھی۔

گیٹ پر بیل بجی تھی۔

"یہ سائرہ نے آپ کے لیے افطاری بھجوائی ہے۔" ندیم احمد نے سلام دعا کے بعد چھوٹی سی ٹرے آگے کر دی۔

"یہ آپ نے کیا تکلف کیا ندیم صاحب! پلیز اندر آجائیے۔ ابھی تو کافی ٹائم ہے افطاری میں۔"

وہ انہیں لے کر لاؤنج میں آگئے تھے۔

"اتنا سناٹا ہے آپ کے گھر میں؟ رمضان کے دنوں میں تو جھونپڑیوں میں بھی شام کو ہلچل اور ہنگامہ دیکھنے کو ملتا ہے۔"

ندیم احمد ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

وہ جز بز سے ہو گئے تاہم خاموش رہے۔

"واصف بھائی! آپ بھابھی کو کب لا رہے ہیں؟ میری مانیے تو عید سے پہلے پہلے منا کر لے آئیے۔"

وہ جواب میں ہونٹ کاٹتے ہوئے نظر چرا گئے تھے۔

"آپ کو محسوس نہ ہو تو میں ایک حدیث آپ کو سنانا چاہوں گا۔" کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد ندیم احمد نے مخاطب کیا۔

"جی......جی......" وہ چونکے تھے۔

"حضرت ابوطلحہ عرصہ دراز کے بعد تجارت سے وطن لوٹے تو ان کی آمد سے کچھ دیر پہلے ہی ان کا بچہ فوت ہوا تھا۔ ان کی بیوی ام سلیم نے خاوند کو آتے ہی اس تکلیف دہ خبر سے آگاہ نہیں کیا بلکہ خوش دلی سے استقبال کیا۔ پھر آرام و فراغت سے پوچھنے لگیں۔

"ابوطلحہ! بتاؤ کہ میں نے فلاں چیز ایک پڑوسن کو ادھار دی تھی اب جب لینے جاتی ہوں تو وہ رونے لگ جاتی ہے۔"

ابوطلحہ کہنے لگے۔ "عجیب احمق عورت ہے' ادھار لی گئی چیز تو ہر حال میں مالک کو واپس کرنی پڑتی ہے۔"

تب وہ بولیں۔ "ابوطلحہ! ہمارا بچہ بھی ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت تھا اور اس نے اپنی امانت واپس لے لی ہے۔"

ابوطلحہ نے صبر و شکر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"بے شک ہم سب اللہ کے لیے ہی ہیں' اور اسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔"

اتنا کہہ کر ندیم احمد خاموش ہو گئے۔

واصف علی بہت غور سے ان کو سن رہے تھے۔ وہ خاموش ہوئے تو واصف نے بے اختیار ان کی طرف دیکھا۔ ندیم احمد نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

"اس بچے کی اتنی ہی زندگی لکھی تھی۔ اللہ نے اپنی چیز آپ سے واپس لے لی ہے۔ وہ اسی کی تھی پھر آپ اس درجہ کم حوصلہ کیوں ہو گئے ہیں۔ موت کی وجہیں تو بس بہانا ہیں' جواز ہیں کہ فلاں ایکسیڈنٹ سے مر گیا' فلاں پانی میں ڈوب گیا' فلاں کو ہارٹ اٹیک یا کینسر ہو گیا۔ اصل میں یہ وہ دلیلیں ہیں جنہیں عقل کے پیمانے پر تول کر انسانی فطرت خود کو پرسکون کرتی ہے۔ صبر کرتی ہے ورنہ جتنی سانسیں قسمت میں لکھ دی گئی ہیں نہ انہیں پورا کرنے سے پہلے مر سکتے ہیں نہ بعد میں جی سکتے ہیں۔ آپ تو اچھے خاصے سمجھ دار انسان ہیں پھر یہ بچگانہ پن اور جنون کیوں......"

وہ خاموشی سے بیٹھے رہے' ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"پانچ سال بعد آپ کے آنگن میں پھول کھلا تھا۔ آپ نے اس کی جی بھر کے خوشی منائی لیکن وہ پھول اتنی ہی بہاریں لے کے آیا تھا۔"

ندیم احمد پراثر انداز میں سمجھا رہے تھے۔

"اپنی بیوی کے دل پر مرہم رکھیے۔ ان کے ٹوٹے ہوئے مان کی کرچیاں سمیٹ کر انہیں اپنی دائمی محبت و رفاقت کا احساس دلائیے۔ یہ رشتے یوں ہی گنوانے کے لیے نہیں ہوتے۔ ان کا صدمہ آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ نہ صرف بچہ گیا بلکہ شوہر کی محبت اور اعتبار بھی ہمراہ نہ رہا۔ راضی ہو جائیے کہ اس میں آپ کی نجات اور سکون ہے۔"

وہ کافی دیر تک ہمدردانہ انداز میں انہیں سمجھاتے رہے تھے۔

❁ ❁ ❁

"مبارک ہو' تم ماں بننے والی ہو۔ اللہ نے ایک چیز لے کر بہت جلدی دوسرا کھلونا تمہارا جی بہلانے کو بھیج رہا ہے۔ حیرت ہے تمہارا دھیان اس طرف پہلے کیوں نہیں گیا۔ اپنا چیک اپ تو کروایا ہوتا۔"

وہ کافی عرصے بعد سائرہ کی طرف آئی تھی۔ ایک شک سا تھا جس کی تصدیق کرنے آج وہ آئی تھی۔ لیکن خبر سن کر اس کے حواس گم ہو گئے۔

"میں ان نوازشوں کے قابل کہاں۔" وہ معاً سسکیوں سے رو پڑی۔

سائرہ اس کے قریب آکر نرمی سے اسے تھپکنے لگی۔

"مال اور اولاد اللہ کی نعمتیں ہوتی ہیں۔ وہ جب چاہے اپنے بندوں کی ان نعمتوں کے ذریعے آزمائش کر سکتا ہے۔ کبھی عطا کرکے اور کبھی واپس لے کر آزماتا ہے۔ بندے کو تولتا ہے۔ اس کے صبر و شکر اور راضی برضا ہونے کی صلاحیت کا امتحان لیتا ہے۔"

کس موڑ پر لٹی تھی اور کہاں پہنچ کے دوبارہ ملا

ہے۔" بسمہ نے آہ بھری۔ اسے یاد آرہا تھا عاطف کی دفعہ میں یہ خوشخبری ملتے ہی واصف کس قدر جذباتی ہوگئے تھے۔ گھر آکر کتنی شدت سے اس سے پیار کا اظہار کیا تھا۔

"ویسے حیرت کی بات ہے اتنا عرصہ تمہیں اپنی بدلتی کیفیت کا احساس کیونکر نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ننھا وجود تو عاطف کی زندگی میں ہی تمہارے اندر آگیا تھا۔" سائرہ نے اچنبھے کا اظہار کیا۔

"بس اتفاق ایسا ہوا کہ اس طرف دھیان نہیں گیا۔ طبیعت خراب ہوئی تو اسے کسی اور چیز پر محمول کرلیا۔ پھر عاطف کے جانے کے بعد تو کسی تبدیلی کا احساس ہی ختم ہوگیا۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"جو کچھ مجھ پر بیتی تم تو جانتی ہو۔ واصف نے جس طرح مجھے اپنی زندگی سے نکالا تمہارے سامنے ہے۔ کیا مرد کو صرف اولاد ہی چاہیے ہوتی ہے؟۔ اس کے نزدیک عورت صرف اولاد پیدا کرنے اور اس کی دیکھ بھال کے لیے بیاہی جاتی ہے؟ عجیب دنیا ہے سائرہ! عورت کا اپنا وجود کہاں ہے۔ پہلے اتنی چاہت دو' پھر جب وہ بچے کی ماں بن جائے تو اسے صرف اسی کی آبیاری کے لیے چھوڑ دو۔ یہ بھول جاؤ کہ اسے بھی توجہ' پیار اور عزت کی برابر ضرورت رہتی ہے۔ گھر اس 'کا' اولاد اس 'کی' اختیار اس 'کا' عورت کا پھر کیا ہے؟۔" وہ یاسیت سے گویا تھی۔

"بری بات' ایسا نہیں سوچتے۔ اس وقت تمہیں صرف اور صرف خوش رہنے کی ضرورت ہے۔ واصف بھائی کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہوجائے گا۔ وہ پلٹ آئیں گے۔"

"ایسے پلٹنے سے کیا حاصل۔ اب تو مانو اپنا جی بھی پلٹ گیا ہے۔" وہ آہستگی سے کہتی ہوئی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

❁ ❁ ❁

"آج انتیسواں روزہ ہے۔ دیکھو چاند نظر آتا ہے۔ یا کل کا بھی روزہ ہوگا۔" وہ افطاری کے لیے چیزیں بنا رہی تھی جب امی کچن میں داخل ہوئیں۔

"تمہارے اباجی کہہ رہے تھے اگر بسمہ کے تو وہ واصف کو گھر بلالیں۔ عید کا موقع ہے۔ خوشی کا سماں ہے۔ کیا ہی اچھا ہو جو یہ۔ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نپٹ جائے اور بیٹی اپنے گھر میں آباد ہوجائے۔"

"کیوں امی! یہاں بیٹھی کیا بہت بری لگتی ہوں؟۔" وہ تلخی سے پوچھنے لگی۔

"خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ تم جم جم آؤ' رہو۔ کھاؤ پیو مگر بیٹی! ایک بیاہتا بیٹی کے سے رتبے اور وقار کے ساتھ۔"

"اتنی بھاری پڑگئی ہوں میں اب۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے آف موڈ کے ساتھ چیزیں میز پر رکھنے لگی۔

افطاری کے بعد نماز پڑھ کے وہ چھت پر آگئی۔ اردگرد کی ساری چھتوں پہ خوب رونق تھی۔ کئی شوقین مزاج حضرات دوربینوں سے اپنا شوق پورا کررہے تھے۔ وہ بے دلی سے آسمان پہ نظریں جمائے جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

"کیا ایک بار بھی میں ان کو یاد نہیں آئی ہوں گی۔" لاشعوری طور پر وہ ان کی منتظر تھی۔

چاند نظر آگیا۔ کل عید تھی۔

انہیں نہیں آنا تھا نہ آئے۔

"آؤ تمہارے مہندی لگوالاؤں بازار سے۔ چوڑیاں اور جوتے وغیرہ بھی پسند کرلو۔"

امی نے بہت کہا تھا مگر وہ نہیں مانی۔

کس کے لیے ہار سنگھار کرتی' کسے دکھاتی۔

تکیوں میں منہ دے کے وہ اتنا روئی کہ جل تھل ہوگیا تھا۔

صبح شیر خرمہ بننے کی خوشبو نتھنوں میں گھسی تو اس نے کسلمندی سے کمبل پرے سرکایا۔

آہستگی سے اٹھتے ہوئے بال سمیٹے اور ملگجے کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے برابر کرتے ہوئے واش روم چلی گئی۔ اسی حلیے میں ناشتے کی ٹیبل پر آگئی۔

"لاحول ولاقوۃ' ارے عید کے کپڑے تو پہن لے

ہوتے۔"

امی نے ناگواری سے اس کا حلیہ ملاحظہ کیا تھا۔

"اونہہ۔" وہ سر جھٹک کر سنی ان سنی کرگئی تھی۔

دوپہر تک اس کا یہی حلیہ رہا۔ امی گاہے گاہے ٹوکتی رہیں۔

"اپنی نہیں تو ہماری عزت کا ہی کچھ خیال کرلو۔ آنے جانے' ملنے ملانے والے لوگ تمہارا یہ بدحال سراپا دیکھ کر کیا کیا نہ باتیں بنائیں گے۔"

"وہ پہلے کون سا کم باتیں بناتے ہیں۔" اس نے ان کی فکرمندی کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔

امی بڑبڑانے لگیں وہ تنگ آکر اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔

"دل پتا نہیں کیوں اتنا گھبرا رہا ہے۔" کھڑکی میں کھڑی وہ خود سے الجھ رہی تھی۔

اچانک کھٹکے پر پیچھے مڑی۔

اور پھر ساکت رہ گئی۔

بلیک ٹوپیس میں اپنے بلند پر شکوہ سراپے سمیت وہ بہت آہستگی سے عین اس کے پیچھے آن کھڑے ہوئے تھے۔

"عید نہیں ملوگی۔" ان کی دھیمی سرگوشی اس کے کانوں میں گونجی۔ وہ رخ موڑے' سانس روکے لب بستہ کھڑی رہی۔

"بات نہیں کروگی؟" وہی گمبھیر سرگوشیانہ لہجہ میں دوبارہ استفسار کرنے لگا۔

وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

"کیا رہا ہے اب ہمارے بیچ۔" اس کا انداز بہت اکھڑا ہوا تھا۔

"بہت کچھ۔" انہوں نے لمبا سانس کھینچا اور آہستگی سے اس کے شانے تھام کے اپنی طرف رخ پھیرا۔

"بلاشبہ میں تمہارا مجرم ہوں۔" انہوں نے اس کے زرد گالوں پر بہتے آنسوؤں کو ہتھیلی سے صاف کیا۔

"وہ اللہ کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔ میں جانے کیوں اتنا جذباتی ہوگیا۔ بچانے والا بھی وہی ہے اور مارنے والا بھی وہی ہے۔ جب وہی مختار کل ہے تو پھر بحث کیا' ضد کیا۔ جو اس نے مناسب سمجھا سو کیا۔ اور یوں بھی میرا خیال ہے کہ عاطف اسی لیے واپس گیا ہے کہ اس نے اپنے دوسرے بھائی یا بہن کو ہمارے گھر بھیجنا تھا۔"

ان کے لہجے کی تازگی نے لامحالہ بسمہ کو ناراضی بھلا کر ان کی طرف دیکھنے اور پوچھنے پر مجبور کردیا۔

"اوہ۔۔۔ تو گویا اس نئی خبر نے آپ کو میری طرف پلٹنے پر مجبور کیا ہے۔" وہ نہایت طنز سے مخاطب ہوئی۔

"خدا کی قسم نہیں۔" وہ بے اختیار ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے۔ "یہ خبر تو مجھے کل شام ڈاکٹر سائرہ نے دی تھی کہ تم تھوڑی دیر پہلے دوبارہ چیک اپ کے لیے کلینک آئی تھیں اور اس نے الٹرا ساؤنڈ رپورٹ کے بعد بیٹا اور بیٹی کی نوید سنائی ہے۔ جب کہ میں تو رمضان کے آغاز سے تمہارے پاس آنے کے لیے ہمتیں اور حوصلے جوڑتا رہا ہوں۔ میں اصل میں تم سے شرمندہ تھا۔ بے حد پشیمان تھا۔ اسی لیے دیر ہوئی۔ کیا تم مجھے معاف کردوگی؟"

"اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔" اس نے فیصلے پر پہنچ کر خود کو از حد پرسکون اور ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا کہ پھیلتے اندھیروں میں روشنی بھی تو ضروری تھی۔

ایک نرم مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔

"تھینک یو۔" واصف نے گرمجوشی سے اس کے ہاتھ تھام کر دبا لیے۔

☼

شہازیہ چوہدری

تم ایسی عشق روح مت کرنا

راجہ بھیا کی آئے گی بارات
رنگیلی ہو گی رات
مگن میں ناچوں گی
مگن میں ناچوں گی

"یہ گرم پانی والا والو کس نے بند کیا ہے۔ امی۔ امی۔ او نی اللہ ارے کوئی ہے۔ ارے او مہوش۔ بند ہیا کہیں کی۔ بند کرو یہ ناچ گانے۔ اللہ خدایا۔ اُف۔"

مہوش بی نہایت انہماک اور محنت سے پورے سُر تال کے ساتھ جذب کے عالم میں گا رہی تھیں جب باتھ روم سے نیرش کی چیخ و پکار نے ان کا ننھا سا دل سہما ڈالا۔

"ہائے لگتا ہے مجھے نمونیہ۔ ارے او میری ماں۔ پیاری ماں کہاں ہو تم۔"

"کیا بچوں کی طرح شور کر رہی ہو۔" امی کچن سے نکلتے ہوئے نیرش کے شور شرابے کے جواب میں ڈپٹ کر کوفت کے عالم میں بولی تھیں۔

"کس نے بند کیا ہے والو۔" سحرش کا کمرے میں بیٹھ کر ٹیسٹ کی تیاری کرنے کا خواب ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ جھنجلا کر ادھر آتے ہوئے مہوش سے استفسار کرنے لگی۔

"ہائے اے اللہ۔ کوئی نیک روح بھیج یہاں جو آ کر مجھ دکھیاری، غم کی ماری، بے چاری مصیبت زدہ دوشیزہ پر ترس کھاتے ہوئے موٹر چلا دے۔"

باتھ روم سے نہایت دردناک اور پُر سوز انداز میں نیرش کی آہ و زاری سنائی دے رہی تھی۔

"موٹر تو ابھی دس منٹ ہوئے ہیں بند کی ہے۔ دلو

بھی کھلا ہوا ہے۔ ذرا صبر کرو ناں گرم پانی آتے آتے ہی آئے گا۔"

سحرش چیک کرنے کے بعد باتھ روم کے باہر سے اس کی تشفی کرنے لگی۔

"نوشابہ تو خیر ہوگا ہی ہوگا۔ امی آپ احتیاطاً بخار اور فلو کے تدارک کے انتظامات بھی کر رکھیے گا کہیں عین وقت پر مصیبت نہ پڑے۔" باتھ روم سے اطلاع نشر ہو رہی تھی۔

"فکر نہ کریں۔ آپ کہیں تو۔۔۔ لٹھا چھینے والے درزی اور گورکن سے بھی بات پکی کرا آتا ہوں۔"
جمال نے لاؤنج سے ہانک لگائی تھی نہایت سنجیدگی کے عالم میں۔

جواب میں باتھ روم سے جملوں کے نہ ختم ہونے والے اسکڈ میزائل برسنے لگے۔

"اس بھرے جہان میں کسی کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے جس کو دیکھو ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ اماں باوا ہیں تو انہوں نے تین سال پہلے میڈیکل کالج میں پھانسی کے لیے بھیج دیا۔ میری گردن فٹ کر کے۔ بہنیں اللہ نے دو دیں تو نہایت بے ادب اور خدمت گزاری اور اطاعت پسندی کے جذبات سے عاری۔ بھائی دیا تو اعلا درجے کا بے درد۔ بے حس اور بے وقوف۔ کزنز ہیں تو وہ خلوص و مروت کے لطیف احساسات سے محروم۔ جاؤں تو کہاں جاؤں۔"

"واقعی۔" جمال نے اعلا درجے کی ہم خیالی ظاہر کرتے ہوئے بڑے تفہیمی انداز میں سر ہلا کر سحرش کو دیکھا تھا۔

"لہٰذا میری پیاری آپی۔ ثابت ہو گیا ہے۔

یہ جہاں نہیں تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے"

"کیوں طوفان نوح برپا کرنے کا ارادہ ہے۔ جاؤ شرافت سے اسد بھائی سے نوٹس لے آؤ، وہ جو نیرش نے کہے تھے۔ کل تمہیں لانے کو۔ ابھی باہر نکل کر یاد آتے ہی اس نے آفت ڈھا دینی ہے۔"

سحرش نے کچھ بگڑ کر خفگی سے جمال کو ٹوکتے ہوئے ساتھ ہی کام بھی یاد دلا دیا تھا۔

"اس لڑکی کا دماغ تو ازل سے خراب ہے۔ بھلا آتی گرمی میں گرم پانی سے شاور لینے کی کیا تک ہے"

امی بڑبڑاتی ہوئی دوبارہ کچن کی سمت چل دیں معاملہ ٹھنڈا پڑتے ہی۔

"تم سے آؤ نوٹس اس سے۔" جاتے جاتے جمال کو یاد دہانی کرا گئی تھیں کہ اپنی لاڈلی کے مزاج سے آشنا تھیں زمین آسمان ایک کر دینے تھے اس نے۔

"اتنی گرمی میں جاؤں گا۔ ابھی تو صرف چار بجے ہیں" جمال بسورا تھا۔

"ابھی تو گھڑی پر چار ہی بجے ہیں۔ نوٹس نہیں ملے تو وہ سارے گھر والوں کے اعصاب پر نوبت بجا دے گی۔"

سحرش ایک سال چھوٹی ضرور تھی نیرش سے لیکن اس کے پل پل بدلتے دھوپ چھاؤں مزاج کی الف بے سے ازل سے واقف رہی تھی۔ اور پھر ہوا بھی یہی۔ نیرش خدا کرے ہاتھ سے گیلے بال جھٹکتے ہوئے لاؤنج میں آئی تو جمال پر نظر پڑتے ہی نوٹس کی یاد تازہ ہو گئی۔

"تم سے آئے نوٹس پھر کہ نہیں۔"

"کہاں سے آتی؟" جواب میں جمال نے معصومیت کا بلا جواز ڈراما رچانا چاہا۔

"ارے میری سسرال سے اور کہاں سے۔" وہ دھاڑی تھی۔

"آہستہ بولا کرو لڑکی۔ سائلنسر فٹ ہے گلے میں کیا؟" امی نے کچن سے ہی لتاڑتے ہوئے اسے نصیحت کرنے کی بے سود کوشش کی تھی۔

"اسد بھائی آپ۔ السلام علیکم۔" مہوش کے خیر مقدمی انداز پر سب چونک کر داخلی دروازے کی سمت متوجہ ہوئے تھے۔

"لیں آپی! آپ کی سسرال خود ہی چلی آئی۔ تردد کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

جمال تو اسد بھائی کی تشریف آوری سے اتنا خوش ہوا کہ بڑھ کر اپنی جگہ بٹھا دیا تھا۔

"خوب موقع سے آئے اسد بھائی۔ ابھی آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔" جمال مشقت سے بچ جانے پر از حد خوش تھا۔

"وہ میرے نوٹس۔" وہ کچھ خجل سی نروس سی ہو گئی

ی۔ جواب میں انہوں نے بلاتوقف پوری کی ان
کے ہاتھ میں تھما دی۔
"کلینک سے واپسی پر ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا دیتا
چلوں۔"
بڑے سبھاؤ سے کہتے ہوئے وہ جمال کے پاس
بیٹھ کر اس سے اسٹڈیز کے بارے میں بات چیت کرنے
لگے۔ دیگر کزنز کی نسبت ان کے مزاج میں شروع سے
ہی بڑی رسانیت، ٹھہراؤ اور سنجیدگی رہی تھی۔ اسی لیے
سبھی ان کی محتاط طبیعت کے پیش نظر ذرا تہذیب و
تمیز کے دائرے میں سمٹ جاتے تھے حتیٰ کہ سدا کی جھگڑالو
زبان دراز اور گرم مزاج نیرش بھی اپنی کترنی پر کچھ قابو
رکھ لیا کرتی تھی۔ یا پھر شاید کچھ دونوں کے درمیان رشتے
کا تقاضا بھی تھا۔
"اے نغمی بھی آئی ہوئی ہے!" سحرش نے اسد کی بہن
کو اپنے دو سالہ بچی کی انگلی پکڑے اور چھ ماہ کی بچی
کو شانے سے لگائے بچے کا نیپی اپنے میاں سہیل سے
کسی بات پر الجھتے اندر آتے دیکھ کر جھٹ پذیرائی اور
جھکتے انداز میں اس سے بچی کو لیا تھا۔
"میرا شونا بچہ۔ پالا بچہ آیا ہے۔" نیرش نے جھپٹ کر
سحرش کے ہاتھ سے بچی کو لے لیا۔ بچوں پہ تو وہ مرتی تھی
بری طرح۔
"اسے دھیان سے۔ ڈھنگ سے اٹھاتی ہوں، ہوں کرتی
رہ گئیں۔ اس نے چٹاچٹ بچی کے ڈھیروں بوسے
لے ڈالے۔
"خاصی مشکل نہیں ہو جائے گی نیرش بہن۔ یہ اپنے ڈاکٹر
صاحب تو فیملی پلاننگ کے پکے خاصے حمایتی ہیں۔" سہیل
بھائی نے شریر نظروں سے پہلے نیرش کو اور پھر اسد کو دیکھتے
ہوئے متبسم ہو کر کہا تھا۔
اسد تو یوں ہو گئے جیسے سنا ہی نہیں اور وہ بے ساختہ
سرخ ہو گئی تھی۔
"سہیل بھائی۔ آپ بھی بس۔ نغمی اچھا کرتی ہے جو
[illegible] آپ کریں خیالات مٹانے کو وہ ناراضگی سے
کہنے لگی۔
"اسے کہاں رہتے ہیں میرے کہنے میں۔ ان مردوں
کا معاملہ ہے۔ چکنی مچھلی کی طرح لمحوں میں ہاتھ سے
پھسل جاتے ہیں۔"
"اچھا بس بس اب تو اپنی سینیارٹی جتانے کے لیے
بورنگ لیکچر نہ سنانے بیٹھ جانا!"
نغمی شروع ہوا ہی چاہتی تھی کہ نیرش نے ہاتھ اٹھا
کر گویا اسے خبردار کر دیا۔
"اور بیٹے گھر میں سب خیریت ہے؟"
امی سہیل بھائی سے حال احوال دریافت کر رہی
تھیں کہ آخر۔ ان کی بیٹی کے نندوئی تھے۔
"جی خالہ! سب ٹھیک ٹھاک ہیں آپ کی دعا ہے!"
انہوں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔
"توبہ خالہ! گرمی ہے کہ قیامت ہے۔ اس بار تو لگتا
ہے آسمان کا سارا قہر ٹوٹ پڑا ہے۔"
نغمی توبہ توبہ کرتی امی ـــ کے بیڈروم میں اے سی
کے آگے جا ڈٹی تھی۔ سحرش وغیرہ بھی لڑکوں کو ادھر باتیں
کرتا چھوڑ کر کمرے میں آ گئیں۔
"وہ سحرش میرے کپڑے کدھر ہیں بلو والے۔" نیرش
حسب سابق ہونق ـــ شکل بنائے واویلا کرتی آ رہی
تھی۔
"یا وحشت نیرا۔ کبھی تو آنکھیں استعمال کر لیا کرو۔
ادھر سامنے ہی تو رکھے ہیں۔ ابھی بس منٹ پہلے پھوپھی
نے استری کر کے۔"
"مگر کہاں۔ مجھے تو نظر نہیں آ رہے۔" وہ ہنوز ہونقوں
والی شکل لیے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
"تمہیں نظر آنے بھی نہیں لگے ابھی۔" سحرش جھلا گئی۔
"اسی لیے میں نے سٹنگ روم میں رکھنے کو کہا تھا کہ تم صرف
سیدھا دیکھنے کی عادی ہو۔ پھر بھی تمہاری دہائی ختم
ہونے کو نہیں آتی کبھی۔"
"اچھا دیکھ لیتی ہوں ایک بار پھر۔" سحرش کے تیز نظروں
سے گھورنے پر وہ منہ لٹکائے دوبارہ سٹنگ روم میں
چلی آئی تھی۔
"اے ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تم لوگوں کو بڑی
زبردست خبر سنانا تھی۔ وہ نہیں تھی شازین۔"
نغمی تسلی سے ٹک کر بات شروع کر دی تھی کہ اسی لمحے
سٹنگ روم سے شدید قسم کا شور بلند ہوا۔
"اسے کیا ہو گیا؟"

روتی، ہونٹ کو گند ہے سے لگائے نغمی گھبرا کر مہوش کو دیکھنے لگی۔ جہاں اطمینان میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"معمول کی بات ہے، بیڑا جب۔ گھر میں موجود ہو تو ایسی سرحدی جھڑپیں اور گولہ بارود کی یلغار لازم ہوتی ہے۔"

وہ اٹھ کر صورت حال معلوم کرنے سٹنگ روم میں آئی تو وہاں نیرش اور جمال کو برسر پیکار پایا۔ مہوش ایک سمت سہمی صورت بنائے کھڑی نیرش کو آگ بگولہ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ امی حسب سابق "مصلح اعظم" کا کردار نبھا رہی تھیں۔

"اب بس بھی کرو نیرا! مہوش نے تو اس لیے کپڑے صوفے پر رکھے تھے کہ سامنے پڑے تمہیں نظر آجائیں۔ جمال نے دیکھا نہیں اور وہ ان پر بیٹھ گیا۔ مہوش تم دوبارہ پریس کردو۔"

"نہیں امی۔ مجھے یہ بتائیں۔ سب سے پوچھ کر کہ ان کو مجھ پردیسن سے کیا بیر ہے۔ جو حادثہ ہونا ہوتا ہے میری چیزوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ میرے اللہ کسی کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں جان گئی ہوں۔ کہیں صدیوں بعد گھر آتی ہوں چھپ چھپ کر تو بھی ان سے گوارا نہیں ہوتا۔ خود تو آپ لوگوں کے اتنے قریب رہتے ہیں۔ پیار بھی بٹورتے ہیں اور لاڈ بھی۔ ایک میں ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آگئے۔

"اچھا بس کرو یہ مگرمچھ کے آنسو۔" سحرش نے اسے گھورا۔

اس کے آنسو دیکھ بھی کہاں سکتا تھا کوئی گھر میں۔ سبھی کی تو لاڈلی تھی۔

شادی کے بیشک دس سال بعد بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوئی تھی۔ پھر اس سے ایک سال بعد سحرش دنیا میں تشریف لائی۔ سحرش سے ڈھائی سال بعد محترم جمال نے دنیا میں قدم رنجہ فرمایا۔ اور جمال کے تقریباً پانچ سال بعد مہوش نے آکے بقول نیرش کے فل اسٹاپ لگایا تھا۔

دادی جان اور ڈیڈی کو اپنی اولاد کو ڈاکٹر بنانے کا بڑا شوق تھا۔ سو بری میڈیکل میں اچھے مارکس کے تو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں اس کا داخلہ کروا دیا۔ اسے میڈیکل لائن کوئی خاص پسند نہیں تھی مگر امی اور ڈیڈی کے شدید اصرار پر مان ہی گئی۔ وہاں ہاسٹل میں رہتی تھی۔ مہینے دو مہینے بعد ادھر کا چکر لگاتی تھی۔ چونکہ عرصے بعد آتی تھی اس لیے خود بخود وی آئی پی ٹریٹمنٹ کی مستحق بن گئی تھی۔ گھر والے تو خیر ناز اٹھاتے ہی تھے۔ سارہ پھوپھو اور زیب خالہ کی فیملی بھی خوب ہی نازبرداریاں کرتی تھی۔ زیب خالہ تو یوں بھی اکلوتی بھانجی ہونے کے ناتے اس کو کانچ کی گڑیا کی طرح رکھتی تھیں۔ بیٹی نغمی کو تو بیاہ دیا تھا۔ قریب ہی سسرال تھی اور وہ راضی خوشی بس رہی تھی۔ نغمی، نیرش، سحرش اور سارہ پھوپھو کی ایمن چاروں بچپن کی ہم جولیاں تھیں۔ خوب بنتی تھی آپس میں۔

نغمی کے سسرال والوں کو جلدی تھی سو اس کی شادی ہوگئی۔ نیرش کا اسد سے بہت پہلے نکاح ہو چکا تھا اس کی رخصتی میں میڈیکل کی پڑھائی حارج تھی۔ ایمن کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ اس کا منگیتر باہر پڑھنے گیا تھا۔ رہ گئی سحرش تو اس کے لیے آج کل رشتوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

"یہ مگرمچھ کے آنسو ہیں۔ اتنی مشکل سے تو نکالے ہیں۔" وہ رونا دھونا چھوڑ کر لڑنے لگ پڑی۔

"مجھے خبر ہے کسی کو مجھ سے رتی بھر محبت نہیں ہے۔ میرا خیال نہیں ہے۔" اس کی سوئی ادھر ہی اٹکی ہوئی تھی "ڈیڈی کو آلینے دو بتاؤں گی ان کو۔ مجھ پر کیسا کیسا ظلم نہیں ٹوٹتا اس گھر میں۔" وہ نئے سرے سے واویلا مچانے لگی تھی۔

"نیرش! نیرش! خدا کے واسطے شور کم کرو۔ پاگل تو نہیں ہوگئیں۔ یہ ساتھ کے کمرے میں اسد وغیرہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کسی آئے گئے کا خیال ہی کرلیا کرو۔" امی بری طرح عاجز آگئی تھیں۔

"ارے ممانی! اچھا کریں نا، یہ انہی کو سنانے کے لیے تو ہے۔" ایمن بھی کہیں سے کود پڑی تھی۔

ایمن کی شرارت پر نیرش نے کھا جانے والی نظروں

سے تھوڑا تھا۔ نہیں تھی۔ ارے وہی سارہ

"اچھا وہ شازمین کی جٹھانی کی بہن۔"

پھر جب معمولات پر آجانے کے بعد نغمی پھر وہیں
سے سلسلہ کلام جوڑ رہی تھی کہ نیرش نے بات اچک
لی۔ "نہیں تھی۔ تو کیا بے چاری گزر گئی اب؟" نہایت
معصومانہ استفسار تھا۔

نغمی نے نہایت لگن سے اسٹارٹ لیا تھا۔ ٹوکے
جانے پر سخت بھنا گئی۔

"کیوں گزرنے لگی وہ۔ البتہ اس پر بڑی بُری گزری۔"

"اچھا۔ کہیں ٹرین تو نہیں گزر گئی؟" ایمن بھی نیرش
کے ساتھ آمادہ بہ شرارت ہوگئی۔ نغمی جب تجسس اور
شوق کی انتہاؤں پر پہنچ کر کوئی سنسنی خیز بات
بتانا شروع کرتی تھی تو انہیں اسے بیچ میں ٹوک کر
زچ کرنے میں بہت مزا آتا تھا۔

"تمہارا میرے ہاتھوں گزرنے کا ارادہ تو نہیں۔" نغمی
نے ناراضگی سے اسے دیکھا۔

"میں تم لوگوں کو اتنی اہم بات سنانے جا رہی ہوں
اور تمہیں اٹکھیلیاں سوجھ رہی ہیں۔ جانتی بھی ہو شازمین
کو ڈائیورس ہوگئی ہے۔" اس نے تنگ آ کر ہیڈلائن
ہی سنا ڈالی۔

"ہائیں" تینوں کی بے یقین چیخیں فطری تھیں۔

"یہ کیسے ہوگیا بھئی؟"

"جیسے چپ چپاتے شادی ہوئی تھی ویسے ہی بنا ہے
خاوند کو چھوڑ کر وہ وطن واپس آگئی ہے۔"

"خاوند کو چھوڑ دیا یا خاوند نے اسے چھوڑ دیا۔" سحرش
نے الجھن کے عالم میں استفسار کیا۔ "اور تمہیں یہ کیسے پتا چلا۔
ہم لوگوں کا تو عرصہ دراز سے یاسمین آنٹی سے تعلق منقطع
ہوچکا ہے۔"

"عفت ملی تھی مجھے کل سپر مارکیٹ میں۔ اس نے
اطلاع دی۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ شازمین کو
نیویارک سے واپس آئے تین سال ہوگئے ہیں۔"

"تین سال۔" سحرش نے گویا ایک ایک حرف کو
حیرت سے چبایا۔

"مگر عفت کون ہے؟" نیرش نے دریافت کیا۔

"ارے بھئی، شازمین کی فرسٹ کزن ہے اور کون۔"
نغمی کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ اسے سوالیہ جملوں سے
سخت کوفت ہوتی تھی۔ بُری طرح جھنجلا جاتی تھی "شازمین
سے تو خیر برسوں گزر گئے بات نہیں ہوئی۔ البتہ عفت
سے میری اچھی خاصی دعا سلام ہے۔ اس نے اور بھی
بہت کچھ بتایا ہے۔ سنسنی خیز اور دل دہلا دینے والی
داستان ہے کہ تم لوگ سن کر تھرا اٹھوگے۔"

"ہیڈلائن نہ دو۔ پوری رپورٹ دو ناں۔" ایمن
نے بے تابی کا مظاہرہ کیا۔

"شازمین نے تو اپنی پسند سے ماں سے ٹکرا کر
شادی رچائی تھی پھر اتنی جلدی چھوڑ کر کیسے آگئی۔" سحرش
نے کچھ سوچتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

"بنی نہیں ہوگی اس کے ساتھ۔ یا پھر یاسمین آنٹی
کی تربیت رنگ لائی ہوگی۔" ایمن نے قیافہ لگایا
تھا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ حقیقت سنو گی تو ہوش اڑ
جائیں گے۔" نغمی کے پُراسرار لہجے نے سبھی کو متجسس کر دیا
تھا۔

یاسمین آنٹی سے ایک زمانے میں ان لوگوں کی فیملی
کے بڑے اچھے تعلقات رہے تھے۔ ان لوگوں کے ہاں
تو خدا کے فضل و کرم سے شروع سے ہی معاشی خوشی اور
استحکام رہا تھا البتہ یاسمین کے میاں بینک میں معمولی
سے ملازم تھے۔ ہاتھ تنگ گزارہ مشکل۔ اوپر سے یاسمین
بیگم کی شاہ خرچ اور شو باز طبیعت کے باعث گھریلو
بجٹ بُری طرح عدم توازن کا شکار رہتا تھا۔ یاسمین
بیگم کو نت نئے ملبوسات، میک اپ کے سامان
اور جوتوں جیولری وغیرہ کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے
میاں پر دباؤ ڈال کر بالآخر انہیں باہر جا کر کمانے پر راضی
کر لیا۔ ان کے میاں ریاض حسین بڑے صابر اور قانع
قسم کے بندے تھے البتہ یاسمین بیگم ظاہری چمک دمک
آن بان اور شان و شوکت پر جان دینے والی تھیں۔
دولت شہرت اور نمود و نمائش سے فوراً مرعوب
ہوجایا کرتی تھیں۔ ان لوگوں کے ہاں جب بھی آئیں

ان کی زندگیوں پر رشک کرتیں اور حسرت سے ان کے پرتعیش اور خوشگوار پرسکون محل نما بنگلے کی آرائش و زیبائش کا جائزہ لیتیں۔

پھر وقت نے کروٹ لی۔ یاسمین بیگم کے دن بھی پھرنے لگے۔ میاں نے باہر جا کر ڈرافٹ بھیجنا شروع کر دیے۔ یاسمین بیگم نے پلاٹ لے کر شہر کے پوش علاقے میں گھر بنوا لیا۔ اور پھر کرائے کا تنگ و تاریک دو کمروں کا فلیٹ چھوڑ کر اپنی کوٹھی میں منتقل ہو گئیں۔

رہائش کیا بدلی۔ طور اطوار، مزاج اور تعلقات ہی بدل گئے۔ اونچے اونچے گھرانوں سے تعلقات قائم کرنے کے بعد انہیں اپنے عزیز رشتے داروں سے ملنا گراں گزرنے لگا۔ تقریبات میں اپنی بیٹی شازمین کے ہمراہ شرکت کرتیں تو یوں جیسے انتہائی احسان کے بعد اپنے سے کم مرتبہ لوگوں کے ہاں آئی ہوں۔ تکلف زدہ سو نخروں میں پیٹی گفتگو کا مرکز دولت اور اس سے حاصل ہونے والی آسائشات کا حساب کتاب ہوتا تھا۔ ان کا رویہ اتنا طنزیہ —— اور تحقیر آمیز ہو گیا تھا کہ —— لوگوں کے لیے برداشت کرنا بعض اوقات بہت ناممکن ہو جایا کرتا تھا۔

پہلے بڑوں نے آنا جانا کم کیا اور پھر چھوٹی پود نے گریز برتنا شروع کر دیا۔ آخری دفعہ ان کی ملاقات نئی محل نما کوٹھی کے مکمل طور پر سیٹ ہو جانے کی خوشی میں کیے گئے فنکشن میں ہوئی اور اس میں یاسمین بیگم اور شازمین نے جس چھچھورے پن اور چھوٹی ذہنیت کا ثبوت دیا۔ اس نے ان کے دل میں بہت غبار بھر دیا۔

"اتنی بڑی بڑی سیاسی سماجی اور کاروباری شخصیات مدعو ہیں اس فنکشن میں۔ تم لوگوں کو ذرا خاص طریقے سے تیار ہو کر آنا تھا۔ آخر کو میری بھی چار بندوں میں عزت ہے۔ ان لوگوں پر رعب پڑنا چاہیے کہ میرے عزیز رشتہ دار اتنی ٹور والے ہیں۔" یاسمین بیگم کے ناک چڑھانے پر سارہ پھوپھو نے ناخوشگوار انداز میں کہا۔

"بھئی یاسمین! یہ ہم تمہاری خوشی کے لیے گھڑی دو گھڑی کو آ گئے ہیں۔ کسی نمائش میں حصہ لینے کا ہمیں کبھی شوق نہیں رہا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو ہمارے ہاں اس طرح کے الّلے تلّلے نہیں ہوتے۔ جیسے ہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں اور اسی پر خوش، مطمئن اور پُراعتماد رہتے ہیں۔"

"میں نے تین ہزار کا اسپیشل سُوٹ سلوایا تھا اس فنکشن کے لیے۔ بھئی آخر میں نے بھی تو رکھنا ہوتا ہے اپنے آپ کو اسٹیٹس کے مطابق۔"

شازمین اپنی دانست میں بڑے جتلانے والے انداز میں اٹھلا کر —— انہیں احساس دلا رہی تھی ان کی سادگی کا۔ سب کے دل ان کی طرف سے کھٹے ہو گئے۔

"اور وہ نہیں آئی زینب اور اس کے بچے۔"

"ان کے ہاں کچھ مہمان آ گئے تھے باہر سے۔ کہہ رہی تھیں کل کسی ٹائم آ کر مبارکباد دے جائیں گی۔" امی نے یاسمین بیگم کے استفسار پر تحمل سے جواب دیا۔ یاسمین بیگم کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔

"لو بھلا فنکشن آج ہے۔ اہتمام آج کیا ہے میں نے اور محترمہ کل تشریف لائیں گی۔ اب کیا ان کی وجہ سے ہم کل کے لیے باؤنڈ ہو کر بیٹھ رہیں۔ ہمیں بھی کہیں آنا جانا ہوتا ہے۔ کسی کام کے لیے باہر نکلنا ہوتا ہے نئے سرے سے اب کل خصوصی طور پر اس کے لیے تو اہتمام کرنے سے رہی۔"

ایسا ہتک آمیز رویہ اور انداز سب کو سیخ پا کر گیا اور پھر اس کے بعد دونوں اطراف سے کوئی میل ملاقات کا سامان نہ ہوا۔ یوں بھی یاسمین بیگم کا حلقہ ارباب اب بدل چکا تھا۔ شازمین کی دوستیاں۔ بیوروکریٹس، ایم پی اے، ایم این اے اور وزیروں مشیروں کی اولادوں سے ہو گئی تھیں۔ ماں تو شروع سے فیشن، کپڑوں اور زیورات کی دیوانی تھیں بیٹی کی بھی وہی طبیعت تھی —— اور اب جب ارمان پورے کرنے کے لیے پیسہ ہاتھ لگا تھا تو جی بھر کے اڑایا جانے لگا۔

دونوں ماں بیٹیاں الٹرا ماڈرن سوسائٹی کی روح رواں بن گئیں۔ پھر شازمین کا نیرش، مہوش، امین

رہا تھا۔ اس کے بعد نیرش میڈیکل میں چلی گئی۔ نغمی نے
فائن آرٹس لے لیا۔ سحرش اور ایمن نے البتہ ایک ہی
کالج سے بی اے کیا اور اب ایم اے بھی ایک ہی جگہ
میں اکٹھے کر رہی تھیں۔ شازمین نے سیکنڈ ایئر کے بعد کسی
انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لیا پھر سننے میں آیا کہ اسی
زمانے میں اس کا ایک امریکن نیشنلٹی ہولڈر امیر کبیر
خوبصورت نین نقش والے بھرپور مرد سے چکر چل نکلا
اور بالآخر شادی پر منتج ہوا۔ شادی کے بعد وہ اسے
امریکہ لے گیا۔

یہ خبر بھی اڑتے پڑتے کان میں پڑی کہ یاسمین بیگم اس
عجلت کی شادی سے کوئی خاص خوش نہیں تھیں۔
شازمین کا سحر انگیز فتنہ ساماں حسن تو بڑے بڑے
وزیروں اور جاگیرداروں کو ان کے در پر لا کر کاسۂ طلب
تھامنے کا باعث بن سکتا تھا۔ ابھی تو اس کے حسن
جہاں سوز کی کلی ٹھیک سے کھلی بھی نہیں تھی۔ اسے ایک
سے بڑھ کر ایک اچھا رشتہ مل سکتا تھا۔ یاسمین بیگم
بڑے بڑے نامی گرامی لوگوں کی لائن لگی دیکھنے کی
خواہش مند تھیں مگر بیٹی کی ضد اور جنون کے باعث
مصلحتاً خاموش رہ گئیں۔ شادی کے کوئی ایک سال
بعد شازمین مستقل طور پر پاکستان واپس آ گئی تھی۔ وہاں
اس پر کیا بیتی۔ اتنی چاہت اور عجلت سے کی گئی شادی
کا اتنا بھیانک انجام کیونکر ہوا۔ یہ نغمی کو اتفاقاً ہی
شازمین کی فرسٹ کزن عفت سے معلوم ہوا تھا۔ اور اب
وہ سب پوری داستان سننے کے لیے بے چین تھیں۔

مگر قدرت کو شاید ان کے صبر کا امتحان درکار تھا
رخصتی کے اسٹارٹ لینے سے پہلے ہی امی اندر آ گئیں۔
"سحرش، نیرش ذرا آفس کچن میں میرے ساتھ۔ ابھی
زبیر کا فون آیا ہے وہ اور نغمی کی ساس ادھر آ رہے
ہیں۔ سارہ کو بھی لا رہے ہیں۔ میرے ساتھ کھانا بنوا دو۔
... نے مکس بنا لیا ہے۔ ساتھ میں چائنیز رائس
بھی تمہاری نانی کو بہت پسند ہیں۔ اور باربی کیو
بھی سارہ کو پسند رہا ہے۔ میکرونیز نیرش
... اب بھائی فرمائش سے بنواتے ہیں۔ سوپ
... کے لیے میں نے چاول بھگو رکھے ہیں۔"

... بڑی ... کی جاتی ...
امی عجلت میں ڈنر کی ساری تفصیل بتا رہی تھیں
"خالہ جان بھنڈیاں بنائیں مسالے والی۔" نغمی نے
صلاح دینے کے ساتھ فرمائش بھی کر ڈالی۔
"چلو ٹھیک ہے۔ سحرش، نیرش بیٹے آ جاؤ اب یہ
کام کافی زیادہ ہے۔ ایمن چند اتم بھی آ جاؤ ذرا۔ رشین
سلاد ضرور بنانا۔ تمہارے ماموں اکثر تمہارے
ہاتھ کی سلاد کا بہت ذکر کرتے ہیں۔"
"آ جائیے بھئی۔ آپ کو بھی باضابطہ دعوت مل چکی
ہے۔" سحرش نے اٹھتے ہوئے ایمن کی طرف دیکھا۔
"اور امی یہ موٹی بھینس کیا یونہی بیٹھی رہے گی؟
اس کے ذمے بھی تو کوئی کام لگائیں ناں۔" نیرش نے
نغمی کے مٹاپے سے بھرپور وجود کو دیکھتے ہوئے
شرارت سے کہا۔
"ارے وہ بے چاری کیسے کرے گی۔ بچوں کو ہی
سنبھال لے تو بڑی بات ہے مت مار دیئے
ہیں چھوٹے بچے تو۔"
امی کے جواب پر نغمی نے نہایت فخریہ انداز میں
نیرش کی طرف دیکھا تھا۔
جواب میں اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہائے کاش
جو ہمارے بھی دو چار بچے ہوتے تو اسی طرح ان کی آڑ
لے کر کام سے جان چھڑا لیتے۔"
ادھر ادھر بہت سے قہقہے بکھر گئے۔ اسی لمحے اسد
اور سہیل بھائی اس طرف آ رہے تھے۔
"اتنی مایوس کیوں ہوتی ہو نیرو گڑیا۔ اللہ میاں سے
اچھی امید رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ دو نہ چار بلکہ
تمہاری فرمائش پر پورے درجن ہی بھجوا دے۔ ابھی
تو بہت وقت ہے۔ کیوں اپنے ڈاکٹر اسد صاحب۔"
سہیل بھائی نے اس کے حسرت و ملال میں گھلے
دلگرفتہ انداز پر تسلی دینے کے انداز میں چمکارتے
ہوئے آخر میں تائیدی انداز میں پاس کھڑے اسد
کو دیکھا تھا۔
نیرش کرنٹ کھا کر پیچھے مڑی تھی اور پھر اسد کو دیکھ
کر آنا فاناً جیسے اس کے چہرے پر سرخ گلابی چمکدار
پینٹ ہوتا چلا گیا۔ سحرش، ایمن اور نغمی ابھی تک ہنس

رہی تھیں۔

"نہایت بدتمیز ہو تم سب۔" منہ پھاڑ کر ہنس رہی ہو ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ ایمن وغیرہ پر برس پڑی تھی اپنی خفت مٹانے کو۔

"جاؤ میں ناراض ہو رہی ہوں تم لوگوں سے۔" وہ مکمل خفا ہو گئی۔

"کوئی بات نہیں۔ اے میری جان ناراضگی تو دراصل اظہار محبت ہوا کرتی ہے۔" نغمی لہک کر بولی۔

"ہر کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوا جاتا ناں۔ ہم دوسروں سے نفرت کر سکتے ناں۔ بیزار ہو سکتے ہیں۔ ان سے جدا ہو سکتے ہیں لیکن دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جن سے ناراض ہوتے ہیں۔ ہر ایرے غیرے سے ناراضگی کا اظہار بھی تو نہیں کیا جاتا۔ خفا بھی انہی سے ہوا جاتا ہے جن سے محبت، توجہ، توقع اور اعتماد کے رشتے بندھے ہوتے ہیں وہ کیا کہتا ہے شاعر کہ۔

؎ کوئی تعلق جو نہ ہوتا تو خفا کیوں ہوتے
بے رخی ان کی محبت کا پتا دیتی ہے"

نغمی، پنکی کو تھپک تھپک کر سلاتی بڑی تر و تازگی سے ناراضگی کا فلسفہ سمجھا رہی تھی۔

"نغمی۔" نیرش نے خفگی کے عالم میں اسے مخاطب کیا۔ "مجھے تم سے سخت شکایت ہے۔ انہیں میرا کوئی خیال نہیں۔"

"شکایت اور وہ بھی مجھ سے۔" نغمی بن کر بولی۔ "یہ تو جان من تم نے دوسرا اظہار محبت کر ڈالا جیسا کہ اس پر شاعر کہتا ہے۔

؎ ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
واللہ مجھ سے کتنی محبت ہے آپ سے"

"نغمی۔ نغمی۔ میں نے تمہیں تمہارے شاعر سمیت غرق آب کر دینا ہے۔ سخت غصہ آ رہا ہے تم پر۔"

وہ بکو ناراضگی، اشتعال اور غیض سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس پر بھی شاعر کہتا ہے۔

؎ ان کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہم کو غصے پر پیار آتا ہے

نغمی کو تو بڑا اچھا موقع ہاتھ لگا تھا سو جی بھر کر بدلے اتار رہی تھی۔ نیرش کو شعر و شاعری سے اتنا ہی بیر تھا جتنا نغمی کو سوالیہ طرز تخاطب سے۔

"اف اللہ۔" وہ بری طرح عاجز آ گئی آخری حربے کے طور پر فلور کشن اٹھا کر ٹارگٹ بنانے لگی۔ "تمہیں تو میں بتاتی ہوں۔"

شدید غصے سے مغلوب ہو کر وہ دست بدست لڑائی پر اترنے والی تھی۔ نغمی نے بسرعت آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کشن کھینچ لیے اور پھر اس کے گلابی گالوں کا بوسہ لے کر تیزی سے پیچھے ہٹ کر شوخی سے گویا ہوئی۔ "اس پر بھی شاعر کہتا ہے۔

؎ دیکھو مجھے ڈر لگتا ہے غصے سے تمہارے
تم مجھ سے خفا ہو بھی تو اظہار نہ کرنا"

حسب سابق اس نے اس قدر برجستگی سے برمحل یہ شعر پڑھا تھا کہ نیرش کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔

"پوری کمینی ہو تم۔" ایک دھموکا اس کی کمر پر جڑ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

رات کھانے پر سارہ پھپھو، زیب خالہ اور نغمی کی سسرال سے شاہ بانو آنٹی اور نغمی کے دیور یاسر اور طلو لوگ سب موجود تھے، اچھا خاصا اہتمام ہو گیا تھا۔ باتوں باتوں میں ڈیڈی نے مژدہ جانفزا سنایا۔

"بھئی، یہاں تو غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔ آؤٹنگ کے لیے ایک آدھ ہفتے کے لیے کسی ٹھنڈے مقام پر نہ چلیں۔"

"ہرا! زبردست آئیڈیا ڈیڈی۔" جمال کے ساتھ ساتھ اس کے یار غار یاسر نے بھی نعرہ لگایا تھا۔

"ہائے ڈیڈی! آپ کتنے اچھے ہیں، اور کتنا پیارا دماغ رکھتے ہیں۔" نیرش کا تعریف کرنے کا اپنا ہی ایک انداز تھا۔

"اچھا پھر جائیں گے کہاں بھلا؟"

وہ مسرت آمیز بے چینی سے ہاتھ روک کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"وہ نہیں تھے سردار قیوم علی، جو میرے اور تمہارے خالو ارباب کے ایک زمانے میں بڑے اچھے دوست ہوا کرتے تھے، وہ کل ملے تھے ہمیں۔ ان کا کلر کہار میں ایک بڑا خوبصورت سا ریسٹ ہاؤس ہے، ہے تو وہ گھر ہی مگر سردار صاحب اسے ریسٹ ہاؤس کی طرح ہی استعمال کرتے ہیں۔ کبھی اچھے سیزن

میں وہیں چلے جاتے ہیں یا دوست احباب وہاں جائیں تو ان کے زیر استعمال رہتا ہے۔ اس بار وہ لوگ مری جا رہے ہیں چھٹیاں گزارنے۔ میں اور ارباب کل بات کر رہے تھے کہ بچوں کو اس بار کہیں گھمانے کے لیے لے کر جانا چاہیے۔" انہوں نے اظہار کیا کہ کلر کہار میں ان کے ریسٹ ہاؤس میں رہائش پذیر ہوں۔ یوں بھی بے انتہا خوبصورت وادی ہے۔ ہم نے بھی سوچا اس بار اسی وادی میں چلتے ہیں۔

مری، ایبٹ آباد، نتھیا گلی، بھوربن، ترباٹہ، کاغان سوات وغیرہ سب کچھ تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ کلر کہار کا آئیڈیا یقیناً آپ لوگوں کو بھی منفرد اور دلچسپ لگے گا۔ کیا خیال ہے۔"

ڈیڈی نے مسکرا کر ان لوگوں کی طرف باری باری دیکھا۔

زبردست ڈیڈی۔ ایک دم فنٹاسٹک خالو جان۔ مباشک ورانی انکل! زندہ باد ماموں جان!۔ ڈرائنگ روم اس قسم کی آوازوں ــــــ سے گونجنے لگا۔

"اچھا بھئی اچھا۔ اپنی ایکسائٹمنٹ کو تھوڑی دیر کے لیے قابو میں رکھو، اور دھیان سے کھانا کھا لو۔ ابھی دو تین دن باقی ہیں، جی بھر کر پلان بنا لینا اور تیاری وغیرہ کر لینا۔" ارباب خالو نے ان کے سفر کے متعلق جوش و خروش سے لبریز منصوبہ جات کی تہ لپیٹنے کے لیے گھبرا کر کہا تھا۔

"ہائے گرمی کتنی ہے، پر کیا کریں، شاپنگ بھی تو ضروری تھی۔ ویسے سحرش! پتہ نہیں وہاں کا موسم کیسا ہوگا۔ لوگ کیسے ہوں گے، ماحول کیسا ہوگا۔ ہمیں بھلا کس طرح کے کپڑے جوتے وغیرہ لینے چاہییں۔"

نیرش حسب معمول واویلے کے سے انداز میں فکر مندی کا اظہار کر رہی تھی۔

"اتنی آتاولی کیوں ہو رہی ہو، کبھی تو ڈھنگ سے بھی رہ لیا کرو۔" سحرش نے جھڑکا۔ "ہلکے پھلکے پرنٹ کے اور چکن کے لیتے ہیں۔ ایک سوٹ یا دو لان کے بھی دیکھ لیتے ہیں، کیوں امین؟"

وہ "رت" کی لوجک میں ہنگم سے لگتے کپڑے کو کھنگال رہی تھی۔

"بنصیحت درست۔" امین نے بلا توقف حمایت کی۔

"اچھا پھر جلدی کرو ناں۔" نیرش نے کچھ بے چینی اور ناراضگی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں ازلی لاپروائی اور لاتعلقی تھی۔

"دیکھ لو ناں تم بھی۔ پھر کہو گی مجھے یہ ڈیزائن نہیں چاہیے تھا، وہ کلر پسند نہیں۔ شاپنگ کے وقت آنکھیں گاڑی میں چھوڑ آتی ہو گویا۔"

اس کے لیے بھی سحرش ہی پسند کر رہی تھی۔ اسے زبردستی ادھر دلچسپی لینے کے لیے مجبور کرتی، دیکھو یہ کیسا لگ رہا ہے، اس کا کلر کیسا رہے گا۔ شاپنگ کے وقت تو وہ بے توجہی سے یونہی سرسری سے انداز میں سر ہلا کر سحرش یا امی کی پسند پر چھوڑ دیا کرتی تھی، البتہ بعد میں استعمال کرنے کا موقع آیا تو خوب خوب فیل مچاتی۔

"بھلا یہ سٹرا بیری رنگ میں پہنتی ہوں؟ اٹھا لائیں بھنگیوں والا کلر۔" وہ منہ بناتی۔

"اُف اللہ سحرش! کون سے جنم کا بدلہ لیا ہے مجھ سے۔ اتنا تیز کلر۔ ابھی میری خانہ آبادی تو نہیں ہوئی خدانخواستہ میں نہیں پہنتی ایسا شوخ چمکدار کلر۔"

"اُف یہ کیا۔ کروڑ دفعہ کہا ہے مجھے فرنٹ اوپن اسٹائل اچھا نہیں لگتا۔ میں نے تو کرتا شلوار سلوانے کو کہا تھا۔ اس کو کیسے پہن سکتی ہوں۔"

غرضیکہ اس کے ہزار نخرے ہوتے تھے، رد و کد ہوتے تھے، اور عجیب و غریب توجیہات پر مشتمل معترضانہ بیانات ہوتے تھے۔

"اچھا پھر آئندہ سے خود خریدنا اپنی پسند سے۔" سحرش مکمل طور پر لاتعلق ہو جاتی مگر وہ "آئندہ" کبھی نہ آتی تھی۔

اس دفعہ بھی بک جھک کر بالآخر سحرش نے ہی اس کے لیے تینوں سوٹ خریدے، اس دوران میں وہ سامنے پوشتی اسٹور کے آگے بیٹھے سٹرابری والے سے آدھ کلو لے کر بڑے اہتمام سے کھا چکی تھی اور اب ایک ہاتھ میں کون اور دوسرے میں چپس والا لفافہ لیے سحرش کے سر پر سوار تھی۔

"جلدی کرو ناں سحرش۔ اُف اتنا حبس ہو رہا ہے۔ کیا ایک ہی جگہ جم کر رہ گئی ہو۔ اتنی دیر میں تو پورا بازار خریدا جا سکتا ہے۔"

"اچھا صبر کرو ناں، پے منٹ تو کر لوں۔" اس کے افراتفری مچانے پر سحرش نے تحمل سے جواب دیا تھا۔ "امین کدھر ہے؟"

"وہ مل ..." پر شو روم دیکھ رہی ہے۔ اُف تم دونوں

نہایت سست ہو۔ وہ بھی گھنٹہ بھر سے کوئی دو سو جوڑے جوتوں کے پہن پہن کر دیکھ چکی ہے، مگر ابھی تک سلیکشن نہیں کر پائی۔"

"پتا چلے گا جب خود کرنی پڑے گی تو دیکھوں گی، لیکن خیر اس معاملے میں تم سے زیادہ بچارے اسد بھائی کو ہی کھپنا پڑے گا۔ انہی کو دردسری کرنا ہوگی۔ تم تو ٹھہریں ازل کی لاپروا اور کام چور۔"

"بلی شوز" کی دکان میں داخل ہو کر امین کو متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی سحرش اسد کی قسمت پر افسوس کر رہی تھی۔

"واہ۔ اتنے سیدھے بھی نہیں ہیں محترم!"

اپنی شان میں کی گئی گستاخی اور اسد موصوف کی ہمدردی میں ادا کیے گئے کلمات ہضم کرنا نیرش بی بی کے لیے خاصا ناگوارِ خاطر کام تھا۔

"وہ سیدھے نہ سہی۔ تم تو ٹیڑھی ہو ناں۔ اور یہ ایک مسلّم حقیقت ہے۔" جوتوں کے ریک پر جھکی امین نے سحرش کی جگہ سنبھال لی تھی۔

"ارے وہ کہاں رہ گئیں اپنی مہوش بی بی۔" معاً نیرش کو خیال آیا۔

"ارے ہاں۔" سحرش اور امین بھی بوکھلا کر پلٹیں۔ وہ کافی دیر سے ان کے ساتھ نہیں تھی۔ انہوں نے خیال ہی نہیں کیا کہ ویسے بھی وہ بہت کم گو اور مولا مست ٹائپ لڑکی تھی۔ چپ چاپ اپنی دنیا میں مگن رہتی۔ انہوں نے سمجھا ساتھ ہی ہوگی۔

"وہ کہاں گم ہو گئی۔" ان کے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ ساری شاپنگ وانگ بھول گئی۔ "کہاں تلاش کریں اسے۔" وہ حواس باختہ سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔

"ارے۔" دفعتاً نیرش کے چہرے پر امید کی کرن منڈلائی۔

"وہ کتابی کیڑا یقیناً کسی بک اسٹال پر ہوگی۔" ساتھ ہی وہ "فیمس بکس" کی طرف لپکی۔ امین بھی پیچھے پیچھے تھی۔

جونہی وہ دروازہ پش کر کے اندر داخل ہوئی۔ اسی لمحے کوئی اندر سے باہر آنے کے لیے دروازے کی سمت بڑھا تھا۔ اگر دونوں ٹھٹک کر رک نہ جاتے تو ٹکر یقینی تھی۔

"ایکسکیوز می۔" بھاری گمبھیر لہجہ اس کے کان سے ٹکرایا۔ وہ بوکھلا کر سائیڈ کو ہو گئی۔ لمبا چوڑا بھرپور وجود دروازے سے باہر غائب ہوتا گیا۔

"بھلا کون ہو سکتا ہے یہ؟" پیچھے کھڑی امین کی موجودگی محسوس کر کے نیرش نے تجسس سے دریافت کیا۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے کی رو میں میگزین کھنگالتی مہوش پر نظر پڑ چکی تھی اس لیے اب وہ مطمئن تھی۔

"مجھے کیا پتا۔" اس کے پوچھنے پر امین نے تحیر کے عالم میں کندھے اُچکا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

"یار! مجھے بڑا عجیب و غریب شخص لگا ہے۔" اس کی سبز آنکھوں میں عجیب سی سرد مہری تھی۔ سفید چہرا اتنا بے تاثر اور بے رنگ لگ رہا تھا جیسے کوئی سنگِ مرمر کا بت ہو۔ بظاہر کتنا ڈیشنگ مگر کتنا پتھریلا اور سپاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ آؤ امین اس کا پیچھا کرتے ہیں۔"

امین ہائیں ہائیں کرتی رہ گئی، اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئی۔

"احمد خان! جلدی کرو۔" سامنے پجارو کا دروازہ کھل جانے کے بعد پھرتی سے بیٹھتے ہوئے اس پُرجلال شخص نے درشت آواز میں ڈرائیور کو مخاطب کیا تھا۔ ڈرائیور ہانپتا کانپتا اس کے بیٹھنے پر دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ کی سمت لپکا تھا۔ اور چند — ساعت بعد پجارو نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

"اے تجھے کیا ہوا ہے؟" پتھر بنی ساکت صامت نیرش کو جھنجھوڑتے ہوئے امین نے حد درجہ تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

وہ بے خیالی میں ابھی تک ادھر ہی دیکھ رہی تھی، جہاں سے پجارو غائب ہوئی تھی۔

"اس طرح کیوں بھاگی تھیں اس کے پیچھے؟"

امین کو اس کی حرکت اچھی خاصی مشکوک لگ رہی تھی بالکل پاگلوں والی۔

"کتنی پُراسرار سی شخصیت تھی اس کی۔ تمہیں نہیں لگی؟"

"ہاں تھا تو کچھ عجیب سا مگر پھر بھی تم کیوں ایک دم اتنی متجسس ہو گئی تھیں۔"

امین سے اس کا عجلت زدہ انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

"میں نے خیال کیا ہو نہ ہو۔ کوئی دشمن کا ایجنٹ نہ ہو۔

ہو سکتا ہے کوئی جاسوس ہو، کیسے چل رہا تھا، کتنی بے حسی اور اجنبیت تھی اس کے انداز میں۔"

اس کا لہجہ کسی خیال میں ڈوبا ڈوبا لگ رہا تھا۔

امین کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

"تو کیا جھک کر تمہیں سلامی دیتا؟ بھئی وہ تھا ہی اجنبی ہمارے لیے۔ نیرش تم بھی کمال کرتی ہو، قسم سے اگر اسی طرح مخبوط الحواسی کا مظاہرہ کرتی رہیں تو ہماری پوری ہمدردیاں اسد بھائی کے ساتھ ہو جائیں گی، کہیں تو موقع محل دیکھ لیا کرو۔"

مہوش کرے کر "ملی شوز" کے پاس منتظر اور پریشان کھڑی سحرش کی طرف پلٹتے ہوئے امین اچھی طرح اس کی خبر لے رہی تھی۔ حالانکہ جانتی تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ تو سدا سے چکنا گھڑا ثابت ہوئی تھی۔

شاپنگ سے لوٹیں تو اچھی خاصی شام ہو چکی تھی۔ امین کو امی نے رات کے کھانے پر روک لیا۔ دو گلیاں چھوڑ کر تو اس کا گھر تھا۔ سارہ پھپھو کو فون پر بتا دیا تھا۔ رات کھانے کے بعد تینوں واک کے لیے نکلیں، خیال تھا ایک دو چکر نزدیکی گلیوں کے لگا کر امین کو گھر بھی چھوڑ دیں گے، اور ساتھ میں واک بھی ہو جائے گی۔

اسی وقت اسد کی سوزوکی پورچ میں رکی۔ سحرش اور امین آگے تھیں۔ نیرش لاؤنج میں ڈیڈی کی آواز پر رک گئی تھی۔ سو اس نے جب بیرونی دروازہ عبور کر کے برآمدے کی سیڑھیاں طے کرنا شروع کیں عین اسی ساعت اسد بھی سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر آ رہے تھے۔ نیرش حسب سابق لاپروائی اور بے دھیانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتے اپنے دھیان میں مگن تھی۔ سو نتیجتاً سیدھا اسد سے جا ٹکرائی۔ اگر انہوں نے پھرتی سے اپنا بازو بڑھا کر حلقے میں نہ لیا ہوتا تو وہ منہ کے بل سیدھا نیچے جا پڑتی۔

"اوہ سوری۔" اس پر نہایت اعلا درجے کی خفت طاری ہو گئی تھی۔

اسد کے لہجے [illegible] قربت نے ایک لمحے کو اس کا پورا وجود جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے سنبھلتے ہی انہوں نے ہاتھ ہٹا لیے تھے، اور [illegible] گئے تھے۔

"تو بالآخر تمہاری لاپروائی رنگ لے ہی آئی۔"

امین نے بڑے لطیف سے انداز میں چھیڑ چھاڑ کا آغاز کیا تھا۔

وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی حجاب کی لپیٹ میں آ گئی۔

"بکواس نہیں کرو۔"

"ادھر قریب کوئی کھمبا نہیں ہے سحرش!" امین کے ہونٹوں پر ہنوز شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔ نیرش بری طرح سے خجل ہو گئی۔

"تم کیا کر رہے ہو بھئی لڑکو۔" راستے میں انہیں جمال اور یاسر مل گئے۔

"مٹر گشت۔" نہایت برجستہ جواب تھا۔

"اچھا۔ ویسے مجھے بھی بڑا اچھا لگتا ہے۔" نیرش نے ان کا جواب سن کر بڑے سہج سے کہا۔

"کیا۔؟" یاسر نے تحیر سے آنکھیں پھیلائیں۔

"یہی۔ مٹر گشت۔" جواب میں نہایت سادگی سے پلکیں جھپکا کر کہا گیا۔

بڑوں کا ارادہ تو یہی تھا کہ ایک دو دن رہ کر واپس آ جائیں گے البتہ باقیوں کے لیے پورے ایک ڈیڑھ ہفتے کا پروگرام بن گیا تھا۔

خدا خدا کر کے ان کی تیاریاں مکمل ہوئیں اور کوچ کا وقت آن پہنچا ہر شخص اسی فکر میں تھا کہ اس کی کوئی چیز رہ نہ جائے کسی کو بھی اپنی تیاری کے مکمل ہونے پر یقین نہیں تھا۔

راستے ہی میں تھک کر نعیمی نے شازمین والا قصہ ازسرنو چھیڑا۔ وہ چاروں باقیوں سے قدرے الگ تھلگ بیٹھی تھیں۔ باقی سب بھی اپنے مزاج اور عمر کے حساب سے جوڑے بنائے خوش گپیوں میں مگن تھے۔ سفر کے لیے خصوصی طور پر ایک بڑی گاڑی بُک کرائی گئی تھی۔

"عفت اور شازمین میں بہت دوستی ہے، شازمین نے اپنی ساری داستان عفت کو سنائی تھی، اور کیا تم یقین کرو گی کہ بقول شازمین کے اس کے خاوند نے شادی کی پہلی رات ہی اسے دھتکار دیا تھا اور اسے چھوا تک نہیں تھا۔"

"کیا۔" ان کی متحیرانہ چیخیں اتنی بلند تھیں کہ امی ڈیڈی اور سب دہل کر پیچھے مڑے تھے۔

"کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا۔ کوئی چھپکلی یا کاکروچ تو نہیں دیکھ لیا۔؟"
جمال نے خواتین کی اجتماعی چیخوں کی ممکنہ وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے نہایت معصومیت سے استفسار کیا تھا۔
"توبہ ہے تم لوگوں سے۔ بھلا اس طرح سنتے ہیں بات؟ ہیں نہیں سنائی بھیا تم لوگ اسی طرح اچھل کود کرتی رہیں تو میرے سوئے ہوئے بچوں کے باجے بجنے لگیں گے۔ آگے کی داستان تو ویسے بھی ناقابل یقین حد تک خوفناک ہے۔" نغمی ان کی چیخ و پکار سے خاصی متوحش ہو گئی تھی۔
"نہیں، نہیں پلیز۔ اب ہم منہ پر تالے ڈالے لیتے ہیں، سمجھو منہ میں زبان ہی نہیں رکھتے۔ وعدہ۔ چلو اب شروع ہو جاؤ۔"
بالآخر ہزار یقین دہانیوں کے بعد وہ دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔
"عفت کو شازمین نے بتایا ـــــ کہ شادی والے دن ہی رضا کا رویہ۔ مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ شادی سے پہلے جس قسم کی بے قراری بے تابی اور وارفتگی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا اب اس کی ہلکی سی جھلک بھی اس کے چہرے پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ذرا سا اہتمام سے تیار ہوتی تھی۔ تو اس کی دیوانگیاں اور نگاہوں کی شوخیاں انتہاؤں کو چھو لیا کرتی تھیں، اور آج جبکہ سارا زمانہ میرے ہوش اڑا دینے والے کافرانہ حسن کی تعریفیں کر رہا تھا تو وہ نظر تک نہ اٹھا رہا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ اس کی تو میرج ہوئی ہے۔ نہ کوئی جذباتی حرکت نہ نگاہوں کی شرارت نہ انداز کی شوخی۔ کچھ بھی تو نہ تھا۔ مجھے وہ پہلے والا رضا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو اتنا پُرجوش، اتنا چلبلا ہوا کرتا تھا۔ اس کے لہجے کی خوبصورت مدھر گمبھیرتا جو مجھے بے خود کر دیا کرتی تھی، آج جانے کہاں جا سوئی تھی۔
ـــــ حجلۂ عروسی میں کتنی ہی دیر میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ اس رات کے لیے ہم نے کتنے ہی منصوبے باندھ رکھے تھے، وہ کس کس طرح ان سہانی ساعتوں کا ذکر کر کر کے مجھے چھیڑا کرتا تھا۔ محظوظ ہوا کرتا تھا۔ کہیں رات کے آخری پہر وہ کمرے میں داخل ہوا اور میرا روپ دیکھتے ہی جیسے آتش زیر پا ہو گیا۔
"یہ کیا تم ابھی تک کارٹون بنی بیٹھی ہو۔ اتارو یہ گنوارو والا لباس۔ سخت برا لگتا ہے مجھے اس طرح سج سنور کر عورتوں کا گھونگھٹ نکالے بیٹھنا۔" کہاں میرا تصور تھا اور کہاں اس کا وہ درشت، سفاک، طنزیہ لہجہ، بیگانہ، اکھڑے اکھڑے خوفناک تیور، میری تو جیسے دنیا ہی لٹ گئی۔ چند لمحوں کو تو جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئی۔
"سنا نہیں ہے تم نے۔ کیا کہہ رہا ہوں میں؟" اس کی گرجدار آواز نے مجھے سر تا پا ہولا کر رکھ دیا۔ لرزتے کانپتے قدموں سے ڈریسنگ روم میں جا کر چینج کیا۔
سر جھکائے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ کمرے میں واپس آئی تو اسے کڑے تیوروں سے گھورتے پا کر روہانسی ہونے لگی۔
"رضا!" دھیرے دھیرے چلتی اس کے قریب آ گئی۔ "کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟ ناراض ہو مجھ سے؟"
میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنائیت کا اظہار کرنا چاہا، مگر دوسرے لمحے ہی اس بری طرح اس نے مجھے دور جھٹکا کہ میں توازن بحال نہ رکھتے ہوئے الٹ کر دوسری طرف جا پڑی۔
"بہ چھچھوری ـــ ادائیں کہیں اور جا کر دکھاؤ۔ تمہیں ماں نے ادائیں تو سکھا دیں کچھ تہذیب بھی سکھا دیتی۔ دور ہٹ کر بات کیا کرو مجھ سے اچھا، اور اپنا یہ منحوس چہرا بھی مت دکھایا کرو مجھے۔ آج تو خیر مہمان ہیں گھر میں۔ کل سے تم دوسرے کمرے میں سویا کرو گی۔ مجھے کراہیت آتی ہے تمہیں دیکھ کر۔"
اُف خدایا۔ آسمان ٹوٹ پڑتا تو بھی مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی، جتنی اس کا سفاک، بے رحم اور تنفر و تحقیر سے پُر رویہ دیکھ کر ہو رہی تھی۔ میرے اعصاب پر جیسے کسی نے بم پھوڑ ڈالا تھا۔ پھر جیسے میری دنیا ہی بدل گئی۔ میں جو اس آس میں بیٹھی تھی کہ اس کا رویہ عارضی ہے جلدی وہ اپنے اصل روپ میں لوٹ آئے گا، مایوسیوں کی دلدل میں گرتی چلی گئی۔ اس کا سلوک بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ رضا کی ایک ہی بہن تھی، شادی شدہ تھی، اور تین بچوں کی ماں تھی، قریبی ٹاؤن میں رہتی تھی، اکثر ہی چلی آتی۔ رضا آرڈر دیتا۔
"میری بہن کی ـــــ خدمت کرو۔ اس کے بچوں کا خاص خیال رکھو۔ دیکھو خبردار جو ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف ہوئی ہو۔"
وہ مجھے بلا جھجک بہن اور بہنوئی کے سامنے لتاڑ کے

رکھ دیتا تھا۔ گھر کی ملازمہ کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ اب گھر کا سارا انتظام و انصرام میرے ذمے تھا۔ میں جس نے گھر میں کبھی تنکا بھی نہ ہلایا تھا۔ جس نے کبھی کچن کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ اب تینوں وقت کا کھانا بھی پکاتی۔ گھر کا جھاڑو پوچھا کرتی۔ گندے برتن دھوتی۔ نند سسر اس کے بچوں کے پسند کے کھانے بناتی، ان کے کپڑے دھوتی، استری کرتی۔ میری نند میری موجودگی میں خود سے آگے بڑھ کر جگ سے گلاس میں پانی ڈالنے کی بھی روادار نہیں ہوتی تھی، اور جو ایسا کر گزرتی تو میری شامت آجاتی۔

"باجی کا ذرا سا کام نہیں کر سکتیں تم؟ اب کیا تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے ہیں جو ان کو تکلیف دے رہی ہو، اتنی سستی ——— اور کام چوری دکھانی ہے تو جا کر ماں کے گھر بیٹھ رہو۔"

میرے ساتھ رضا سمیت اس کی فیملی کا رویہ بالکل نوکروں والا ہوتا تھا۔ میں سب کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔ ان کے برابر بیٹھ کر ان کے فیملی افیئرز میں دخل اندازی نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے ساتھ کسی سیر و تفریح کے پروگرام میں شرکت کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے مہمانوں کے سامنے بطور فیملی ممبر میرا تعارف ہی کروایا جاتا تھا۔ میں جو آزاد فضاؤں کی دلدادہ تھی اب تالے میں بند بیٹھی اپنی قسمت کو رویا کرتی تھی۔ رضا کو مجھ سے اس حد تک بیر ہو گیا تھا۔ کہ بیمار پڑنے پر سنگدلی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہوئے، ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں لے جاتا تھا، جانے سے پہلے بیرونی دروازہ اچھی طرح لاک کر کے جاتا تھا۔ کبھی میں کھڑکی کے پاس کھڑی ہو جاتی تو اور اس کی نظر پڑ جاتی تو گویا طوفان ہی آ جاتا۔ ایسے ایسے انداز میں وہ بہتان بازی اور الزام تراشی کرتا کہ زمین میں زندہ دفن ہو جانے کو جی چاہنے لگتا۔

وہ میرے وجود سے اس حد تک نالاں تھا کہ اپنے کمرے میں نہیں سونے دیتا تھا۔

وہ جو شادی سے پہلے اس حد تک میری قربت کے نشے میں سرشار رہتا تھا کہ سارا سارا دن میرے ہمراہ گزارنے کے باوجود شام کو جب رخصت ہونے لگتی تو دیوانہ وار حسرت سے تکا کرتا تھا، اب دنوں میری شکل پر نظر ڈالنے کا گناہگار نہ ہوتا تھا۔

وہ جو میرے گرویدہ رہتے پر کس کس طرح والہانہ طریقے کر میری قربت کا متلاشی رہا کرتا تھا۔ اب مجھے ہی دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ میرے ہاتھ کے غلطی سے اس کے پر اس سے مس ہو جانے پر یوں مجھے پرے جھٹک دیتا تھا، گویا کسی مکروہ چیز سے چھو گیا ہو۔

شادی کے کوئی تین چار ماہ بعد میری زندگی میں وہ رات آئی جس کی مجھے طلب رہی تھی۔ مگر کس طرح۔

آہ میں سوچتی ہوں، کاش وہ نہ ہی آئی ہوتی۔ اگر شادی اسی کا نام ہے تو میں سب کو یہی کہوں گی کہ کبھی زندگی میں شادی مت کرنا یا کم از کم من چاہے مرد سے ہرگز نہ کرنا۔ اس نے مجھ سے جو سلوک کیا، وہ زبان پر لاتے ہوئے میں پسینوں میں نہا جاتی ہوں۔

میں اس قید میں روز جیتی اور مرتی تھی ممی کا جب فون آتا وہ مجھے میاں کو قابو کرنے اور اس کی دولت جائیداد کو اپنے نام کروانے کے گر بتایا کرتی تھیں۔ انہیں کیا خبر تھی میں یہاں کس بے کسی کے عالم میں زندگی کے دن پورے کر رہی تھی، وہ جسے کبھی کسی نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا آج اسے رضا نے بھری محفل میں کوئی غلطی ہو جانے پر بے دریغ تھپڑ مار دیا تھا۔

جس کے لیے دنیا جہاں کی نعمتیں دسترخوان پر بچھی ہوتی تھیں اور ممی پاپا ہزار لاڈ نخروں کے ساتھ اسے کھلایا کرتے تھے۔ آج اسے نوکروں کی طرح ناپ تول کر بچا کھچا کھانا پلیٹ میں پکڑایا جاتا تھا میں پریگننٹ ہوئی تو بھی اس معمول میں فرق نہ آیا۔ اسی طرح گھر میں جھاڑو پوچھا کرتی۔ کھانا پکاتی۔ کپڑے برتن دھوتی۔ باجی کے بچوں کو پڑھاتی، ان کے لیے نت نئے کھانے بناتی اور پھر اپنے حصے کا بچا کھچا کھا کر صبر و شکر کے گھونٹ پی لیتی، کبھی کبھی تو ان کے ظلم اتنے بڑھ جاتے کہ مجھ سے مرغن کھانے بنوا کر اپنے لیے علیحدہ کرنے کے بعد مجھے اپنے لیے روٹی کے ساتھ ٹماٹر، پیاز اور آلو سے گزارہ کرنے کا آرڈر ملتا۔

جب خوراک کا یہ عالم ہو تو جسم پر فرق پڑنا لازم تھا۔ میں جو گلابوں سے بنی، پھولوں سے لدی ہری بھری شاخ ہوا کرتی تھی، سوکھ کر کانٹا بنتی گئی۔ چہرے کی گلابیاں زردیوں میں بدل گئیں۔ وجود کا گداز ہڈیوں کے ڈھانچے

ممی جی۔ وہ تو تین تین ہزار کے سوٹ پہنا کرتی تھی۔
ایک ہی معمولی سے بدرنگ کپڑوں میں
حسن کی حفاظت نہ کی جائے تو وہ باقی کہاں
مجھے کوئی دیکھ لیتا تو شاید یقین نہ کر پاتا کہ یہ
وہی حسن ہے، جس کی ایک جھلک بڑے بڑے
کے زہد کو پانی بنا دیا کرتی تھی، پریگننسی میں
عورت کو دوہری غذا کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں مجھے
پیٹ بھر کر بھی نہیں پڑتا تھا۔ اور ظلم تو یہ تھا کہ انہوں
نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی کسی ڈاکٹر سے کنسلٹ نہیں
کیا تھا، ڈلیوری کے وقت شاید۔
قسمت کو مجھ پر ترس آ گیا جو ممی امریکہ چلی آئیں۔
ممی اس وقت تک ایمبولینس طلب کر چکی تھیں۔ مجھے
ہاسپٹل لے جایا گیا۔ وہاں آپریشن کے بعد دو جڑواں بچوں
کی پیدائش ہوئی۔ لیکن مجھے جانے کیوں ان سے رتی
بھر انس محسوس نہیں ہوا۔ وہ ان لمحوں کی پیداوار تھے۔
جن کا تصور بھی میرے لیے انتہائی روح فرسا تھا۔
ممی میری حالتِ زار دیکھ کر کچھ اندازہ لگانے کی
کوششوں میں تھیں۔ میں مسلسل ظلم سہتے سہتے تنگ آ چکی
تھی۔ اس قفس سے رہائی چاہتی تھی، سو ڈھکے چھپے
انداز میں ممی کو حقیقتِ حال بتا دی۔ وہ تو سنتے ہی
غضب کے آسمان کو چھو گئیں۔ رضا کو خوب سنائیں۔
جواب میں اس نے بھی کچھ کم نہ کیا۔ ممی نے اس سے
طلاق کا مطالبہ کیا۔ وہ مجھے واپس وطن لے جانا چاہتی تھیں،
رضا نے دونوں بچے اپنے پاس رکھ لیے اور ممی مجھے لے
کر واپس پاکستان آ گئیں۔ انہیں بھی سانپ کے دو سنپولیوں
کو پالنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔
یہاں آ کر میں کتنا عرصہ سائیکاٹرسٹ کے ہاں زیرِ
علاج رہی۔ میرا دماغی توازن الٹ گیا تھا۔ مجھ پر دورے پڑنا
شروع ہو گئے تھے۔ محبت کی یہ شادی میرے لیے آگ کا
طوق ثابت ہوئی تھی۔"

"ناظرین و حاضرین و سامعین! اطلاعاً عرض ہے کہ
ہم لوگ ضلع چکوال سے خوشاب جانے والی سڑک پر
مڑ چکے ہیں۔ یہاں سے وادی کلر کہار ۲۶ کلومیٹر کے
فاصلے پر ہے، اور اس میں سے ہم نصف فاصلہ طے کر
چکے ہیں۔ اور اب سردار قیوم صاحب کے بیان کے مطابق
خوبصورت باغات، فلک بوس پہاڑ، دلکش شفاف چشموں
آبشاروں، سبزہ زاروں، پھولوں سے لدی پگڈنڈیوں،
پرندوں سے بھرے جنگلوں اور قدیم تاریخی مقامات
سے مزین وادی کلر کہار سے قریب تر ہوتے جا رہے
ہیں۔"

یاسر اور جمال کی باآوازِ بلند مشترکہ اناؤنسمنٹ
نے یک لخت مجسموں کی طرح خاموش ایمن، سحرش اور نیرش
کو ہوش کی دنیا میں لا پٹخا تھا۔

"اُف توبہ۔ کتنی دل دہلا دینے والی عبرت ناک
اور دہشت ناک اسٹوری تھی۔" ایمن نے جھرجھری سی لی
تھی۔

"لگتا ہے کسی اور دنیا میں چلے گئے تھے ہم۔ ہائے
ویسے بچاری پر کتنا ظلم ہوا۔" نیرش کے لہجے میں تاسف
تھا۔

"اس پر ہی شاعر کہتا ہے کہ
؎ آ جاؤ گے حالات کی زد میں جو کسی دن
ہو جائے گا معلوم خدا ہے کہ نہیں ہے"

نغمی نے چوں چاں کرتی نیکی کو گود میں لیتے ہوئے
حسبِ معمول برجستگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

ایسے میں وہ لوگ ڈیڈی کی طرف متوجہ ہو گئے جو
یاسر وغیرہ کو کلر کہار کے بارے میں بتا رہے تھے۔

"کلر کہار کا قدیم نام "شاکلہا" تھا۔ البتہ کہیں "کلو کہر"
اور "کلر کہار" بھی بتایا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں ریاست
کشمیر کی سرحد یہیں تک سمجھی جاتی تھی۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم
کے وقت یہ علاقہ قدیم راجگان کشمیر کی سلطنت کا حصہ ہوا
کرتا تھا۔ جب راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ عرب فوجوں کے
ہاتھوں شکست کھا کر بھاگا تو سیدھا راجہ کشمیر کے دربار میں
پناہ گزین ہوا۔ اس راجہ نے اسے کلر کہار کا علاقہ بطور
جاگیر دے دیا تھا۔"

"آپ کو کس نے بتایا ڈیڈی!" نیرش کو کھد بد ہوئی
تھی۔

"بھئی وہ جو سردار صاحب ہیں ناں، بڑے عاشق ہیں
اس وادی کے۔ ان کے پاس ڈھیروں معلومات کا خزانہ
ہے، دو دنوں میں انہوں نے پوری ہسٹری رٹا دی تھی۔
مجھے اور ارباب کو۔"

جب وہ وئی وادی پہنچے تو شام سر پر آچکی تھی تھکن اور بھوک کے باعث کہیں جانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ریسٹ ہاؤس پہنچے غسل کیا کھانا کھایا، اور سب پڑ کر سو گئے۔

تاحدِ نظر ایک وسیع باغ تھا۔ اس کے بیچوں بیچ شفاف پانی کی نہر بہہ رہی تھی۔ نہر کے کنارے کنارے سرو کے درخت قطار کی شکل میں لگے ہوئے تھے، درختوں کی شاخیں پانی کی لہروں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں، کچھ فاصلے پر نہر کے ارد گرد درختوں کی بے تحاشا بہتات تھی۔ پھر اس خوبصورتی سے ناشپاتی، شہتوت، آڑو، خوبانی، جامن، آم، لوکاٹ، اور آلوچے کے باغات نے نہر کو گھیرے میں لے رکھا تھا جیسے نہر کا ان درختوں سے مصافحہ کرنے کا پروگرام ہو۔

نہر کے کنارے لگے ان درختوں پر انگور کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ پھر خوبصورت بل کھاتی لہراتی گاتی نہر کے ارد گرد اور باغ کے وسط میں ارد گرد پھول ہی پھول تھے۔

"اوہ! لگتا ہے جیسے ہم پھولوں کے سمندر میں آگئے ہوں۔" سحرش اس خوابناک اور ارمان پرور ماحول میں کھو کر رہ گئی تھی۔

"اس باغ کا نام "باغِ صفا" برصغیر میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے رکھا تھا۔ وہ ۱۵۱۹ء میں اس مقام سے گزرا تھا۔"

ڈیڈی نے سردار صاحب سے لی گئی معلومات کی پٹاری میں سے چن کر ایک اطلاع فراہم کی۔

فضا میں کوئل، بلبل، مور اور چکوروں کی آوازوں کے ساتھ چھن چھن، شاں شاں کی گونج بھی ایک تواتر سے سماعت میں در آرہی تھی۔

"ڈیڈی یہ کس چیز کی آواز ہے۔" جمال باغ میں لگی ہوئی پھولوں سے لدی ہوئی سرسبز و شاداب کیاریوں کو بغور ملاحظہ کرتا ہوا باپ سے دریافت کر رہا تھا۔

ڈیڈی نے کچھ دیر تک کان لگا کر آواز پر غور کیا پھر ارباب خالو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

"میرا خیال ہے یہ آبشار گرنے کی آواز ہے۔ پہاڑ پر سے آرہی ہے۔" انہوں نے چپلیں اُتار کر پاؤں نہر میں

ٹھنڈے پانی میں ڈالتے ہوئے غور کرنے کے بعد جواب دیا تھا۔

"کچھ تو سحر ہے اس مقام میں جو دنیا بھر سے سیاح کھنچے چلے آتے ہیں۔"

سہیل بھائی نہر کے کنارے کھلے پھولوں کی خوشبو اور مہکار اپنے اندر سمیٹتے ہوئے توصیفی انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

سبزے کا رنگ اس قدر گہرا تھا جیسا کہ زمرد کا ہوتا ہے، اوپر پہاڑ سے یاسر وغیرہ اُتر کر نیچے آئے تو انہوں نے بڑی صراحت سے اس کا ذکر کیا۔

"انکل! اوپر سے دیکھنے پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے باغ میں زمرد کے رنگ کا چمک دار قالین بچھا ہوا ہو اور پتا ہے اوپر پہاڑ پر ایک چشمہ بھی ہے، بہت بڑا، ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس بھی ہے ادھر۔ وہاں سے نیچے اُترنے کے لیے بڑی خوبصورت سی ڈھلوانی دیوار نما گزرگاہ ہے۔"

یاسر بولے جوش و خروش سے بتا رہا تھا حاضرین میں سے کئی ایک مچل اُٹھے اوپر جانے کے لیے۔

"ارے بھئی، پہلے کچھ کھا پی لو پھر چلتے ہیں اکٹھے۔" ڈیڈی اور ارباب خالو کہتے رہ گئے، مگر وہ کہاں سننے والے تھے۔

"بھئی، اتنا چل پھر کر اب اوپر چڑھنا اپنے بس میں نہیں ہے۔"

نغمی نے تو صاف انکار کر دیا۔ سحرش کو بھوک نے ستایا ہوا تھا۔ مہوش پھولوں کی ازلی دیوانی تھی، وہ تو آکر کیاریوں میں ایسی گھسی بیٹھی تھی، کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تھی، سہیل بھائی بچارے روتے ہوئے بچی کو چپ کرانے کے جتن کر رہے تھے، بزرگ خواتین میں سے کسی کو بھی اس وقت خجل خوار ہونے کا شوق نہیں تھا۔ یاسر اور جمال خوب اچھی طرح نظارہ لوٹ کر واپس آئے تھے۔

سو بے قرار ہو کر اٹھنے والے قافلے میں امین، تیرش اور طلحہ شامل تھے، طلحہ نے ساتھ کے لیے اسد کو بھی گھسیٹ لیا۔

اونچائی سے باغ کا نظارہ نہایت دلفریب تھا۔ پھولوں کے ارغوانی، زرد، سفید، گلابی تختے مل کر کسی

خوبصورت برف سے ڈھکی عمارتیں، ملائم وسیع و عریض قالین کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے لگے درخت سب کچھ اس قدر دلکش لگ رہے تھے کہ بیان سے باہر تھا۔

اسد اور طلحہ حسبِ معمول سیاست اور اقتصادیات کے مختلف موضوعات پر نہایت لگن سے سیر حاصل تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ وہ دونوں ان سے قدرے ہٹ کر چلتے ہوئے محویت سے اردگرد کے روح پرور نظارے دیکھتے ہوئے تبصرہ کرنے میں مگن تھیں۔ معاً نیرش کی نظر سامنے ریسٹ ہاؤس سے نکلنے پر پڑی۔ وہ نشیب کی طرف جا رہا تھا جہاں اس کی جیپ کھڑی تھی۔

"امین! امین۔" اس نے ساتھ چلتی امین کا بازو شدتِ جوش سے دبا کر متوجہ کیا۔ "وہ دیکھو۔ وہی آدمی۔"

"کون کہاں؟" امین اس ناگہانی افتاد کے ٹوٹنے پر چونک پڑی تھی۔

"ارے وہی مشکوک شخص۔ سبز آنکھوں اور گوری رنگت والا لمبا سا خوبصورت مرد، وہ جو اس دن سپر مارکیٹ میں نظر آیا تھا بک اسٹال پر۔ وہ دیکھو جا رہا ہے نیچے کی طرف۔"

نیرش کے دبے دبے لہجے میں محسوس کیا جانے والا جوش و خروش تھا۔ امین نے نیرش کی نظروں کے تعاقب میں ادھر دیکھا۔

"ارے ہاں۔ یہ تو وہی ہے مگر یہ ادھر کدھر۔" امین کی آنکھوں میں بھی الجھن در آئی۔ "یہ تو واقعی خاصی مشکوک بات ہے۔"

"اور جب میں کہتی تھی تب؟" اپر ہینڈ ملتے ہی نیرش تیز ہو گئی تھی۔

اس وقت ایک انہونی بات ہوئی۔ اس شخص کو شاید ان کی نظروں کے تعاقب کا احساس ہو گیا تھا۔ دفعتاً اس نے پلٹ کر دیکھا۔ انہیں دیکھ کر ایک لمحے کو وہ ٹھٹکا تھا۔ پھر سر جھٹک کر دوبارہ آگے بڑھ گیا۔ وہ سُن سی ہو کر رہ گئیں۔

"نیرا۔! جانے کون ہو گا یہ۔ اس کے ٹھٹکنے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہمیں پہچان چکا ہے۔"

امین کے لہجے میں پریشانی تھی۔ اسد اور طلحہ وغیرہ ادھر چشمے کے پاس ہی رک گئے تھے۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارے ساتھ اتنے سارے لوگ ہیں۔ چلو آؤ چلیں واپس۔"

وہ ننھے ننھے کومل ہاتھ بڑی محویت سے چنبیلی، موتیے اور نسترن کے پھول چن رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں نسترن کے زرد پھولوں کا گچھا تھا جسے وہ اپنے ہم عمر دوسرے بچے کو دکھا کر کہہ رہا تھا۔

"بھائی! یہ نسترن کے پھول ہیں، مگر وہ کچھ اور بھی تو ہیں یلو کلر کے پھول۔ ان کا کیا نام ہو سکتا ہے؟"

"پاپا نے بتایا تھا، انہیں "جعفری" کہتے ہیں۔ وہ دیکھو شانی لالہ کے پھول کتنے زیادہ ہیں یہاں۔ یہاں تو ہر طرف فلاور بیڈز ہی نظر آ رہی ہیں۔ کتنے زیادہ پھول ہیں ناں اتنے تو ہم نے کہیں بھی نہیں دیکھے۔"

"کہیں یہ پھولوں کا دیس تو نہیں ہے مانی۔"

شانی نے کچھ سوچتی ہوئی نظروں سے مانی کو دیکھتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

"ہاں ہو بھی سکتا ہے۔ اور نہیں بھی ہو سکتا۔ پاپا ہی صحیح بتا سکتے ہیں اس بارے میں۔" شانی نے کندھے اچکائے تھے۔

"پاپا بتا رہے تھے، گلِ داؤدی کے پھول بھی یہاں ہوتے ہیں، وائٹ کلر کے، وہ تو نظر نہیں آ رہے۔" مانی ادھر ادھر کیاریوں میں نظروں سے کھوج رہا تھا۔

"اس لیے کہ وہ رات کے وقت کھلتے ہیں۔" نیرش جو بڑی دیر سے ان کی گفتگو اور حرکات و سکنات نوٹ کر رہی تھی۔ بالآخر ان کی باتوں میں کود پڑی۔

دونوں چونک کر اس کی سمت پلٹے اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ نیرش کو یہ دیکھ کر بڑی خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ بچے خلافِ امید گھبرائے، بوکھلائے ہرگز نہیں تھے۔ بڑے سکون اور وقار سے کھڑے تھے حالانکہ عمر میں ان کی یہی کوئی چار ساڑھے چار سال کی ہوں گی۔

"تم لوگ کون ہو اتنے خوبصورت اور ننھے اور پیارے فرشتو، مقامی لوگوں میں سے تو نہیں لگتے ہو۔"

وہ بڑی بے تکلفی سے ان کے گال چھوتے ہوئے مخاطب ہوئی تھی۔

"ہم لوگ چھٹیاں گزارنے یہاں آئے ہیں۔ ویسے تو ہم

باہر رہتے ہیں نیو یارک میں۔ یہاں پاپا کو ایک کام تھا پاکستان اور
میں وہ ہمیں بھی ساتھ لے آئے۔ اب جب تک پاپا کا کام
ختم نہیں ہوتا ہم یہیں رہیں گے۔ ہمارا یہاں بڑا سا گھر ہے ادھر
گاؤں کے پاس۔ مگر آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہی ہیں۔"
ثانی نے تفصیل بتانے کے بعد نہایت سنجیدگی سے اس
سے دریافت کیا تھا۔

"میں کون ہوں؟" اس نے اپنی طرف انگلی کر کے جیسے خود
سے پوچھا۔

"بھئی میرا نام نیرش ہے اور میں اپنی فیملی کے ساتھ کچھ
عرصے کے لیے یہاں آؤٹنگ پر آئی ہوں۔ اور اب سمجھو کہ تمہاری
دوست ہوں ٹھیک؟" اس نے دوستی پکی کرنے کے لیے دونوں
سے ہاتھ ملائے۔

"تمہاری ممی ساتھ نہیں آئیں؟"

"نہیں۔ وہ تو اللہ کے پاس ہوتی ہیں۔" ثانی نے نہایت
سلوگی سے جواب دیا۔

نیرش چند ساعت کو دیکھتی رہ گئی، پھر دونوں کو اپنے
بازوؤں کے گھیرے میں لے کر پیار کرنے لگی۔

"چلو، کوئی بات نہیں۔ بہ لو گڈ بوائے۔ اچھا یہ تو بتاؤ
باہر رہنے کے باوجود تم لوگوں کی اردو اچھی خاصی پختہ ہے۔
یہ کیسے؟"

"پاپا اور تانیہ پھپھو نے سکھائی تھی۔ وہ کہتے ہیں آفٹر
آل ہم تو تھی پاکستانی بچے ہیں۔" مانی نے سینہ پھلا کر جواب
دیا۔

نیرش بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر تینوں مل کر نہر کے
کنارے لگے پھولوں کو اکٹھے کر کے پانی کی لہروں کے حوالے
کرنے کا کھیل کھیلنے لگے۔

آج ان کا "کلر کہار" جھیل دیکھنے کا پروگرام تھا۔
جس کے لیے سردار صاحب نے کوئی گز بھر کے تعریفوں کے
تھان لپیٹے تھے۔ بقول ان کے وادی کی خوبصورتی کا منبع
"کلر کہار جھیل" ہے۔

شیشے کی طرح شفاف چمکتی دمکتی جھیل ایک کنارے
سے دوسرے کنارے تک تقریباً ڈھائی کلومیٹر رقبے پر پھیلی
ہوئی تھی۔ جھیل کے جنوبی کنارے پر جدید طرز کا ایک اسنیک بار
کھلا ہوا تھا جس کے پہلو میں چھوٹا سا خوبصورت پارک تھا۔
جھیل کی سب سے منفرد چیز اس کے تین چوتھائی حصے
پر مشتمل اینٹوں اور پتھروں سے تعمیر شدہ انگریزی حروف
"T" کی شکل کا راستہ تھا جو اسنیک بار سے شروع ہوتا تھا۔
یہ راستہ جھیل کے اندر پانی میں بنا دیا گیا تھا جس پہ لوگ
لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر جھیل کی سیر کا لطف اٹھانے کے
اسنیک بار سے کولڈ ڈرنکس اور برگر وغیرہ کا وافر
ذخیرہ جمع کرنے کے بعد وہ لوگ سیدھا "T" کی شکل میں بنے
اس پختہ راستے کی سمت آگئے۔ راستے کے دونوں اطراف
لگی رنگ برنگی لائٹس نے راستے کو گویا کہکشاں بنا ڈالا تھا۔

"اچھا اب سمجھا ہیں کہ سردار صاحب نے جھیل کی سیر
کے لیے سر شام آنے کو کیوں کہا تھا۔"

ارباب خالو نے اردگرد کی خوبصورتیوں کو آنکھوں میں
سمیٹتے ہوئے تفہیمی انداز میں سر ہلایا تھا۔ شام پڑنے کے
باعث ساری لائٹس آن کر دی گئی تھیں۔ ان روشنیوں
کا عکس رستے اور جھیل کے پانی پر بڑی دلفریب رنگینیاں
پیدا کر رہا تھا۔ اور جھیل کے اوپر اڑتے ہوئے پرندوں
کی چہچہاہٹ نے ماحول کے طلسم کو مزید دو آتشہ کر دیا تھا۔

"قسم سے میرا تو دل چاہ رہا ہے یہیں کہیں جھیل کنارے
کٹیا بنا کر پڑا رہوں ہمیشہ کے لیے۔ علامہ اقبال نے بھی ایسے
ہی حسین مناظر سے مسحور ہو کر اپنی نظم "ایک آرزو" تخلیق
کی ہو گی۔"

سہیل بھائی مدہوشی کے سے انداز میں کہہ رہے تھے۔
وہ لوگ اب کشتیوں میں سوار ہو کر اردگرد کے کیف پرور
نظاروں کا لطف لے رہے تھے۔

کشتی کی خوب ساری سیر کے بعد جب وہ لوگ اتر کر
اسی "T" ٹیپ کے ذریعے سے گزر کر اسنیک بار میں آئے تو
نیرش کو ایک بار پھر حیرت کا دورہ پڑا۔ لیکن یہ حیرت اس
نے اپنے تک ہی محدود رکھی کہ ساتھ میں سبھی بیٹھے تھے۔
البتہ موقع پا کر امین کے پاس پہنچ کر دبے دبے انداز میں
اسے مطلع کیا۔

"امین وہی شخص اسنیک بار میں موجود ہے اور حیرت انگیز
بات یہ ہے کہ وہ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ ہیں کہیں
یہ ان بچوں کو اغوا کر کے تو نہیں لے جا رہا۔"

نیرش اس شخص کو بچوں کو کولڈ ڈرنکس پکڑاتے دیکھ
کر سرگوشی کے انداز میں امین سے بات کر رہی تھی۔

"مگر آثار تو ایسے نہیں لگتے۔" امین نے بھی چپکے سے جواب

رہا تھا۔

"پاپا! میں سپرائٹ نہیں لیتا۔" اسی لمحے شانی کی آواز ان کے کان میں پڑی۔

"اوہ سوری بیٹا! میرے ذہن سے ہی نکل گیا، ٹھہریں آپ کے لیے پیپسی منگواتا ہوں۔"

"ہائیں۔" امین اور نیرش کی متعجب نظریں بے یقینی کے عالم میں ایک دوسرے سے الجھ گئیں، وہ یتوان کے پاپا ہیں، مگر اتنے پیارے مزاج کے خوش خلق، بچوں کا ایسا درشت مزاج باپ۔" نیرش کو اس کا خاصا قلق ہوا تھا۔

"ہوسکتا ہے بظاہر جیسا نظر آتا ہے اندر سے ایسا نہ ہو۔ ہماری کون سی اس سے دوبدو بات ہوئی ہے۔"

"ہاں، یہ بھی ہوسکتا ہے۔" نیرش امین کے خیال سے متفق ہوگئی تھی۔

اس وقت وہ پہاڑ کی چوٹی پر بنے بابا سخی باہوؒ کے مزار کی زیارت کر رہے تھے، اور بھی بہت سے لوگ زیارت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ پوری فیملی کے ہمراہ یہ ان کا آخری تفریحی پروگرام تھا۔ کیونکہ شام کو ڈیڈی، ارباب خالو، شاہ بانو آنٹی اور زیب خالہ کا کوچ کا ارادہ تھا۔ سہیل بھائی، اسد اور طلحہ کا پروگرام بھی بن گیا تھا جانے کا، ان تینوں کا پروگرام یہ تھا کہ ایک آدھ ہفتے بعد اپنے کام وغیرہ دیکھ کر دوبارہ آجائیں گے، اس دوران باقی لوگ اچھی طرح سے انجوائے کرلیں گے۔

پورے مزار پر شیشے کا کام اس قدر خوبصورتی اور مہارت سے کیا گیا تھا کہ دور سے ہی جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دیتا تھا۔ دربار پر موروں اور کبوتروں کی بہت بڑی تعداد جمع تھی، کبوتروں کے جھرمٹ نے گویا پورے دربار پر سایہ کیا ہوا تھا۔ مور دربار پر حاضری دینے کے سے انداز میں اپنے دیدہ زیب پنکھ پھیلائے رقص کر رہے تھے۔

نیرش کی بے ارادہ اٹھتی نظر ایک بار پھر ساکت ہو کر رہ گئی۔ کچھ فاصلے پر کونے میں شانی اور مانی نہایت انہماک سے موروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔

نیرش نے نظر بچا کر ادھر ادھر دیکھا۔ بزرگ حضرات دربار کے اندر تھے، اور باقی لوگ متوجہ نہیں تھے۔ وہ آہستگی سے ان کی طرف کھسک آئی۔

"ہیلو۔" اس کے متوجہ کرنے پر وہ دونوں پلٹے اور پھر اس کو دیکھ کر ایک دوستانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے باری باری ہاتھ ملانے لگے۔

"کیسی ہیں آپ آنٹی! ہم نے اس دن کے بعد آپ کو کافی تلاش کیا، ہمیں پتا نہیں تھا کہ آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔"

"میں نے آپ کو دیکھا تھا لوہر جھیل کنارے اسٹیک بار میں، شاید ساتھ میں آپ کے پاپا تھے۔"

"آپ نے دیکھ لیا تھا تو آئیں کیوں نہیں؟" مانی کو خاصا ملال ہوا۔

"میرے ساتھ اور بھی کافی لوگ تھے چندا!" اس نے اس کے گال تھپتھپائے۔

"چلیں بیٹا!" اسی لمحے وہی بھاری گمبھیر آواز کان پڑی، وہ پلٹی۔ اور چند ثانیے کو گھڑی کی گھڑی رہ گئی۔

"آپ — میں نے آپ کو دو تین جگہ دیکھا ہے۔" وہ دیکھتا ہوا دماغ پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انداز میں خاصی شائستگی تھی، جس نے نیرش کو کچھ چونکا دیا۔

"پاپا! یہ ہماری فرینڈز ہیں نیرش آنٹی۔ اپنی فیملی کے ساتھ یہاں آؤٹنگ پہ آئی ہوئی ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔ اور آنٹی! یہ ہمارے پاپا ہیں ان کا نام آفندی ہے۔" شانی نے فوراً ہی تعارف کے تمام مراحل طے کر لیے تھے۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ شانی اور مانی اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں۔" آفندی کے انداز میں خاصی مروت تھی۔ نیرش حیران تو ہوئی، پھر امین کی بات یاد آئی کہ ہوسکتا ہے ایسا نہ ہو جیسا نظر آتا ہے۔

"ہاں یہی بات ہوگی۔" اس نے امین کے تجزیے پر اتفاق کر ہی لیا۔

"بہت پیارے بچے ہیں آپ کے ماشاء اللہ۔" وہ دونوں کے گال چھوتے ہوئے بے اختیاری کی سی کیفیت میں انہیں پیار کر رہی تھی۔

"آپ آئیے ناں کبھی غریب خانے پر۔" آفندی نے دعوت دی تھی۔

"ضرور جی — اب اجازت پھر ملاقات ہوگی۔"

شانی مامی کو الوداعی پیار کر کے وہ امین لوگوں کی طرف لوٹ آئی تھی۔ شام کو ڈنڈی وغیرہ کا دلچسپ پروگرام تھا۔ ساتھ ہی باقی رہ جانے والوں کو بھی لے لیا۔
"تم لوگوں کو ایک خاص مقام دکھانا ہے، اکثر کہیں کی رومان پرور سرزمین کی لوک کہانی کے کچھ آثار ہیں راستے میں۔" ارباب خالو نے گاڑی گاؤں کے جنوب میں بالکل پولیس اسٹیشن کے سامنے جا کر روکی تھی۔ جہاں ٹھنڈے پانی کی نہر کے کنارے ایک مزار تھا۔ مزار کے ساتھ سرگودھا جانے والی سڑک گزرتی تھی۔
"یہ ملکہ شمس رانی کا مزار ہے۔ ڈھول بادشاہ کا مزار یہاں سے تقریباً آٹھ کلومیٹر دور موضع گفالوالہ میں واقع ہے۔"
"لیکن یہ دونوں موصوف کون ہیں خالو جان۔" اسد کی الجھن بھری آواز نے گویا سب کے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔
"ملکہ شمس رانی اور ڈھول بادشاہ قدیم لوک کہانی کے دو کردار ہیں۔ مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ دونوں جب ایک طویل جدائی کے بعد ملے تو فقیری اختیار کر لی اور نگر نگر پھرنے لگے۔ ڈھول بادشاہ نے اپنا سارا اقتدار، دولت اور مال اسباب چھوڑ دیا تھا۔ اور شمس رانی نے محلوں کی پرتعیش زندگی کو ٹھوکر مار کر درویشی اختیار کر لی تھی۔"
"کتنی عجیب سی بات لگتی ہے۔" نیرش نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔
"جہاں عشق سچا ہو، جذبے کھرے ہوں، دل صاف ہوں، وہاں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوا کرتا۔" اسد کے ٹھہرے ہوئے انداز میں بڑی رسانیت اور سنجیدگی تھی۔
"ہائیں یہ ڈائیلاگ آپ نے ہی جھاڑا ہے ناں۔" اسد کے منہ سے خلافِ مزاج بات سن کر سہیل بھائی اچھے خاصے ورطۂ حیرت میں پڑ گئے تھے۔
"اپنے دلی جذبات کی ترجمانی تو نہیں کر رہے؟" امین نے بھی چھیڑ خانی میں شمولیت کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ بزرگ پارٹی کچھ فاصلے پر آئندہ کے پروگرام سیٹ کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اسد نظریں پھرا کر سامنے آتے ہوئے موضوع کسی اور سمت لے گئے تھے، نیرش نے سا منہ بنایا۔

"ان سے کبھی ذرا لگاوٹ کی بات سننے میں نہیں آئی پھر بھی — ان سے کچھ نرم دل ہی ہوتے ہوں گے۔"
"ارے نہیں بھئی، میرے بھائی کا دل بڑا خوبصورت ہے اندر سے، بس مزاج کچھ سادہ اور سنجیدہ ہے۔" امین نے فوراً سے پیشتر نیرش کی دلگرفتگی اور رنجیدگی ختم کرنے کے لیے پیش بندی کی تھی۔
"ہاں ان کی طبیعت کی سادگی تو میوزیم میں رکھنے کے قابل ہے۔" وہ جل ہی تو گئی تھی۔
جانے والے بھی رخصت ہو گئے تھے اور اب وہ لوگ واپس ریسٹ ہاؤس لوٹ آئے تھے۔
"مجھے تو لگتا ہے ساری عمر انہیں میرے وجود کا احساس نہیں ہوگا۔ ایسے ہی رہیں گے بیگانے سے اجنبی سے۔" آج اسے کچھ زیادہ ہی احساس ہو رہا تھا۔ اسد کے روکھے پھیکے عام سے رویوں کا ورنہ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتی کہ اسد تو شروع سے ہی ایسے تھے اپنی پڑھائی اور سنجیدگی کے حصار میں لپٹے۔
"نہیں شاید اس لیے بھی زیادہ محسوس ہو رہا ہے کہ اتنے خوبصورت اور رومان پرور ماحول میں بھی ان کے مزاج کی برف نہیں پگھلی۔" امین نے بڑا جاندار تجزیہ کیا تھا اس کی پژمردگی کا۔
"خیر میری بلا سے۔" اس نے تنک کر کندھے اچکاتے ہوئے واش روم کا رخ کیا تھا۔
بابا سخی باہو کے مزار کے بعد اکثر ہی اس کا شانی مامی اور آفندی سے ٹاکرا ہونے لگا۔ ریسٹ ہاؤس میں نچلا بیٹھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ یاسر اور جمال تو صبح سے کھا پی کر لمبے چوڑے پروگرام بنا کر نکل لیتے، سارہ پھپھو اور امی — اِدھر اُدھر گاؤں کی عورتوں سے باتوں میں لگ جاتیں۔ پنکی کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی سو نغمی ریسٹ ہاؤس میں ہی رہتی تھی۔ سحرش اس کے ساتھ مدد کے لیے موجود رہتی یوں بھی وہ گھومنے پھرنے کی اتنی شوقین نہیں تھی۔ البتہ امین اور نیرش خوب خوب جنگل خوار ہوتیں، امین تو کبھی سست پڑ کر بیٹھ رہتی۔ مگر نیرش کو گھر میں ٹکنا نہیں آتا تھا۔
اکثر کسی نہ کسی جگہ ان لوگوں سے ٹاکرا ہو جاتا۔ شانی مامی کے اصرار پر ایک بار وہ ان لوگوں کے گھر بھی گئی۔ دونوں

بچوں کے توسط سے اس کے اور آفندی کے درمیان
حائل تکلف کی دیوار بھی کافی سے زیادہ گر چکی تھی۔
وہ ششدر تو اس دن رہ گئی، جب آفندی نے
اسے اندر کی بات بتائی۔
"میں نے بچوں کے ساتھ جھوٹ بول رکھا ہے
کہ ان کی ماں مر چکی ہے۔ وہ مری نہیں ہے۔ بلکہ زندہ
ہے۔ اور میں اس کی موت برداشت بھی نہیں کر سکتا۔
میں اسے زندہ رہ کر موت کی دعائیں مانگتے دیکھنا
چاہتا ہوں، جس طرح اس نے مجھے لمحہ لمحہ موت دی
ہے۔ میرے اعتماد، میری غیرت اور میری محبت کا خون
کیا ہے۔ اسی طرح میں بھی اسے سسک سسک کر مردوں
سے بدتر زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"
بہت سفاک لہجہ تھا اس کا۔ نیرش کی رگوں میں
دہشت آمیز سنسنی سی دوڑ گئی۔ اسے آفندی کے لہجے
میں کچے خون کی بو محسوس ہو رہی تھی۔
"اس نے آپ کے ساتھ کیا کیا تھا آفندی؟"
اس نے ڈرتے ڈرتے اس کے سرخ وحشت زدہ
چہرے کو دیکھا۔ اس کی سبز آنکھوں کے سرخ ڈورے
اس کی بے رحمانہ سوچ کے عکاس نظر آ رہے تھے۔
"اس بیچ فطرت عورت نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے
ساتھ فریب کا ڈراما رچایا۔ مجھے جھوٹی محبت کے جال
میں پھنسایا۔ یہ خبر نہ ہونے دی۔ وہ جھوٹی ہو چکی تھی۔
میری سیدھی سچی محبت کے قابل نہ تھی۔ بے وفائی اس
کی خو بو میں شامل تھی، سو اس نے کی۔ میں اسے دل سے
اور اپنی زندگی سے نکال چکا ہوں مگر بطور سزا اسے
اپنے سامنے عبرتناک انجام سے دوچار ہوتے دیکھنا
چاہتا ہوں، اسی لیے اسے ڈھونڈنے پاکستان آیا ہوں۔"
اس کے شعلہ ساماں لہجے میں انتقام کی چنگاریاں
بھڑک رہی تھیں۔ نیرش خاموش سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے
بھی اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا۔ پھر بات بدلتے
ہوئے نرمی سے مسکرایا۔
"اوہ آئی ایم سوری میں نے آپ کو پریشان کر
دیا۔ چلیں کوئی اور بات کرتے ہیں۔ میرے بچوں پر
تو جانے آپ نے کیا جادو کر ڈالا ہے ہر وقت آپ
کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اتنا مس تو کبھی انہوں نے مجھے
بھی نہیں کیا ہوگا۔ جتنا آپ کی غیر موجودگی میں آپ
کو کرتے ہیں۔ بہت عادی ہو چلے ہیں آپ کے۔"
"میرا بھی ان کے بغیر دل نہیں لگتا۔" وہ دونوں کو
بازوؤں کے حصار میں لے کر پیار کرنے لگی تھی بھلے
کیا کشش تھی ان بچوں میں کہ اسے سب کچھ بھول جاتا
تھا۔
آفندی کا دکھ سن کر اس کے دل میں اس کے
لیے بہت سی ہمدردی جمع ہو گئی تھی۔ بیچارہ عورت کا
ڈسا ہوا تھا۔ ہزار رنگ ہوتے ہیں، سیدھی سادی زندگی
کے بھی۔ کہیں عورت پر غیر انسانی ظلم کی داستانیں عبرت
جگا دیتی ہیں اور کہیں مرد مظلومیت کی قطار میں آ کھڑا
ہوتا ہے۔

"اس جگہ کو تخت بابری کہا جاتا ہے۔ یہاں کھڑے
ہو کر شہنشاہ بابر نے اپنی فوج سے خطاب کیا تھا۔" آفندی
بتا رہا تھا۔ تخت کو چاروں اطراف سے چینٹل کے پودے
کی فوارے کی مانند پھیلی شاخوں نے گھیر رکھا تھا۔
"آپ بھی ڈیڈی کی طرح معلومات فراہم کرنے کے
بڑے شوقین دکھائی دیتے ہیں۔" نیرش ہنس پڑی تھی۔
وہ اس وقت باغ میں پھر رہے تھے۔
"میں آپ لوگوں کی فیملی سے ملا تو نہیں البتہ آپ
لوگوں کو اکثر انجوائے کرتے خاص جگہوں پر دیکھا ہے۔
مجھے بڑی اچھی لگی یہ بات، چھوٹے بڑے، بزرگ بچے
سب مل کر محبتوں کی ڈور میں بندھے ایک دوسرے کی
سنگت میں فطرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز
ہو رہے ہوں تو لگتا ہے جنت گویا زمین پر اتر آئی ہو۔
مجھے تو حسرت ہو رہی ہے ایسی فیملی میں رہنے بسنے کی۔"
"مل کر چلنے سے بہت سے مسائل غیر محسوس طریقے سے
حل ہوتے جاتے ہیں۔ اکیلا انسان بھلا کتنی دور چل
سکتا ہے شاہراہ زندگی پر۔"
اس کی بات پر آفندی نے چونک کر اسے دیکھا
اور پھر کتنی ہی دیر دیکھتا رہا۔ ان سبز آنکھوں میں اپنے
لیے چمک اور نرمی کا احساس تو بہت پہلے نیرش کو
ہو چکا تھا اور وہ بڑی خوبصورتی سے گریز برتتی رہی
تھی، مگر اب اسے لگتا تھا۔ آفندی کی آنکھوں کے
خاموش جذبے مچلتے بھڑکتے وارفتہ شعلوں میں بدل
کر شور مچانے لگ پڑے ہیں۔ اور وہ اس حدت آمیز

شور سے بہت خائف رہی تھی۔

"نیرش! کیا کوئی ایسا بھی ہوگا جو میرے ساتھ مل کر چلنے کا حوصلہ رکھتا ہوگا۔ کیا کوئی ایسا نہیں مل سکتا ہے؟"

وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے سوال کر رہا تھا۔

"کیوں نہیں۔ بہت سے ایسے مل جائیں گے۔"

اپنی گھبراہٹ اور حواس باختگی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے نظریں کترا کر آہستگی سے جواب دیا تھا۔

آگے بڑھ کر جرائت رندانہ سے کام لیتے ہوئے اس نے اس کے کومل ہاتھوں کو نرمی سے اپنے مضبوط ہاتھوں کی پناہ میں لیتے ہوئے سوال کیا تھا۔

نیرش سر تا پا جھنجھنا اٹھی۔ ہاتھ خوفزدہ ہو کر یوں کھینچے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

"تم نے جواب نہیں دیا نیرش۔ کیا میں سمجھوں کہ تمہیں میری جسارت ناگوار گزری ہے۔ یا شاید دو بچوں کا باپ ہونے کی وجہ سے؟"

"پلیز آفندی!" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ بولنے سے روک دیا۔

"آپ جانتے ہیں آن بچوں کے مضبوط حوالے سے پہلے آپ میرے لیے ایک مشکوک اجنبی کے سوا کچھ بھی نہیں تھے۔"

"مجھے پتا ہے نیرش! تم جس طرح میرے بچوں پر جان دیتی ہو۔ میرا خیال رکھتی ہو اس طرح کوئی بھی نہیں بے غرضی سے کرتا۔ آج کے دور میں کس کو فرصت ہے کہ رک کر کسی کی خواہشات کسی کی ضروریات کا کھوج لگاتا پھرے۔ بڑی بے رحم ہو گئی ہے یہ دنیا۔"

شام دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیوں سے وادی کے دامن میں پھیلے باغات پر اترتی چلی آ رہی تھی، نہر کے پانی میں ڈھلتے سورج کی نارنجی قرمزی کرنیں عجب بہار دکھا رہی تھیں، پھولوں کی دلفریب مہک نے اور اردگرد کے "باغِ صفا" کے دلکش مناظر نے طلسماتی فضا کو کچھ اور کشش آمیز بنا دیا تھا۔

"مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہے نیرش کہ میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔ مجھے تمہاری ذات کی کشش نے اسیر کر ڈالا ہے نیرش! مغرب کی آزاد کھلی فضاؤں میں پلنے والے بندوں کے ساتھ یہ بڑی مصیبت ہوتی ہے کہ ان میں مصلحت کوشی اور گریز پائی کی خو نہیں ہوتی۔ وہ تو بے باک کھرے انداز میں کہہ گزرتے ہیں۔" اپنے سے محض چند منٹ دور کھڑے آفندی کی نگاہوں کے وارفتہ شرارے اس کی ساری ہمتوں کو ریزہ ریزہ کیے جا رہے تھے، اس کے بے باک لہجے کی گرمی اور شوق نے نیرش کو حجاب کے حصار میں لپٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تم نے مجھے زندگی کے ایک انوکھے سرور سے آشنا کرایا ہے نیرش۔"

اور نیرش کے اندر کہیں عجیب سی یاسیت برسنے لگی۔ اس کے اندر بہت مختلف قسم کے جذبے سر ابھارنے لگے۔ جذبات کے ان پہلوؤں کے متعلق اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسے اپنی یہ کیفیت بڑی عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے اندر کے اس خلا اور تشنگی سے اس سے پہلے وہ کبھی دوچار نہیں ہوئی تھی۔ آفندی نہایت والہانہ انداز میں آسے تک رہا تھا۔

"یہ حسین شام ابھی
ابھی جس میں گھل رہی ہے
تیرے پیرہن کی خوشبو
ابھی جس میں کھل رہے ہیں
مرے خواب کے شگوفے
ذرا دیر کا ہے منظر
ذرا دیر میں افق پر
کھلے گا کوئی ستارہ
تری سمت دیکھ کر وہ
کرے گا کوئی اشارہ
تیرے دل کو آئے گا پھر
کسی یاد کا بلاوا
کوئی قصۂ جدائی"

کوئی کار نا مکمل
کوئی خواب نا شگفتہ
کوئی بات کہنے والی
کسی اور آدمی سے
ہمیں چاہیے تھا ملنا
کسی عہد مہرباں میں
کسی خواب کے یقیں میں
کسی اور آسماں پر
کسی اور سرزمیں میں

"اُف اللہ۔ ہائے اماں جی۔ اتنا درد ہو رہا ہے اور کسی کو کچھ خیال ہی نہیں ہے۔ اگر انتقال ہو گیا تو یہیں کہیں میرا بھی مزار بن جائے گا ہائے اللہ میاں جی۔"

وہ پاؤں پکڑے واویلا مچا رہی تھی۔

"کس نے کہا تھا لوکاٹ کے درخت پر چڑھنے کو۔ خبر بھی ہے اس کی شاخیں کتنی نازک ہوتی ہیں۔ ایک تو تمہارے اوٹ پٹانگ شوق اور بے وقوفانہ حرکتوں کا کوئی جواب نہیں ملتا" نغمی زخم صاف کرتی ہوئی ساتھ میں ڈانٹ ڈپٹ بھی کر رہی تھی۔

نہر کے کنارے کے درخت سے گر کر چوٹ کھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے دن کے لیے اسے بستر کا ہو کر رہنا پڑا۔ آرام آنے کے بعد دوسرے دن وہ شانی لوگوں کی طرف آئی تو آفندی نے بے تابانہ اس کو کندھوں سے تھام لیا۔

"کہاں رہ گئی تھیں تم۔ ایک دن نظر نہیں آئیں تو یوں لگا جیسے۔ میری بینائی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ یہ ایک دن ایک صدی کی طرح گزرا ہے۔"

وہ اس کی دیوانگی کے اظہار پر پسینے پسینے ہو گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اپنے کندھے چھڑا کر وہ شانی مانی کی طرف متوجہ ہو گئی، جن کے چہرے اس کی جدائی میں مرجھا کر رہ گئے تھے۔ اس نے خود بھی ان لوگوں کی کمپنی کو بہت مس کیا تھا۔ اپنے زخم کے متعلق بتایا تو جہاں بچوں کے چہروں پر پریشانی کے بادل منڈلائے وہاں آفندی کے انداز میں بھی اپنائیت آمیز بے چینی اور اضطراب در آیا۔

"کیسے لگی چوٹ۔ ڈاکٹر کو دکھایا، دوائی، پٹی بدلوائی؟" غرضیکہ ہر طرح سے اپنی فکرمندی کا اظہار کرتا رہا۔

شام کو اسد وغیرہ بھی لوٹ آئے۔ زخم کے متعلق سبھی نے حسبِ توفیق اسے پوچھا۔ اسد نے زخم دیکھا اور پھر خاموشی سے پٹی بدل کر ایک سائیڈ پر ہو گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں اسی سنجیدگی اور ٹھہراؤ کا راج تھا جو اس کی بردبار اور پُروقار شخصیت کا خاصا رہا تھا۔

نیرش کے اندر دور کہیں بغاوت سر اُٹھانے لگی۔

کیا اس طرح میں ساری عمر ان سرد برفیلے رویوں سے جذبات کی گرمی کا کھوج لگانے کی سعی ناکام کرتی رہوں گی؟

اتنے برس بیت گئے ہیں اس مضبوط جائز شرعی بندھن کو، مگر اس نے آج تک اس کا ایک معمولی سا اظہار بھی ـــــ نہیں کیا۔ دل کی جگہ برف کا تودہ فٹ ہے سینے میں۔

میں کب تک یونہی اس برف زار سے زندگی کی حرارت تلاش کرنے کی مہم جاری رکھوں گی؟

اس نے سوچا۔ بہت سوچا اور پھر فیصلہ کر لیا۔ اور رات کو علیحدگی میں امین کو بتا دیا کہ شروع سے ہی اس سے شیئر کرتی رہی تھی یہ معاملہ! امین اس کی بات سن کر کتنی ہی دیر ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم نے جواب نہیں دیا امین؟ میں نے تم سے ساری صورتحال سامنے رکھ کر کوئی مناسب سا مشورہ مانگا تھا!" جب امین کی طرف سے سکوت کا دورانیہ ناقابلِ برداشت حد تک طویل ہوتا گیا تو بالآخر اس نے خود ہی سناٹے کا پردہ چاک کر دیا۔

"نیرش! میں سوچ رہی ہوں لاپروا اور جلد باز تو تم ہمیشہ سے رہی ہو۔ اور اس متلون مزاجی کے باعث خاصی حماقتیں بھی کرتی رہی ہو۔ مگر خطرناک حد تک بے وقوفی اور عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ تو آج تک اس سے پہلے تم نے کبھی نہیں کیا تھا۔ تم غالباً اپنے موقف پر غور کرنا بھول گئی ہو۔ تمہیں خبر ہی نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے اگر خدانخواستہ اس پر عمل درآمد کر بیٹھو تو کس قدر طوفان برپا ہو جائے گا پورے خاندان میں۔"

...سا پہنچا ہوگا۔ پوری فیملی کے لیے۔ تم سوچ بھی
نہیں سکتیں کس طرح خاندان کے فخر و ناز اور وقار
کی بلند و بالا عمارت ایک جھٹکے سے زمین بوس ہو
جانے کی تھی۔"

"اتنی دل دہلانے والی باتیں تو نہ کرو نا اب۔
میں اپنی مرضی سے اپنی خوشی سے زندگی گزارنے کا
حق نہیں ہے؟ تم سب گواہ ہو اتنا عرصہ گزر جانے کے
باوجود اسعد کے پتھریلے خشک رویے میں کوئی تبدیلی
نہیں آئی اور نہ مستقبل میں اس کی امید کی جاسکتی ہے۔
اتنا قریب ترین رشتہ ہونے کے باوجود وہ مجھ سے
بیگانوں سے بڑھ کر سلوک کرتے ہیں۔ میں کب تک
صبر کی سل سینے پر رکھ کر ان کے پلٹ آنے اور مکمل
ہو جانے کا کرب ناک انتظار کرتی رہوں گی؟ میں ساری عمر
سولی پر لٹک کر نہیں گزار سکتی۔ اور یوں بھی امین دیکھو
ان بچوں کا کیا قصور ہے کہ ساری عمر ممتا سے محرومی
کے عالم میں گزار دیں۔ میرے وجود میں انہیں ممتا
مل جائے گی، ان کی زندگی سنور جائے گی۔ اسعد کو تو
اور بہت سی اچھی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔"

"نیرش! خدا کے واسطے اپنی احمقانہ دلیلیں
اپنے پاس رکھو، اور اس بات کو بھی دل میں رکھو۔
کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو قیامت آجائے گی۔ تمہاری
اسعد بھائی سے کوئی منگنی نہیں ہوئی جو ایک ٹوٹ
گئی تو دوسری ہو جائے گی۔ تمہارے ساتھ ان کا نکاح
کا بندھن ہے جس کے تحت وہ شرعی طور پر تمہیں چھونے
کے پوری طرح مجاز ہیں۔ تم پر استحقاق رکھتے ہیں ہر
طرح کا۔ شادی تو اب ایک لحاظ سے فارملٹی کا نام
ہے۔ کیونکہ تم قانونی اور شرعی نقطہ نظر سے ان کی ہو چکی
ہو۔ نکاح ٹوٹ جانے کا مطلب ہوتا ہے طلاق اور
طلاق کا مطلب ہوتا ہے عورت کی زندگی کی سب سے
بڑی بدبختی اور عظیم ترین ذلت آمیز سانحہ۔ جس کے
بعد وہ مر جانا پسند کرتی ہے۔ تم کیوں زندگی کو گڈے
گڑیا کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں۔ اب تم
بچی نہیں ہو۔ من مانی کرنا۔ خاطر میں نہ لانا۔ اور واویلا
مچا کر سب کو متوجہ رکھنا اور بات ہے، ایسے ناز نخرے
لوگ ہنس کے اٹھانے کو تیار رہتے ہیں۔ مگر اپنی اس
...بازی کو جواز بنا کر ان سے رسوا کن اور ناقابل
برداشت حد تک اذیت ناک فیصلہ منوانا نری حماقت کی
بات ہے۔ مجھے تم سے ایسی خود غرضی اور خود پسندی
کی توقع نہیں تھی۔"

"ٹھیک ہے پھر میں اسعد سے بات کروں گی۔
انہیں مجبور کروں گی کہ وہ خود سے ایسا اسٹیپ لے
لیں۔ یقیناً وہ خوشدلی سے مان جائیں گے کیونکہ وہ
بھی تو مجھ سے پیچھا چھڑانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے
ہوں گے۔"

نیرش پر امین کی ناراضگی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا
تھا۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

سو جاتے ہوئے آفندی کو اپنے گھر کا پتا دے دیا۔
جواب مصلحتاً ابھی تک نہیں دیا تھا۔ پہلے اسے
پاؤں رکھنے کے لیے جگہ ہموار کرنا تھا۔ سو فیصلہ کر لینے
کے باوجود اس کے جذبوں کو پذیرائی نہیں بخشی تھی۔
البتہ سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا۔ شاق اور مانی نے
بہت سارے وعدوں سمیت اسے رخصت کیا تھا۔

وادی کلر کہار سے واپسی پر سبھی اداس اور خاموش
سے تھے، وہاں قیام کے ان دو ہفتوں نے انہیں ان
حسین مناظر سے بھی دلربا وادی کا بہت عادی بنا دیا
تھا۔ شروع شروع میں ملاقات پر اکثر وادی میں قیام
کے حوالے سے باتیں ہوا کرتی تھیں۔ خوشگوار یادوں کے
صندوقچے کھلتے ہی چلے جاتے تھے۔

پھر رفتہ رفتہ سبھی اپنے اپنے کاروبار زندگی میں
مگن ہو گئے۔ فقط ایک دل تھا جو ہنوز وادی کے
دلفریب مناظر کا اسیر بنا ہوا تھا۔ چھٹیاں ختم ہونے
پر وہ لاہور واپس چلی گئی تھی۔ امتحانات کے تھکا دینے
والے مراحل سے گزر کر وہ طویل عرصے کے بعد واپس
اسلام آباد آئی تو ان دنوں سحرش کے لیے رشتہ کرنے
کے سنجیدہ اقدامات شروع ہو گئے تھے۔

اسی دن شام کو کچھ لوگوں نے سحرش کے سلسلے میں
آنا تھا۔ اتفاقاً ڈیڈی کا فون بھی آگیا دوپہر کو کہ ان کے
کچھ جاننے والے رات ڈنر پر آرہے ہیں۔ گھر میں پہلے
ہی مہمانوں کا خاصا جھنجھٹ تھا۔ امی نے زیب خالہ
اور سارہ پھپھو وغیرہ کو بھی بلوا بھیجا تھا۔ آنے والوں
سے بات چیت کے لیے سو انہوں نے ڈیڈی کو کہہ
دیا۔

"آپ ایسا کیجیے گا ڈنر کے لیے اپنے مہمانوں کو بلیو سکائی" لے جائیے گا۔ کام کا آج بہت رش ہے۔"

"چلو اچھی بات ہے۔" ڈیڈی نے ان کی تجویز پر صاد کیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا جب نارمل قسم کے مہمان بہت زیادہ آجاتے تھے تو ڈیڈی انہیں کسی منتخب چار چرا والے ——— ہوٹل میں لے جاتے تھے۔ بہرحال کے فائنل پیپرز ہو رہے تھے۔ وہ رٹا لگانے میں مگن تھی۔ نیرش جانے کس موڈ میں تھی کہ چائے وغیرہ کے اہتمام کے لیے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ امی نے جمال کو بھیج کر آمین کو بھی بلوا بھیجا تھا۔ نغمی تو دوپہر سے ہی آئی بیٹھی تھی۔

نیرش کی لاپروا طبیعت رنگ لائی۔ پلیٹیں ٹرالی میں رکھتے ہوئے بے دھیانی کے عالم میں ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئیں۔

"صدیوں بعد بچن کی شکل دیکھنے کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔" آمین نے اسے چڑایا تھا۔

نغمی بھی ممی کی انگلی تھامے کہیں سے آن موجود ہوئی تھی۔

"اس پر شاعر یہ کہتا ہے

؎ کومل ہاتھوں کو عادت ہے نازک چیزیں توڑنے کی
اب دل کے کانچ کھلونے سے تم ایسی شرارت مت کرنا"

"ایک تو میں تمہاری اس شاعرانہ رگ سے بڑی عاجز ہوں۔ موقع بے موقع پھڑک اٹھتی ہے۔"

"خیر اس بار تو بڑے موقع سے پھڑک اٹھی ہے۔ سوچ لو تم ــ اب دل کے کانچ کھلونے سے تم ایسی شرارت مت کرنا۔"

امین نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بڑی ذومعنی بات کہی تھی۔ وہ سمجھ کر بھی کندھے اچکا کر انجان بن گئی تھی۔

"اے نیرا! فارغ ہو تو کل میرے ساتھ چلنا ذرا کمپلیکس ہاسپٹل، پنکی کو اس کی چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھانا ہے۔ دانت نکال رہی ہے یہ اس وجہ سے مزاج بہت چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے۔ قابو میں ہی نہیں رہتی۔"

"ٹھیک ہے کل پک کر لوں گی تمہیں۔ ٹائم لے کر شام کو فون پر بتا دینا مجھے۔" دوسرے دن وہ زیب خالہ کے ہاں چلی آئی تھی۔ نغمی ادھر ہی آئی ہوئی تھی پہلے ہی۔ کافی دیر تک ہارن بجانے پر جب کوئی نہیں نکلا تو گاڑی لاک کر کے وہ اندر کی سمت بڑھ گئی۔ سارے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔

"خالہ، خالہ جان، نغمی ارے بھئی کوئی ہے؟" اسی لمحے تولیے سے سر رگڑتے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس اسد نکل کر سامنے آ گئے۔

"السلام علیکم۔ وہ خالہ اور نغمی لوگ نظر نہیں آ رہے؟" اس نے آواز کا والیوم دھیما کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"امی پڑوسن خالہ کے ہاں گئی ہیں ان کی عیادت کرنے۔ اور نغمی باتھ لے رہی ہے۔ آؤ بیٹھو تم۔"

وہ لاؤنج میں کارٹیں نیشی پنکی کی طرف آ گئی۔ شکر تھا بچی تو تیار تھی اب خود پتا نہیں میم صاحبہ کتنی دیر لگائیں گی۔ وہ کوفت سے سوچ رہی تھی۔

"پیپرز کیسے ہوئے تمہارے؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اسد نے دریافت کیا تھا۔ انداز میں وہی ازلی سنجیدگی اور بردباری تھا۔ کوئی احساس جو چھو کر گزرا ہو کہ اس سے محض چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی یہ دلربا لڑکی پوری اس کی ہے

دفعتاً ایک خیال بجلی کی سی سرعت سے نیرش کے دماغ میں کوندا۔ اس بات کے لیے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا۔ اسد کہ آپ ارباب خالو اور ڈیڈی وغیرہ کو بتا دیں کہ آپ اس رشتے سے خوش نہیں ہیں اور اس زبردستی کے بندھن سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔"

اس نے عجلت کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے گولہ داغ ڈالا تھا۔

اتنی غیر متوقع بات سن کر وہ بے طرح چونک کر سر ایک جھٹکے سے اٹھا کر اس کی سمت متوجہ ہوئے تھے۔ جہاں چہرے پر سنجیدگی تحریر تھی۔

"کیا تمہاری طرف سے بھی یہی خیالات ہیں؟" کتنی ہی دیر چپ رہنے کے بعد انہوں نے سپاٹ انداز میں دریافت کیا تھا۔

"جی بالکل یہی سمجھ لیجیے۔" اس کے اعلیٰ دماغ

بھی بات تھی کہ وہ مروتاً اب تک ناپسندیدگی کے باوجود محض اس کی خاموشی کو اس کی رضامندی جان کر مصلحتاً چپ ہو رہے تھے، چنانچہ ایک سیکنڈ کا توقف کیے بنا اس نے بسرعت سر ہلا کر تائید کی تھی۔ خیال تھا کہ اس طرح اسد کو حتمی فیصلہ کرنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ اسد بالکل خاموش بیٹھے اس کا چہرہ جانچ رہے تھے گویا حقیقت کی پیمائش کر رہے ہوں۔

اسی لمحے نغمی آگئی۔ سو بات آگے نہ بڑھ سکی، اسے بہرحال کچھ سکون مل گیا تھا کہ گیند اسد کی کورٹ میں ڈالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب یقیناً فیصلہ اس کے حق میں ہو سکتا تھا۔ چیک اپ کروانے کے بعد وہ لوگ نکل رہی تھیں تب دفعتاً نغمی کی نظر سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ سے نکلتی گلابی کپڑوں میں ملبوس لڑکی پر پڑی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی نغمی نے نیرش کو ٹہوکا دیا۔

"اے نیرا۔ وہ لڑکی دیکھو شازمین ـــــ لگ رہی ہے ناں۔"

"ارے ہائیں یہ تو وہی ہے۔" نیرش نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد اسے پہچان لیا۔ ابھی وہ متذبذب سی کھڑی تھیں کہ اسی لمحے شازمین نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔

"یہ تم ہی ہو ناں نغمی اور نیرش۔" کچھ ساعت جھجک کر دور کھڑے رہنے کے بعد بالآخر وہ ان کی طرف بڑھ آئی اور بڑی گرمجوشی سے گلے ملنے لگی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے انداز میں ازلی نخوت اور تکبر کے بجائے خلوص اور اپنائیت کی مہک تھی، رسمی حال چال پوچھنے کے بعد شازمین خود ہی کہنے لگی۔

"آؤ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"مجھے تو یہ چھوٹی بہت ستا رہی ہے۔ میں گھر چلوں گی، پلیز مائنڈ نہیں کرنا۔" نغمی نے سلیقے سے معذرت کی۔ پھر نیرش سے گاڑی کی چابی لے لی۔ شازمین کے پاس اپنی گاڑی موجود تھی۔

"مگر تم ڈرائیو کیسے کروگی بنکی کے ساتھ، چلو میں پہلے تمہیں گھر چھوڑ دیتی ہوں۔" نیرش کو پریشانی تھی۔

"ارے نہیں بھئی بڑے آرام سے ڈرائیو کر لوں گی بنکی سو چکی ہے۔ اسے ساتھ والی سیٹ پر لٹا دوں گی۔ ارے شازمین پھر بات ہوگی تم سے۔"

وہ اور شازمین گاڑی میں بیٹھ کر جناح سپر کی طرف نکل گئیں۔ انہیں خبر ہی نہ ہوئی تھی کہ دو آنکھیں ہاسپٹل سے ان کے تعاقب میں تھیں اور اب بھی برابر یہ تعاقب جاری تھا۔

ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں سکون سے بیٹھ کر انہوں نے باتوں کا آغاز کیا۔ نیرش واضح طور پر شازمین میں تبدیلی کے آثار محسوس کر رہی تھی۔ اب اس کی باتوں میں تصنع اور تکبر کے بجائے زندگی کی تھکا دینے والی سچائیوں کی باس تھی۔

"زندگی نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے نیرش۔ اپنی ماں کو آئیڈیلائز کر کے میں نے اپنی تباہی کا سامان خود پیدا کیا۔ میرے نفس کی کمزوری نے مجھے یہ دن دکھائے۔" میز کی سطح کو ناخن سے کھرچتی وہ بڑی دلگرفتگی اور ملال کے عالم میں بتا رہی تھی۔ نیرش کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر اپنی ٹیبل کی سمت بڑھتے ہوئے آفندی پر پڑی۔ ایک لمحے کو دل کی ساری مرجھائی کلیاں کھل گئیں، مگر عجیب بات یہ تھی کہ آفندی کی نظریں شازمین کے وجود پر گویا منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔

"تو بالآخر میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا شازمین بیگم۔" پھنکارتے ہوئے سرد لہجے پر ہڑبڑا کر شازمین نے سر اٹھایا اور پھر اس کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

"آ۔ آپ۔ رضا۔" اس کی لرزیدہ آواز میں دہشت سی تھی۔

"ہاں۔ میں۔ تم کیا سمجھتی تھیں میں تم تک نہیں پہنچ سکوں گا؟ تمہاری ماں اگر تمہیں پاتال میں بھی چھپا دیتی تو بھی میں ایک نہ ایک دن نکال لاتا۔ کہ دھاگہ الجھا ہی ہے ٹوٹا تو نہیں ہے ناں۔ تم پر آج بھی میرے سارے جائز اختیارات ہیں۔"

"رضا۔ رضا پلیز مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے بخش دیجیے کہ میری روح میرے ضمیر کے ہاتھوں روز پھانسی پر چڑھتی ہے۔ اس سے تو بہتر ہے میں آپ کے بخشے ہوئے زندان میں ستم سہہ سہہ کر دم توڑ دیتی۔"

"آ۔ آپ بیٹھ جائیے۔ آفندی اور شازمین پلیز تم بھی اپنا آپ سنبھالو۔ ورنہ تماشا بن جائے گا۔ یہ پبلک پلیس ہے مجھے آرام سے بتاؤ یہ سب کیا ہے، کون

بس آپ دونوں ایک دوسرے کے۔"

نیرش کی نگاہوں میں تو زمین و آسمان گھوم کر رہ گئے تھے۔ ایسے تابڑ توڑ دھماکے ہوئے اعصاب پر کہ خیال کا ہر زاویہ اپنی جگہ منجمد سا ہو کر رہ گیا تھا۔ دونوں کی مبہم سی گفتگو اسے بہت کچھ سمجھا گئی تھی۔ اور اس ہولناک انکشاف نے اسے پتھر کا بنا کر رکھ دیا تھا۔

آفندی شازمین کا شوہر تھا۔ اور شازمین اس کے دونوں بچوں کی ماں تھی۔ شازمین کا کہنا تھا کہ اس کے میاں نے طلاق دے دی تھی اور آفندی کی داستان کے مطابق اس کی بیوی نے بے وفائی کی تھی، وہ اپنی جگہ جکڑ کر رہ گئی تھی۔ شازمین کا ظالم، سفاک، بے رحم شوہر آفندی تھا۔ آفندی کی سابقہ شخصیت کا سارا حسن بکھر کر رہ گیا تھا۔ ایک دم ہی نیرش کے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

"نیرش! اگر تم شازمین کی فرینڈ ہو تو ضرور اس نے تمہیں اپنے اوپر بیتی اذیت ناک گھڑیوں کی کہانی سنائی ہوگی، یقیناً تمہاری تمام ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں گی بلکہ تم ہی کیا جو بھی سنے گا وہ فطری طور پر مجھ جیسے بندے کو سفاک اور درندہ صفت انسان سمجھے گا۔ مگر مجھے اپنی دوست سے دریافت کر کے صرف اس سوال کا جواب اس سے دلوا دو کہ اگر میں اتنا ہی سفاک، ظالم اور اذیت پسند شخص تھا تو اس نے مجھ سے طلاق کیوں نہیں لے لی؟ اتنی الٹرا ماڈرن اور اثر و رسوخ والی ہونے کے باوجود چپ چاپ میری جلائی گئی اذیت کی بھٹی میں کیوں سلگتی رہی کیوں خاموشی سے میری بے دام غلام بنی رہی؟"

"ہاں یہ بات سوچنے کی ہے۔" نیرش یکلخت چونکی تھی۔ اس کی متفسرانہ نظروں کے جواب میں شازمین کی نگاہیں ڈبڈبا گئی تھیں، وہ بے چینی سے ہاتھ مسلنے لگی تھی۔

"اس سے پوچھو ناں جہاں اپنی المناک داستان سنائی تھی وہاں اپنے "کارناموں" پر روشنی کیوں نہیں ڈالی۔ اپنی ذات کی کمی سامنے کیوں نہیں لائیں۔ آخر کوئی تو بات تھی ناں جو اتنی محبت کرنے والا، جان نچھاور کرنے والا مرد یکلخت پتھر بن گیا۔" آفندی کی آواز چنگاریاں اڑا رہی تھی۔

"شادی سے محض ایک دن پہلے مجھے خبر ملی میں کس ہوشیاری سے بے وقوف بنایا گیا ہوں۔ مگر وہ وقت ایسا تھا کہ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے سابقہ محبوب نے مجھے کہا تھا۔ تم تو میرا نگ رد دستخط کر کے اسے حاصل کرو گے اور میں انکشافات میں پڑے بغیر ہی اس کو حاصل کر چکا ہوں۔ بڑی یادیں وابستہ ہیں ان حسین لمحات کی۔ بڑا اچھا وقت گزارا تھا ہم نے ایک دوسرے کی انتہائی قربت میں۔"

آفندی کا چہرہ تو غیرت کے مارے سرخ تانبے کی طرح تپا ہی تھا، خود نیرش کا رنگ حیا کے مارے لال پڑ گیا۔ اس سے چہرہ اوپر نہ اٹھایا جا رہا تھا۔ انکشافات نے اس کو گنگ سا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بے اوسان سی ہوتی جا رہی تھی۔

"یا الٰہی یہ تیری دنیا بھی کارگاہ عجائب ہے۔ کیسی ہونی انہونی ہوتی رہتی ہے یہاں۔"

شازمین کے زرد بھیگے چہرے پر ندامت کے آنسو لرز رہے تھے۔

"میں آپ کی گنہگار ہوں رضا۔ مجھے جو جی چاہے سزا دے لیجیے مگر خدارا مجھے میرے بچوں سے ملوا دیجیے۔ میں آپ کا ہر ستم سہہ لوں گی مگر اب اپنے بچوں سے دوری برداشت نہیں کر سکتی۔ میں مزید ممی کے کہنے میں آ کر دل پر پتھر نہیں رکھ سکتی۔ اب مزید ان کے اشاروں پر ناچنا میرے بس میں نہیں رہا ہے۔"

یکلخت ہی نیرش کا دل اچاٹ ہو گیا۔ شازمین سے رضا آفندی سے، اس کے ہمراہ گزارے وادی کلر کہار کے حسین لمحات سے، اپنے آپ سے۔ اپنی سوچوں سے ہر شے سے اکتا گیا۔ وہ کرسی دھکیل کر اضطراب اور بے کلی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"نیرش تم کہاں چل دیں۔ بیٹھو ناں ابھی تو مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔"

آفندی نے نرمی سے اس سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"پھر بات ہوگی۔ اس وقت ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے مجھے۔ اچھا شازمین تم لوگ ذرا آپس میں جھگڑا نپٹاؤ۔ میں شام میں تمہیں فون کر لوں گی۔"

وہ ریسٹورنٹ سے نکل آئی تھی اور اب ایمن

بیٹھی تھی۔
بغیر سوچے سمجھے جلد بازی میں قدم اٹھانے والے بے وقوف لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ تمہارا رد کیا تھا میں نے۔ اور مجھے کسی بات کا غم نہیں۔ دکھ ہے تو یہ ہے کہ تم نے حماقت کا اعلیٰ ترین ثبوت پیش کرتے ہوئے اسد بھائی سے اپنی ناپسندیدگی کا اعتراف کرتے ہوئے رشتہ توڑنے پر اصرار کیا۔"

"اب کیا ہوگا امین؟" وہ حقیقی معنوں میں پشیمان تھی۔

اور امین کتنی ہی دیر اس کے ساتھ سر کھپاتی بتاتی سمجھاتی رہی۔ سارے واقعات کا تجزیہ کر کے اس کے افعال پر تنقیدی نگاہ ڈالتی گئی۔ پھر آخر میں یہ کہہ کر چلی گئی کہ "ان سب واقعات کی جزئیات کو سامنے رکھ کر اب خود ایمانداری سے کسی نتیجے تک رسائی حاصل کرو۔"

وہ کتنی ہی دیر سوچوں کے جال سے الجھتی رہی۔

"بیرش کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی امین۔ یقیناً تم ہی اس کے اندر آنے والی اس اچانک تبدیلی کی وضاحت کر سکتی ہو۔"

اسد امین کے روبرو بیٹھے سنجیدگی سے استفسار کر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کس طرح جواب دے کہ بیرش کا بھرم بھی رہ جائے اور بات بھی بن جائے۔

"اسد بھائی بات کچھ بھی نہیں ہے ماسوائے غلط فہمی کے۔ آپ کے سنجیدہ سے خاموش رویے سے وہ یہ سمجھ بیٹھی کہ یہ رشتہ آپ کی مرضی کے خلاف ہو رہا ہے اور آپ اس سے خوش نہیں ہیں اسی لیے اس تعلق سے وابستہ کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں کرتے اور مصلحتاً خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ آپ کو اس الجھن سے بچانے کے لیے اس نے آپ کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کا اقرار کیا تھا۔"

اسد اس کی بات سن کر کچھ دیر سوچتے رہے، پھر ایک دلکش مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آ کر بکھر گئی۔

"انہیں غالباً سب باتوں کی طرح یہ بھی نہیں

لگتی ہے۔ وقت پر رد عمل کے مطابق مناسب

پھر اس کے فائنل رزلٹ کا انتظار کیے بغیر رخصتی کی تاریخ طے کر دی گئی۔ اور اس واقعے کے ٹھیک ایک ماہ بعد وہ اسد کے بیڈ روم میں دلہن بنی انتظار کی کیفیت سے گزرتی اپنے گزرے کل کا احتساب کر رہی تھی۔ امین نے اس عرصے میں اچھی طرح اس کی برین واشنگ کر ڈالی تھی۔

"سیدھی سی بات ہے رضا آفندی کبھی تمہارا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اس کی ذات میں دلچسپی کی وجہ اس کی پراسرار حرکات و سکنات اور چہرے کے عجیب و غریب سرد لہر تاثرات تھے، تمہاری دلچسپی اور جنون کا اصل مرکز یہی تھے جن کی کشش نے تمہیں آفندی کو بھولنے اور نکاح ختم کرنے جیسے انتہائی اقدام کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آفندی میں دلچسپی کی وجہ اسد بھائی کا گریز ہرگز نہیں تھا کیونکہ ان کا رویہ کون سا نیا تھا۔ وہ تو شروع سے ایسے ہی رہے تھے۔ اور تم اچھی طرح ان کے مزاج سے واقف تھیں۔

تمہیں پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ انجانے میں اسد سے زیادتی کر گئی ہو کیونکہ اسد بھائی کے مقام کی اہمیت تو شروع سے تمہارے دل میں مسلم رہی ہے۔ وہ مقام آفندی بھی نہیں لے سکا۔ اگر ایسا ہوتا تو تم اسے اتنی آسانی سے شازمین کے حوالے نہ کر آتیں۔ اور اس دن کے انکشاف کے بعد دوبارہ شازمین اور آفندی کے لیے شانی ہمانی کی موجودگی میں تجدید تعلق کے لیے راہیں استوار نہ کرتیں۔ آفندی کو درگزر سے کام لے کر شازمین کی خطائیں معاف کر کے سچے دل سے اپنانے اور نئے سرے سے زندگی شروع کرنے پر رضامند نہ کرتیں۔

"ارے بے وقوف! اسی لیے تو شروع سے میں کہتی رہی ہوں کہ تم اپنی انہی جلد بازی اور بے پروائی کے باعث خود اپنے لیے مصیبتیں مول لینے کی عادی ہو۔ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح اس کے نتائج پر غور کر لیا کرو۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر ہمدردی کی بیلیں نہ اٹھائے پھرا کرو۔"

اور وہ سو فیصد ایمن کے تجزیے سے متفق ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی شازمین اور رضا آفندی کی۔ پاکستان سے اپنے دونوں بچوں بہت راضی خوشی۔ روانگی کے بعد ایک بوجھ سا اس کے سر سے اتر گیا تھا۔ غم تھا تو اسد سے اپنی حماقت آمیز فرمائش کا۔ اور اب آنے والے لمحات کا سوچ سوچ کر دل ہول رہا تھا۔

اس نے خشک ہوتے گلے کے ساتھ سائیڈ ٹیبل سے جگ میں پانی انڈیل کر پیا۔ خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اسد کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس کے ہاتھ سے بے ساختہ گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔

؎ کومل ہاتھوں کو عادت ہے نازک چیزیں توڑنے کی
اب دل کے کانچ کھلونے سے تم ایسی شرارت مت کرنا

دروازے کا لاک لگا کر وہ بڑی بشاشت سے شعر پڑھتے ہوئے اس کے مقابل آن بیٹھے تھے۔ وہ حواس باختہ سی سر جھکائے دونوں ہاتھ اضطراب کے عالم میں مسلنے لگی۔ پانی پینے کے دوران اس نے گھونگھٹ پیچھے گرا دیا تھا۔ اور اب اسد کی موجودگی میں اتنی تاب نہیں تھی کہ ہاتھ اٹھا کر نئے سرے سے گھونگھٹ نکالتی۔ سوچوں کی لوتن سن سی ہو کر بیٹھی رہ گئی۔ اسد نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لیے اور اس کی ہتھیلیاں کھول کر اپنی ہتھیلیوں سے مس کرتے ہوئے ہنسنے لگے۔

”اتنا غصہ تھا مجھ پر کہ آتے ہی گلاس کی شامت لے آئیں۔“

”نن۔ نہیں۔ غصہ تو نہیں آرہا مجھے آپ پر۔“

”تو پھر کیا پیار آرہا ہے؟“ وہ شرارتی ہوئے۔

وہ ان کے اس قدر بے تکلفانہ انداز پر اتنی متحیر تھی کہ شرمانا بھی بھول گئی۔ ایک ٹک دیکھتی رہ گئی۔

”اس طرح مت دیکھو بھئی، کہیں بندہ گزر ہی نہ جائے جان سے۔“ انہوں نے یکلخت سارے فاصلے مٹا کر ——— اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔

”یار! تم تو اپنی سادگی اور بے وقوفی میں ہی لوٹ لیا کرتی تھیں۔ آج اس قدر ”ہتھیاروں“ سے لیس ہو کر تو بھے ——— چاروں شانے چت کر دیا ہے۔“ اسد کی نگاہوں میں چمکتے پکتے وارفتہ شرارتے ہو رہے تھے۔ ان کی نگاہ اور دست و لب کی شدتوں نے اس کے پاگل کر دینے والے حسن پر دیوانہ وار نثار ہو رہے تھے جیسے حواس بھی چھین لیے تھے۔

”اب اچھی طرح کان کھول کر سن لو کر۔“ ان کے کرخت تنبیہی لہجے پر اس نے سہماں ساں ہو کر ان کی سمت دیکھا۔ ان کے ہونٹ شرارتی ہو کر پھیل گئے۔ پھر اس کی سمت جھک کر متبسم لہجے میں دھیرے سے گویا ہوئے۔

”کہ تم شروع سے مجھے اپنی تمام تر حماقتوں اور لاپروائیوں سمیت پسند رہی ہو۔ عرصہ ہوا دل کے تخت پر قابض ہو چکی ہو۔ بتایا اس لیے نہیں کہ میں نے سارے اظہار آج کے موقع کے لیے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ میرے انداز بے گانہ نہیں ہوتے تھے بے وقوف لڑکی۔ بلکہ تم چہرہ اور آنکھیں پڑھنے کے فن سے ناآشنا رہی ہو۔ اگر کبھی غور سے ان آنکھوں میں جھانکا ہوتا یا چہرے پر لکھی تحریر پڑھی ہوتی تو اپنا شبیہہ جھلکتی دیکھ لیتیں۔ وہ کیا کہتا ہے شاعر کہ

؎ ضروری تو نہیں ہے لب کہے یہ دل داستاں اپنی
زباں اک اور بھی ہوتی ہے اظہار محبت کی!

کیا تمہیں میری نادان محبوبہ اور کم فہم شریک حیات کبھی بھی کر نہیں سمجھیں۔ لگتا ہے ”عملی“ مظاہرہ کر کے سمجھانا پڑے گا۔“

وہ جوان کی بے گانگی کے مظاہروں پر شاکی رہا کرتی تھی۔ اب ان کے دیوانہ پن کے شوخ بے باک اظہار پر شدتوں سے بوکھلا، گھبرا گئی تھی۔ بری پھنسی تھی۔ آخر اپنی کم عقلیوں اور حماقتوں کی سزا بھی تو بھگتنا تھی۔ ساری عمر اب ایسی شرارت دوبارہ کرنے سے بچنے کے لیے سزا ضروری بھی تو تھی ناں۔

یہ سزا تو تھی مگر۔ خوبصورت سزا۔

*